حکومتِ الٰہیہ

اور

علماء و مفکرین

مرتبہ

مولانا ابو محمد امام الدین

(رام نگری)

مکتبہ نشاۃ ثانیہ چنچلگوڑہ حیدرآباد دکن

اشاعت اول　　مارچ سنہ ۴۶ء　　تعداد (ایک ہزار)

شائع کردہ

مکتبہ نشاۃ ثانیہ چنچل گوڑہ حیدرآباد دکن

قیمت　　(للعہ) چار روپے و آٹھ آنہ

(مطبوعہ)

مطبع مکتبہ ابراہیمیہ کٹلمنڈی حیدرآباد دکن

فہرست مضامین

سلسلہ نشان	مضمون و مصنف		صفحہ
۱	پیش لفظ	از مولف	۵
۲	حکومت الٰہی (نظم)	علامہ اقبال	۱۹
۳	آسمانی بادشاہت	چودھری غلام احمد پرویز	۲۱
۴	تحریک حکومت الٰہیہ	مولانا محمد منظور نعمانی	۳۳
۵	اسلام کا نظریہ سیاسی	" ابوالاعلیٰ مودودی	۶۹
۶	اسلامی نصب العین کیا ہے	" "	۹۵
۷	افادات	حضرت مولانا حمید الدین فراہی	۱۰۱
۸	انبیائے کرام کا مقصد بعثت	" " "	۱۰۷
۹	حکومت الٰہیہ کا قیام مسلمانوں پر واجب ہے	" "	۱۱۹
۱۰	افادات	حضرت مولانا ابوالکلام آزاد	۱۳۳
۱۱	حکومت الٰہیہ کی ایک ولولہ انگیز دعوت	" "	۱۴۲
۱۲	حضرت مولانا آزاد کا ایک تاریخی بیان		۱۸۴
۱۳	حضرت مولانا عبید اللہ سندھی اور حکومت الٰہیہ		۱۹۱
۱۴	افادات	حضرت مولانا سید سلیمان ندوی	۱۹۹
۱۵	مولانا سید سلیمان ندوی کا ایک ایمان افروز پیغام		۲۰۵

صفحہ	مضمون و مصنف	نمبر شمار
۲۲۳	مقصد رسالت حکومت کا قیام — مولانا ابوالحسن علی ندوی	۱۶
۲۳۳	مولانا اکبر شاہ خان مرحوم اور حکومت الٰہیہ	۱۷
۲۴۷	مولانا محمد طیب مہتمم دار العلوم دیوبند کے افادات	۱۸
۲۷۳	آسمانی حکومت کی تصویر — علامہ غازی محمد بن عبد اللہ انصاری	۱۹
۲۸۹	مولانا سید محمد میاں صاحب اور حکومت الٰہیہ	۲۰
۳۰۱	" عبدالماجد دریا بادی اور حکومت الٰہیہ	۲۱
۳۰۵	خدا کی زمین پر خدا کی بادشاہت — مولانا صبغۃ اللہ بختیاری	۲۲
۳۱۳	قرآنی نصب العین — میاں شیخ بشیر احمد بی۔ اے	۲۳
۳۲۵	پیغمبر اسلام کا پیغام انقلاب — مدینہ بجنور ایڈیٹوریل	۲۴
۳۳۷	زمام قیادت کے مستحق کون لوگ ہیں؟ — مولانا محمد عثمان فارقلیط	۲۵
۳۴۵	تحریک حکومت الٰہیہ کے اصول و مناہج — " امین احسن اصلاحی	۲۶
۳۶۱	تحریک حکومت الٰہیہ کے موانع و مشکلات — " صدر الدین اصلاحی	۲۷
۳۹۹	مسلمان جماعتوں کے قول و عمل کا تضاد — " شاہ محمد جعفر پھلواری	۲۸

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

پیش لفظ

إِنِ الْحُكْمُ إِلَّا لِلَّهِ ۚ أَمَرَ أَلَّا تَعْبُدُوا إِلَّا
إِيَّاهُ ۚ ذَٰلِكَ الدِّينُ الْقَيِّمُ ۔ وَعَدَ اللَّهُ
الَّذِينَ آمَنُوا مِنكُمْ وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ
لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْأَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ
الَّذِينَ مِن قَبْلِهِمْ وَلَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِينَهُمُ
الَّذِي ارْتَضَىٰ لَهُمْ ۔

زمین اللہ کی ہے مسلمان زمین پر اللہ کے نائب اور خلیفہ
ہیں، چاہئے تھا کہ زمین کا انتظام مسلمانوں کے ہاتھوں میں ہوتا
لیکن اس کے نظم ونسق پر وہ قابض ومتصرف ہیں جو اللہ کے باغی
اور نافرمان ہیں مسلمان جہاں بھی ہیں محکوم ومجبور ہیں ۔ اگر وہ کسی
خطے میں آزاد ومختار بھی ہیں تو ان کی آزادی وخود مختاری حقیقت
اور باغیان خدا کے مفاد ومصالح کی رہین منت ہے ۔

ایسا کیوں ہے؟ کیا مسلمانوں کے بارے میں اللہ کا قانون بدل گیا ہے؟ نہیں، ایسا نہیں ہو سکتا ولن تجد لسنۃ اللہ تبدیلا ۝

اللہ کا قانون نہیں بدلا مسلمان بدل گئے، اللہ تعالیٰ کا قانون کسی قوم کو اُس وقت تک منصب حکومت و فرمانروائی عطا نہیں کرتا جب تک وہ قوم اپنے اندر اس کی صلاحیت پیدا نہ کرلے۔ اسی طرح اس کا قانون کسی کو اس منصب سے معزول بھی نہیں کرتا جب تک اُس سے حکومت و فرمانروائی کی صلاحیت مفقود نہ ہو جائے، فان اللہ لیس بظلام للعبید ۝

مُسلمان زمین میں تھوڑے سے تھے، کمزور تھے، مظلوم تھے بے سروسامان تھے، لیکن وہ جیسے جیسے ایمانی آزمائشوں میں پورے اترتے گئے اور اُن کے اعمال و اخلاق میں جیسے جیسے پاکیزگی و بلندی پیدا ہوتی گئی اُن کی قلت کثرت سے، ان کی کمزوری قوت سے اُن کی مظلومی نصرتِ الٰہی سے اور بے سروسامانی اللہ کی کارسازی سے بدلتی چلی گئی، یہاں تک کہ وعدۂ الٰہی نے بے پردہ و بے حجاب ظہور کیا، اور جس سرزمین پر مسلمان مظلوم و مقہور تھے اُسی پر اللہ نے ان کی خلافت و فرمانروائی قائم کردی ولینصرن اللہ من ینصرہ ان اللہ لقوی عزیز ۝

اس کے بعد جب مسلمانوں نے ایمان و اعمالِ صالحہ کے اس مقام سے ہبوط اختیار کیا جہاں پہنچ کر وہ خلافتِ الٰہیہ کے منصبِ عظمیٰ پر فائز ہوئے تھے تو ساتھ ہی اُن کے اقتدار و اختیار

میں بھی تنزل شروع ہوگیا اور بالآخر وہ پستی کی اس انتہا کو پہنچ گئے جس میں وہ آج اپنے کو پا رہے ہیں، پانچ پانچ دس دس کروڑ کی مسلم آبادی پر مٹھی مٹھی بھر کفار حکومت کر رہے ہیں۔ جیسے ایک چرواہا پانچ پانچ سو اور ہزار ہزار بھیڑ بکریوں کے گلے کو لاٹھی کے اشاروں پر ہانکتا ہے۔ ایسے بھی خطے ہیں جن میں دور دور تک مسلمان ہی مسلمان آباد ہیں، ان سے ہزاروں میل دور رہنے والی طاقتیں اپنی ساحرانہ انگلیوں سے اشارے کرتی ہیں اور مسلمان مسحور بنے ہوئے ان کے مطابق نقل وحرکت کرتے ہیں۔

اللہ نے مسلمانوں کو بے وجہ اقتدار واختیار کی بلندی سے کھینچ کر ذلت وخواری کے غار میں نہیں جھونک دیا، وہ کسی قوم کے ساتھ ایسا جابرانہ سلوک نہیں کرتا، ہر قوم خود اپنے اخلاق وکردار کی پستی سے سزاوار ذلت بن جاتی ہے اِنَّ اللّٰهَ لَا يُغَيِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰى يُغَيِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِهِمْ ؕ

عرصہ ہوا مسلمانوں نے ان حقائق کو فراموش کر دیا ہے کہ ان کا امتیازی وصف کیا ہے؟ کیا شئے ہے جس کی بدولت ان کو دوسری امتوں پر ترجیح وفوقیت حاصل ہے؟ ان کا منصب حیات کیا ہے؟ اور اس کی وجہ سے ان پر کونسا فریضہ عائد ہوتا ہے؟ مسلمانوں نے یہ سمجھ لیا ہے کہ اللہ کا اقرار کافی ہے، اس کے بعد خواہ ان کے اعمال واخلاق ویسے ہی ہوں جیسے اللہ کے منکروں کے۔ ان کی زندگیاں ویسی ہی ہوں جیسی اللہ کے باغیوں کی۔ وہ اللہ کے قانون کو چھوڑ کر اللہ کے باغیوں کے قوانین اختیار کر لیں

وہ اللہ کی اطاعت کی بجائے اللہ کے باغیوں کی اطاعت و بندگی پر رضامند ہو جائیں۔ ان سب باتوں سے نہ ایمان میں خلل پڑتا ہے اور نہ اسلام میں فرق واقع ہوتا ہے۔ اللہ کے ہاں مسلمانوں کے لئے جو اجر اور صلے، اور مدارج و مناصب مقرر ہیں وہ سب مجرد اللہ کے اقرار سے ملتے چلے جائیں گے لیکن یہ صریح الحاد ہے خدا پرستی سے بالکل بعید۔ وَمَا أُمِرُوا إِلَّا لِيَعْبُدُوا اللَّهَ مُخْلِصِينَ لَهُ الدِّينَ حُنَفَاءَ

اللہ کے اقرار کا مدعا ہے اللہ کی بندگی اور اس کے مقررہ ضابطۂ حیات کی کامل پابندی، اور وہی مقصود ہے

شبے پیش خدا بگریستم زار | مسلماناں چرا زارند و خوارند
ندا آمد نمی دانی کہ ایں قوم | دلے دارند و محبوبے ندارند

صرف خدا کا اقرار کافی نہیں اس کے ساتھ باطل خداؤں کا انکار بھی ضروری ہے۔ اگر یہ بات نہ ہوتی تو توحید اور شرک میں کوئی خاص وجہ آویزش و نزاع نہ تھی۔ اقرار رسالت کے لئے "مُحَمَّدٌ رَسُولُ اللهِ" کافی ہے۔ لیکن اللہ کا اقرار اس وقت تک معتبر نہیں جب تک "لَا إِلٰهَ إِلَّا اللهُ" نہ کہا جائے۔ خدایانِ باطل کا انکار پہلے ہونا چاہئے اور اللہ کا اقرار اس کے بعد۔

قرآنِ مجید بھی اسی حقیقت کا مظہر ہے۔

قَدْ تَبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ فَمَنْ يَكْفُرْ بِالطَّاغُوتِ وَيُؤْمِنْ بِاللهِ ۝

ہدایت گمراہی سے ممیز ہو چکی، اب جو شخص چاہے طاغوت کا انکار کر کے اللہ کو مان لے۔

انبیائے کرام کی بعثت کا مقصد بھی اللہ کی فرمانبرداری کو طاغوت کی بندگی سے بے آمیز کرنا تھا۔

وَلَقَدْ بَعَثْنَا فِي كُلِّ أُمَّةٍ رَّسُولًا أَنِ اعْبُدُوا اللَّهَ وَاجْتَنِبُوا الطَّاغُوتَ (پ ۱۴، س نحل)

ہم نے ہر قوم میں رسول مبعوث کئے جنھوں نے لوگوں کو دعوت دی کہ صرف اللہ کی بندگی کرو اور طاغوت (کی بندگی) سے مجتنب رہو،

اللہ کے بھیجے ہوئے ضابطۂ حیات کے ماننے کا دعویٰ اور طاغوتی نظام حیات پر عمل کھلا ہوا شیطانی اغواء ہے اور یہ مومنانہ نہیں منافقانہ طرز عمل ہے۔

أَلَمْ تَرَ إِلَى الَّذِينَ يَزْعُمُونَ أَنَّهُمْ آمَنُوا بِمَا أُنزِلَ إِلَيْكَ وَمَا أُنزِلَ مِن قَبْلِكَ يُرِيدُونَ أَن يَتَحَاكَمُوا إِلَى الطَّاغُوتِ وَقَدْ أُمِرُوا أَن يَكْفُرُوا بِهِ وَيُرِيدُ الشَّيْطَانُ أَن يُضِلَّهُمْ ضَلَالًا بَعِيدًا

(پ۵ سورہ نساء، ع ۱۰)

(اے پیغمبر) کیا تم نے ان لوگوں کی حالت پر نظر نہیں کی جو دعویٰ تو یہ کرتے ہیں کہ (خدا کی طرف سے) جو کچھ تم پر نازل ہوا ہے اور جو کچھ تم سے پہلے نازل ہو چکا ہے

ان سب پر ایمان رکھتے ہیں، اور چاہتے ہیں کہ اپنے معاملات کا فیصلہ طاغوت سے کرائیں۔ حالانکہ ان کو حکم دیا گیا تھا کہ وہ اس (کے استحقاق حکمیت) سے انکار کردیں اور شیطان تو یہی چاہتا ہے کہ وہ انھیں بہکا کر راستے سے دور ڈال دے۔

راہ یاب تو صرف ایسے لوگ ہوتے ہیں:۔

وَالّذین اجتنبوا الطّاغوت ان یّعبدوھا وَانابوا الی اللّٰہ لھم البشریٰ فبشر عباد الّذین یستمعون القول فیتّبعون احسنہ اولٰئک الّذین ھدٰھم اللّٰہ واولٰئک ھُم اولوا الالباب (پ ۲۳، الزمر)۔

جن لوگوں نے اس بات سے اجتناب کیا کہ باطل خداؤں کی بندگی بجا لائیں اور اللہ کی جانب متوجہ ہوئے ان کے لئے بشارت ہے پس میرے ایسے بندوں کو بشارت دیدو جو (میری) بات (سماعت قبول سے) سنتے ہیں اور اس کی بہترین ہدایات پر وہی لوگ چلتے ہیں جنھیں اللہ نے راہ یابی سے سعادت اندوز فرمایا اور وہی صاحب عقل و بصیرت ہیں۔

دین کی بہت سی اصطلاحات کی طرح طاغوت کے مفہوم کو بھی محدود و مخصوص کر دیا گیا۔ اب عام طور پر طاغوت سے مراد یا تو بے جان بت ہوتے ہیں یا غیر مرئی شیطان لیکن ان انسانوں کو جو خدا بن کر انسانوں پر اپنے احکام چلائیں، اور انسانوں کو مجبور کریں کہ

وہ اللہ کے بھیجے ہوئے نظامِ حیات کی بجائے ان کے باطل نظام کی پابندی کریں ان کو طاغوت کی تعریف سے خارج کر دیا گیا ہے اور ان کی اطاعت وبندگی کامل شرحِ صدر کے ساتھ جائز کرلی گئی ہے جس میں کوئی کبیدگی اور ضیق محسوس نہیں کی جاتی، لیکن پانچویں پارے کی آیت جو اوپر گزرچکی ہے قطعی حجت ہے کہ فرعون وشداد کے جانشین زمرہ طواغیت سے خارج نہیں ہیں۔

اسی طرزِ زندگی نے مسلمانوں میں انتشار وتفرق پیدا کر دیا ہے جب اطاعت وبندگی اللہ کے ساتھ خاص نہیں رہی تو مقصد زندگی متحد کیونکر رہ سکتا تھا؟ کسی کا مقصد وطن ہے، کسی کا مقصد قوم کسی کا مقصد ہر غالب اور مسلط قوت کی خوشنودی کے ذریعہ اپنے مفاد کا حصول، ہر گروہ اپنی منزل کی طرف بڑھ رہا ہے اور دعویٰ یہ ہے کہ راہِ راست اسی کے زیر قدم ہے، ہر جماعت کو اسی کے نقشِ قدم کی پیروی کرنی چاہیئے۔

اللہ پکارتا ہی رہا۔

اِنَّ هٰذِهٖۤ اُمَّتُكُمْ اُمَّةً وَّاحِدَةً وَّاَنَا رَبُّكُمْ فَاتَّقُوْنِ ۔ (پ ۱۸ ۔ مومنون)

تمھاری یہ قوم ایک واحد قوم ہے اور میں تمھارا پروردگار ہوں، لہٰذا تم صرف مجھ سے ڈرو۔

لیکن کسی برگشتہ راہ گروہ نے یہ پکار نہ سُنی، امتِ واحدہ ٹولی ٹولی میں تقسیم ہوگئی، اب حال یہ ہے کہ ہر ٹولی فرطِ مسرت سے جامے میں نہیں سماتی، وہ خوش ہے کہ رشتۂ حق اسی کے دامن سے بندھا ہوا ہے۔

فتقطعوا امرھم بینھم زبرا کل حزب
بما لدیھم فرحون (پ ۱۸ - مؤمنون)

انھوں نے اپنے مقصدِ حیات کو جو متحد تھا قطع کر کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیا۔ اب جو کچھ جس ٹولی کے پاس ہے وہ اُس پر مسرور و نازاں ہے۔

قرآنِ مجید نے ایک جگہ نہیں، کئی جگہ مسلمانوں کو تشتت و تفرق سے بچنے کی ہدایت فرمائی ہے اور اپنی راہ پر ثابت قدم رہنے کی ہدایت کی ہے۔

ان ھذا صراطی مستقیما فاتبعوہ
ولا تتبعوا السبل فتفرق بکم عن سبیلہ
(پ ۸ - انعام)

یہ میرا سیدھا راستہ ہے، اس لئے اسی راستے پر چلو، اور مختلف راستے اختیار نہ کرو۔ ورنہ اللہ کے راستے سے دور جا پڑو گے۔

قرآنی تاریخ بتاتی ہے کہ دنیا کی جتنی قومیں تباہ و برباد ہوئیں اللہ کی اطاعت و بندگی کی راہ چھوڑ کر دوسرے راستوں پر پڑ جانے کی وجہ سے تباہ و برباد ہوئیں، اس لئے قرآنِ مجید نے مسلمانوں کو متنبہ فرمایا۔

ولا تکونوا کالذین تفرقوا واختلفوا من
بعد ما جاءھم البینٰت۔ (پ ۴ - آل عمران)

تم ان لوگوں کی طرح (مبتلائے تفرق و اختلاف) نہ ہوجانا جن کے پاس (راہِ حق کا) کھلی ہوئی نشانیاں پہنچ چکی تھیں مگر

اس کے بعد بھی وہ تفرقے و اختلاف میں مبتلا ہو گئے ۔
سوال یہ ہے کہ مسلمان جس وادیٔ ظلمات میں آ پھنسے ہیں اس سے باہر کیونکر نکلیں ؟
قرآن حکیم بتاتا ہے :-

اَللّٰہُ وَلِیُّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا یُخْرِجُھُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَی النُّوْرِ وَالَّذِیْنَ کَفَرُوْٓا اَوْلِیٰٓـءُھُمُ الطَّاغُوْتُ یُخْرِجُوْنَھُمْ مِّنَ النُّوْرِ اِلَی الظُّلُمٰتِ ۵ (پ ۳ ، ع ۲)

اللہ ایمان والوں کا رفیق و کارساز ہے ، وہ مومنوں کو ہر قسم کی تاریکیوں سے نکال کر روشنی میں پہنچا دیتا ہے اور منکرین خدا کے رفقاء طاغوت ہیں وہ ان کو روشنی سے نکال کر اندھیریوں میں لے جا دھکیلتے ہیں ۔

اب مسلمانوں کی نجات کی راہ معلوم ہو گئی ، وہ ایمان کے تقاضوں کو پورا کریں ، اور طاغوت کی رفاقت ان کو جس وادیٔ ظلمات میں بھٹکا رہی ہے اس میں آگے بڑھتے چلے جانے کی بجائے ، سیدھے پیچھے پلٹیں اور ٹھیک اس مقام پر آ کھڑے ہوں ، جہاں وہ طاغوت کی رفاقت میں بہکے تھے ، وہ دیکھیں گے کہ وہاں ان کے لئے روشنی ہی روشنی ہے ، راستہ ہی راستہ ہے اور سلامتی ہی سلامتی ہے اور پھر منزل سعادت و کامیابی تک ایک صاف سیدھی روشن شاہراہ چلی گئی ہے ۔

یھدی بہ اللہ من اتّبع رضوانہ سبل السلام ویخرجھم من الظلمٰت الی النور باذنہ

ویھدیھم الیٰ صراط مستقیم۔ (پ ۶ س مائدہ)
جو شخص اللہ کی رضا پر چلتا ہے اللہ اس پر (نورِ ہدایت اور
قرآن کے ذریعہ) سلامتی کی راہیں کھول دیتا ہے، اور اسے
تاریکیوں سے نکال کر روشنی میں پہنچا دیتا ہے اور اپنی مہربانی
سے (سعادت کامیابی کی جانب جانے والی) سیدھی راہ پر
گامزن کر دیتا ہے۔
مسلمانوں کا متحدہ موقف "حبل اللہ" ہے اس لئے اللہ
تعالیٰ کا ارشاد ہے "واعتصموا بحبل اللہ جمیعاً ولا
تفرقوا۔" سب مل کر اللہ کی رسی کو مضبوط پکڑ لو اور تفرقے میں نہ پڑ جاؤ
یہ "حبل اللہ" اللہ کا دیا ہوا نظامِ اطاعت اور ضابطۂ زندگی
ہے جسے لے کر حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مبعوث ہوئے اور
جس کا پابند رہنا اور جسے غالب کرنا مسلمانوں کا فریضۂ حیات ہے
ھو الذی ارسل رسولہ بالھدیٰ و دین الحق
لیظھرہ علی الدین کلہ
دیندار اور خدا پرست مسلمان اپنے خواص و اکابر کو مختلف منازل
و مراحل کی طرف پیش قدمی کرتے دیکھ کر یہ فیصلہ کرنے سے عاجز رہ جاتے
ہیں کہ ان میں کس کا نصب العین اسلامی ہے، اور وہ اس سوچ میں پڑ جاتے
ہیں کہ اسلام نے مسلمانوں کو کوئی معین نصب العین دیا بھی ہے یا بالکل آزاد
چھوڑ دیا ہے کہ وہ صوم و صلوٰۃ اور حج و زکوٰۃ وغیرہ چند مذہبی اعمال کی ادائگی
کے بعد جو نظام زندگی چاہیں اختیار کریں اور جیسی زندگی چاہیں گزاریں
یہ کتاب دیندار اور خدا پرست مسلمانوں کی اسی ذہنی کشمکش

کو دور کرنے اور یہ بتانے کے لئے ترتیب دی گئی ہے کہ اسلام نے مسلمانوں کو ایک معین نصب العین اور ایک مخصوص ضابطۂ زندگی عطا کیا ہے اور وہ ہے حکومتِ الٰہیہ کا قیام۔ اللہ کے بنائے ہوئے قوانین و احکام کے مطابق زندگی گزارنا، بحالتِ موجودہ مسلمانوں میں کتنا ہی اختلاف و تفرقہ ہو لیکن اس امر میں کسی کو اختلاف نہیں کہ اسلامی نصب العین اور اسلامی زندگی یہی ہے چنانچہ اس کتاب میں مسلمانانِ ہند کے تقریباً ہر ممتاز گروہ کے علماء و مفکرین کی تحقیقات و تصریحات جمع کر دی گئی ہیں ؎

حدیثِ عشق بے باکانہ گفتم ∗ نہ از ساقی نہ از پیمانہ گفتم
ترا با شوخیٔ رندانہ گفتم ∗ شنیدم آنچہ از پاکانِ امت

اس کتاب کے مطالعے سے یہ حقیقت واضح ہو جائے گی کہ اسلامی نصب العین اور اسلامی زندگی کے متعلق ہر مسلمان گروہ کا عقیدہ متحد ہے۔

سنہ ۱۹۴۲ء میں جب مغرب و مشرق یکساں حرب زار بنے ہوئے تھے، اور تمام دنیا کا امن و امان جنگ کے جہنم میں خس و خاشاک کی طرح جل رہا تھا ایک امریکی فلسفی نے جامعہ ازہر مصر کے شیخ الاساتذہ حضرت شیخ مصطفیٰ مراغی مرحوم سے سوال کیا کہ اسلام کے نزدیک امن کی شرطیں کیا ہیں اور جدید نظامِ عالم کن اصولوں پر قائم ہونا چاہیے حضرت شیخ مصطفیٰ مراغی اگست سنہ ۱۹۴۵ء کے آخری ہفتہ میں رحلت کر گئے، وہ مصر کے سب سے بڑے عالم سمجھے جاتے تھے۔ انھوں نے جواب دیا کہ۔ دنیا کی جدید تعمیر جب تک روحانی

اور اخلاقی اصولوں پر نہ ہوگی، امن کا قیام ناممکن ہے، مادّی اور سیاسی اصولوں کی کارفرمائی انھیں نتائج کا موجب ہوگی جو اس وقت ظہور پذیر ہو رہے ہیں۔

شیخ نے مزید کہا کہ اسلام میں طاقت کا مرکز انسان نہیں خدا کی ذات ہے، یہ تصور انسان کی طاقت کو سلب کر لیتا ہے اور انسان کو بے اختیار بنا دیتا ہے۔ اسلامی تصورات کے برعکس جمہوریت میں طاقت کا مرکز افراد ہوتے ہیں اور آمریت میں یہ مقام فرد کو حاصل ہوتا ہے، لیکن اسلام ہر فرد سے طاقت چھین لیتا ہے کہ اس کا بے جا استعمال نہ ہو۔

شیخ مراغی مرحوم نے اپنے جواب میں حکومت و اقتدار کے جس اسلامی تصور کی طرف اشارہ کیا ہے اور جس کی رو سے حکومت و اختیار کا مرکز انسانی جمہوریت و انفرادیت کی بجائے خدا کی ذات کو قرار دیا ہے وہ حکومت الٰہیہ کا تصور ہے۔

شاید اس مرحلے پر پہنچ کر مجھ سے سوال کیا جائے کہ جب اسلامی نصب العین حکومت الٰہیہ کا قیام اور اللہ کی حاکمیت کے ماتحت زندگی گزارنا ہے تو ہمارے خواص و اکابر کی کوششیں اور قربانیاں دوسرے اغراض و مقاصد کے لیے کیوں وقف ہیں؟ کیا وہ دین کے مطالبات اور تقاضوں سے ناواقف ہیں؟ کیا وہ راہ راست سے آشنا نہیں؟ کیا وہ خدا پرست اور متقی نہیں ہیں؟ ان سوالات اور ایسے ہی دوسرے سوالوں کے بارے میں میری گزارش یہ ہوگی کہ ان کی جوابدہی کی ذمہ داری مجھ پر عاید نہیں ہوتی۔ ان سے

جوابات سے خود اکابر و خواص حضرات ہی مستفیض فرما سکتے ہیں
میں تو آپ سے صرف یہ عرض کر سکتا ہوں کہ اگر آپ کسی جماعت
یا شخصیت کے اعتماد کی بناء پر اللہ کو اللہ اور رسول کو رسول نہیں
مانتے بلکہ اپنے علم و بصیرت کے ماتحت اللہ و رسول پر ایمان رکھتے
ہیں تو آپ کے لئے اتنا معلوم ہو جانا کافی ہے کہ اللہ و رسول کا
مقرر کردہ نصب العین اور اس تک پہنچنے کی اللہ و رسول کی ٹھہرائی
ہوئی راہ کون سی ہے؟ اس بات کے معلوم ہو جانے کے بعد یہ دیکھنے
کی کوئی ضرورت نہیں کہ اکابر و اصاغر کس راہ پر چل رہے ہیں۔
اگر ان کی راہ اسلامی نصب العین کی طرف نہیں جاتی تو ان کا علم
وفضل، ان کا زہد و تقدس، اور ان کا اخلاص و ایثار سب مُسلّم
مگر ان کی راہ کے غلط ہونے میں آپ کیونکر شبہ کر سکتے ہیں؟ اور
اگر آپ تھوڑی دیر کے لئے اشخاص پرستی کو جائز بھی ٹھیرا لیں تو اسلامی
نصب العین تو آپ کے ساتھ اتنا روادار نہیں ہو سکتا کہ آپ تو
کوچ کریں اس کے مخالف سمت میں اور وہ گھوم کر آ کھڑا ہو آپ
کی راہ میں اور آپ اسی ضد راہ میں اسے پا لیں۔ لامحالہ نتیجہ یہ ہوگا کہ
آپ زندگی بھر چلتے رہنے کے بعد چاہے لندن ماسکو یا واشنگٹن
پہنچ جائیں مگر کعبے نہ پہنچ سکیں گے کعبے پہنچنے کے لئے چار و ناچار
کعبے ہی کی راہ اختیار کرنی پڑے گی خواہ اس کے لئے بزرگ اور
عزیز رفیقانِ سفر سے کنارہ کش ہی ہونا پڑے ۔
اسلامی نصب العین آپ کے سامنے ہے۔ اللہ کے سوا کسی کو
حق حاکمیت حاصل نہیں ہے۔ اس کا ارشاد ہے کہ بجز اس کے

کوئی لائقِ اطاعت و بندگی نہیں۔ یہی ضابطۂ اطاعتِ حق ہے

اِنِ الحکمُ اِلّا لِلّٰہِ اَمَرَ اَلّا تعبدوا اِلّا ایّاہ ذٰلک الدّین القیّم ۝

اگر آپ نے اس عقیدے کے مطالبات پورے کر دیئے اور اعمالِ صالحہ کے ذریعہ اپنے کو اللہ کی خلافت و نیابت کا سزاوار اور مستحق بنا لیا تو اللہ کا وعدہ ہے کہ وہ مؤمنین صالحین کو زمین میں اقتدار و حکومت عطا فرمائے گا۔

وعد اللّٰہ الّذین اٰمنوا منکم وعملوا الصّٰلحٰت لیستخلفنّھم فی الارض ۝

اس منزل کے رہبر حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم وصحابۂ کرام رضوان اللہ عنہم تھے، اگر آپ کی منزل انھیں کی منزل ہے تو ضروری ہے کہ انھیں کی راہ آپ کی راہ بھی ہو، لہٰذا آپ داہیں بائیں نہ دیکھیے۔ جماعتوں اور شخصیتوں پر نظر نہ ڈالیے، حضور اور حضور کے صحابہ کی مکی اور مدنی زندگیوں کو سامنے رکھیئے اور بسم اللہ کہہ کر انھیں کے نقشِ قدم پر سرگرمِ سفر ہو جائیے۔

اِھدِنَا الصِّرَاطَ المُستَقِیمَ صِرَاطَ الَّذِینَ اَنعَمتَ عَلَیہِم غَیرِ المَغضُوبِ عَلَیہِم وَلَا الضَّالِّین

ابو محمد امام الدین — رام نگر بنارس سٹیٹ
ادارۂ ترجمہ و تصنیف — نومبر ۱۹۴۵ء

حکومتِ الٰہی

علامہ اقبال کے کلام پر جن لوگوں کی نظر ہے وہ جانتے ہیں کہ مرحوم دنیا کے تمام مروجہ نظاموں سے کتنے مُتنفّر اور بیزار ہیں، وہ وطنیت اور قوم پرستی کے تنگ نظریات کو بھی عالمگیر انسانیت کے منافی سمجھتے ہیں اُن کے نزدیک انسانیت کی فلاح و نجات صرف اس نظامِ حیات میں ہے جس کے ساتھ حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مبعوث ہوئے اور جس کا داعی قرآن مجید ہے، علامہ اقبال کی زندۂ جاوید تصنیف "جاوید نامہ" کا ایک شہ پارہ جس کا عنوان "حکومتِ الٰہیہ" ہے علامہ کے پیغام کے ماحصل کے طور پر پیش کیا جا رہا ہے:-

بندۂ حق بے نیاز ہر مقام ... نے غلام اُو را نہ او کس را غلام
بندۂ حق مردِ آزاد است و بس ... ملک و آئینش خداداد است و بس
رسم و راہ و دین و آئینش زحق ... زشت و خوب و تلخ و نوشینش زحق
عقل خود بیں غافل از بہبودِ غیر ... سودِ خود بیند نہ بیند سودِ غیر
وحیِ حق بینندۂ سودِ ہمہ ... در نگاہش سود و بہبودِ ہمہ

عادل اندر صلح و هم اندر مصاف — وصل و فصلش لا یراعی لا یخاف

غیرِ حق چوں ناہی و آمر شود — زورور بر ناتواں قاہر شود

زیرِ گردوں آمری از قاہری است — آمری از ماسوی اللہ کافری است

قاہرِ آمر کہ باشد پختہ کار — از قوانیں گردِ خود بندد حصار

جُرّہ شاہین تیز چنگ و زود گیر — صعوہ را در کارہا گیرد مُشیر

قاہری را شرع و دستورے دہد — بے بصیرت سُرمہ با کورے دہد

حاصلِ آئین و دستورِ ملوک — دہ خدایاں فربہ و دہقاں چو دوک

وائے بر دستورِ جمہورِ فرنگ — مردہ تر شد مردہ از صورِ فرنگ

حقہ بازاں چوں سپہرِ گرد گرد — از امم بر تختۂ خود چیدہ نرد

شاطراں ایں گنج ور آں رنج بر — ہر زماں اندر کمیں یک دگر

فاش باید گفت سرِّ دلبراں — ما متاعِ و ایں ہمہ سوداگراں

دیدہ ہا بے نم ز حُبِّ سیم و زر — مادراں را بارِ دوش آید پسر

وائے بر قومے کہ از بیمِ ثمر — می برد نم را ز اندامِ شجر!

تا نیارد زخمہ از تارش سرود — می کشد نا زادہ را اندر وجود

گرچہ دارد شیوہ ہائے رنگ رنگ — من بجز عبرت نگیرم از فرنگ

اے بہ تقلیدش اسیر آزاد شو
دامنِ قرآں بگیر آزاد شو

آسمانی بادشاہت

چودھری غلام احمد پرویز بی اے کو قرآنی تعلیمات سے خاص دلچسپی اور شغف ہے' انھوں نے اس موضوع پر بہترین تحریری ذخیرہ فراہم کیا ہے' ماہنامہ "طلوعِ اسلام" دہلی کے مئی ۱۹۳۹ء کے پرچہ میں پرویز صاحب کا ایک مسلسل مقالہ "آسمانی بادشاہت" کے عنوان سے نظر سے گزرا۔ ذیل میں اس مقالے کا ایک پارہ دیا جارہا ہے۔

جمہوریت ہو یا آمریت۔ زمانہ قدیم میں ہو یا عصرِ حاضرہ میں نظامِ حکومت کی بنا اس پر قائم ہے کہ صاحبِ اقتدار کو حق حاصل ہے کہ وہ اپنی منشاء کے مطابق قانون بنائے۔ اور دوسروں سے اُن قوانین کی اطاعت کرائے۔ جمہوریت میں اکیاون (۵۱) کی اکثریت کو حق حاصل ہے کہ وہ انچاس کی اقلیت سے اپنا فیصلہ بجبر منوائے مثلاً اگر کسی اسمبلی یا کیبنٹ میں یہ سوال پیش ہو کہ خدا ہے یا نہیں اور اکیاون آراء خدا کی ہستی کے خلاف ہوں تو انچاس آراء والی جماعت کو ماننا پڑے گا کہ واقعی (نعوذُ باللہ) خدا نہیں ہے۔ اور یہی

فیصلہ پھر ملک کا قانون بن جائے گا جسے "انتظام" یعنے قوت کے دباؤ سے منوایا جائے گا اور اس فیصلے کے خلاف آواز اٹھانے والے کو حکومت کا باغی قرار دیا جائے گا۔ یہی اصول آمریت کے اندر جلوہ پیرا ہے جمہوریت میں جو شخص اراکین کی اکثریت اپنے ساتھ ملا لے وہی صاحب اختیار ہوجاتا ہے البتہ اس میں ہوتا یہ ہے کہ ایک ایک معاملہ الگ الگ پیش کیا جاتا ہے اور اس میں رائے شماری کی رسم پوری کرلی جاتی ہے۔ اور آمریت میں ایک ہی مرتبہ ان رسمی تکلفات کو طے کر لیا جاتا ہے۔ قوم ایک ہی دفعہ فیصلہ کر کے (بجبر یا برضا و رغبت) ایک شخص کے ہاتھ میں زمام اختیار دے دیتی ہے۔ اور پھر اس شخص کے فیصلے قانون کی حیثیت اختیار کر لیتے ہیں یہ قوانین جمہوریت کے ہوں یا آمریت کے، آخری اور اٹل ہوتے ہیں اور اُن کے خلاف کہیں اپیل نہیں ہوسکتی۔

لیکن جیسا کہ ہم اوپر لکھ چکے ہیں جمہوریت ہو یا آمریت جماعتی حکومت ہو یا شخصی فطرت انسانی نے ہر حکومت سے اباء کیا ہے اس لئے ہر طرز حکومت کی بنیاد اس مفروضہ پر رکھی جاتی ہے کہ بعض انسانوں کو حق حاصل ہوجاتا ہے کہ وہ دوسرے انسانوں کو اپنی مرضی کے مطابق چلائیں حالانکہ یہ بنیاد ہی غلط ہے۔ اور چونکہ خلاف فطرت ہے اس لئے انسانیت غیر محسوس اور غیر شعوری طور پر اس کے خلاف اپنے سینے میں بغاوت کے جذبات موجود پاتی ہے لیکن چونکہ ایک عرصہ کی خوے غلامی سے اس کی قوت تمیز دب چکی ہوتی ہے اِس لئے اُسے نہیں معلوم ہوتا کہ وہ کونسی بنیادی خرابی ہے

جس کی وجہ سے اس کی فطرتِ صالحہ اس طرزِ زندگی کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرتی ہے، اس اضطرابی کیفیت میں وہ کرتا یہ ہے کہ اس نظام کو الٹ دیتا ہے جو اُس کے سامنے موجود ہوتا ہے، اور اس کی جگہ ایک دوسرا نظام قائم کرتا ہے جس کے متعلق سمجھ لیتا ہے کہ اس میں اُسے اطمینان وسکون حاصل ہو جائے گا حالانکہ یہ دوسرا نظام بھی انہی غلط بنیادوں پر قائم ہوتا ہے جن پر پہلا نظام قائم تھا لہٰذا انسان کی کیفیت ہمیشہ سے یہی رہی ہے کہ ع

رُست از یک بند تا افتاد در بندِ دگر

انسان کی عام حالت اس مریض کی سی رہی ہے جسے یہ تو معلوم نہ ہو کہ مجھے مرض کیا ہے لیکن اتنا ضرور جانتا ہو کہ میں تندرست نہیں ہوں پھر وہ ہر نئے علاج کے وقت بلا اختیار پکار اُٹھے کہ بس یہ ہے تریاق، لیکن تھوڑے ہی عرصہ کے بعد خود اپنے ہاتھوں سے مزعومہ تریاق کے شیشے کو پھوڑ ڈالے اور کسی نئے تریاق کی جستجو میں چل نکلے، اور اس کی تمام عمر انہی تجربوں میں بسر ہو جائے۔

كُلَّمَآ اَضَآءَ لَهُمْ مَّشَوْا فِيْهِ ۙ وَاِذَآ اَظْلَمَ عَلَيْهِمْ قَامُوْا ؕ (۲ - ۲)

ذرا بھی چمکی تو دو قدم چل پڑے اور جب اندھیرا ہو گیا تو ٹھٹھک کر رہ گئے۔

انسانیت اسی تگ وتاز۔ اسی اضطراب وانتشار میں الجھتی

تڑپتی، مرغِ بسمل کی طرح یوں پھڑپھڑاتی چلی آرہی تھی کہ ع
ہر قدم پر تھا گماں۔ یاں رہ گئی واں رہ گئی
کہ آج سے قریب چودہ سو برس پیشتر خطیرۂ قدس کی ایک دلکش آواز اس کے کانوں میں آئی کہ آؤ، تمھیں بتایا جائے کہ تمھارے دکھ کا درماں کیا ہے، اس مرض کی دوا کونسی ہے تم نے کہاں غلطی کی ہے؟ اور اس کا ازالہ کیسے ہوسکتا ہے؟ اسی آواز نے بتایا کہ تمھاری بنیادی غلطی یہ ہے کہ تم نے سمجھ رکھا ہے کہ ایک انسان کو حق حاصل ہو جاتا ہے کہ وہ دوسرے انسان پر حکومت کرے۔ یہ غلط ہے اور خلاف فطرت انسانی۔ یاد رکھو اِنِ الحکمُ اِلّا للّٰہ (۱۲/۴۰) حکومت کا حق صرف اللہ کو حاصل ہے جو تمام انسانوں سے بلند و بالا تر ہستی ہے سے

سروری زیبا فقط اس ذات بے ہمتا کو ہے
حکمراں ہے اک وہی باقی بتانِ آذری

اسکے سوا کسی کو حق حاصل نہیں کہ انسان کو اپنا محکوم بنائے تمام انسان ایک سطح پر ہیں، برابر ہیں۔ اس لئے کہ کوئی کسی دوسرے پر بالا دست نہیں ہوسکتا، بالا دست صرف وہ ہستی ہوسکتی ہے جو فی الواقع انسانوں سے بالاتر ہو اور وہ صرف خدا کی ذات ہے حتیٰ کہ وہ برگزیدہ ہستیاں جو تمام نوعِ انسانی کی رشد و ہدایت کے لئے انتخاب کر کے بھیجی جاتی رہی ہیں انھیں بھی یہ حق حاصل نہیں کہ انسانوں کو اپنا غلام بنالیں۔

مَا کَانَ لِبَشَرٍ اَنْ یُّؤْتِیَهُ اللّٰهُ الْکِتٰبَ

وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ ثُمَّ يَقُولَ لِلنَّاسِ كُونُوا عِبَادًا لِّي مِن دُونِ اللَّهِ وَلَٰكِن كُونُوا رَبَّانِيِّينَ بِمَا كُنتُمْ تُعَلِّمُونَ الْكِتَابَ وَبِمَا كُنتُمْ تَدْرُسُونَ۔ (۳-۷۸)

کسی انسان کے لئے یہ زیبا نہیں کہ اللہ اسے کتاب و حکم نبوت عطا فرمائے اور وہ لوگوں سے یہ کہنا شروع کر دے کہ تم اللہ کے بجائے میرے غلام بن جاؤ۔ (بلکہ وہ یہی کہے گا) کہ تم سب اللہ کے غلام بن جاؤ۔ کہ تم (قوانین الٰہی کی) کتاب خود بھی پڑھتے ہو اور دوسروں کو بھی پڑھاتے ہو۔

یہ قوانین الٰہی جن کی اتباع سے انسانوں کو ہر ایک کی غلامی کا طوق اتار کر فقط ایک اللہ کا غلام بننا تھا اس کتاب مقدس، اس صحیفۂ آسمانی میں منضبط ہوتے جو ان حضرات انبیاء علیہم السلام پر نازل ہوتا۔ انبیائے کرام کا ذکر کرنے کے بعد فرمایا۔

وَأَنزَلَ مَعَهُمُ الْكِتَابَ بِالْحَقِّ لِيَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ فِيمَا اخْتَلَفُوا فِيهِ ۝ (۲-۲۱۲)

اور (اللہ نے) ان پر کتاب نازل کی حق کے ساتھ تاکہ وہ ان امور میں جن میں لوگ اختلاف کرتے ہیں حکم بنیں (فیصلے کریں)۔

جو ان قوانین الٰہیہ کے مطابق حکومت نہ کرے وہ خدا کا عملاً منکر ہے حدود اللہ سے تجاوز کرنے والا ہے۔

وَمن لم یحکم بما انزل اللہ فا ولئک
ھُم الظّلمون ۔(ھم الکافرون) (پ ۶ ۔ ۴۴)

اور جو قوانین خداوندی کے مطابق حکومت نہ کرے گا
(فیصلے نہ کرے گا) تو ظالمین میں سے ہوگا۔ (کافرین میں سے ہوگا)

یہ قوانین خداوندی مختلف زمانوں میں مختلف اقوامِ عالم کو وقتاً فوقتاً ملتے رہے لیکن چونکہ وہ یا تو حوادثِ ارضی وسماوی سے محفوظ نہ رہ سکے یا ان میں انسانی ہاتھوں نے ردوبدل کر ڈالا اس لئے ان کا آخری اور مکمل ایڈیشن قرآنِ کریم کی شکل میں دنیا کو دیا گیا اور یہ ذمہ خود اللہ تعالیٰ نے لے لیا کہ اب اس آخری پیغام میں قیامت تک کسی قسم کا ردوبدل اور تحریف و الحاق نہیں ہو سکے گا۔ اس ضابطۂ خداوندی کی غرض و غایت یہی تھی کہ نظامِ حکومت اسی کے ماتحت قائم ہو، توریت و انجیل کے ذکر کے بعد فرمایا۔

وانزلنا الیک الکتاب بالحقّ لما بین
یدیہ من الکتاب ومھیمناً علیہ فاحکم
بینھم بما انزل اللہ ولا تتبع اھواءھم عما جاءک من الحقّ (پ ۶ ع ۱۵)

اور ہم نے (اے رسول!) تمھاری طرف حق کے ساتھ یہ کتاب نازل کی ہے جو ان تمام کتبِ سماوی کی تصدیق کرتی ہے جو اس سے پیشتر دنیا کو مل چکی ہیں اور ان کے مضامین کو اپنے اندر لئے ہوئے ہے پس اس ضابطۂ خداوندی کے مطابق لوگوں میں (نظامِ) حکومت قائم کرو (فیصلے کرو) اور لوگوں کے خیالات کی اتباع نہ کرو۔ ورنہ وہ تمھیں اس راستے

سے ہٹا دیں گے جو تمھیں حق و صداقت کے ساتھ دیا گیا ہے۔
یہ قوانین چونکہ اس خدائے کائنات کے مرتب فرمودہ ہیں جو ربُّ العٰلمین ہے جو تمام نوعِ انسانی کا یکساں پروردگار ہے۔ اس لئے ان میں کسی خاص جماعت خاص قوم خاص ملک کی کوئی رعایت بھی کی گئی نہ کسی کی مخالفت۔ انسانوں کے وضع کردہ قوانین کتنے ہی بلند درجہ پر کیوں نہ ہوں ان میں ارادی یا غیر ارادی طور پر اپنی جماعت کے مفاد کی طرف میلان ضرور ہوگا۔ جب تک انسان کے سینے میں دھڑکنے والا دل موجود ہے وہ جذبات سے عاری نہیں ہو سکتا۔ اور جذبات کا تقاضہ ہے کہ وہ امیال و عواطف کی رنگینی قبول کرلیں۔ ؎

عقل خود بیں غافل از بہبودِ غیر
سُودِ خُود بیند نہ بیند سُودِ غیر

برعکس اس کے اللہ تعالیٰ کی ذاتِ اقدس اُن جذبات سے مُنزّہ و مبّرا ہے۔ اس لئے اُس کے وضع کردہ قوانین میں کسی خاص سمت جُھک جانے کا امکان ہی نہیں ہو سکتا۔ وہاں ہر معاملہ اصول پر مبنی ہوگا۔ اور ایک خاص قاعدے اور قانون کے ماتحت اس کا فیصلہ ہوگا۔

لَقَدْ اَرْسَلْنَا بِالْبَيِّنٰتِ وَاَنْزَلْنَا مَعَهُمُ
الْكِتٰبَ وَالْمِيْزَانَ لِيَقُوْمَ النَّاسُ
بِالْقِسْطِ ۚ (۵۷ - ۲۵)۔

لاریب ہم نے رسولوں کو واضح دلائل کے ساتھ بھیجا
اور ان کے ساتھ کتاب یعنی قوانین عدل و انصاف
نازل کیے تاکہ لوگ انصاف پر قایم رہیں۔

دی حق بیننده سود همہ
در نگاہش سود و بہبود همہ

پھر دنیاوی نظامِ حکومت میں کوئی نہ کوئی منزل ایسی آئے گی جہاں پہنچ کر قوانین کے وضع یا نافذ کرنے والے خود قانون کی حد سے بالا تر ہو جائیں گے یا کم از کم ان کے فیصلوں کی اپیل کہیں نہیں ہو سکے گی۔ "ڈکٹیٹر شپ" جو انسانی نظامِ حکومت کے سلسلۂ ارتقاء میں آخری کڑی سمجھی جاتی ہے اسی اصول پر مبنی ہے کہ ڈکٹیٹر کا ہر لفظ قانون ہوتا ہے اور وہ خود قانون سے بالا تر۔

اسٹالن اپنی کتاب "لینن ازم" میں خود لینن کے الفاظ نقل کرتا ہے کہ ...... "ڈکٹیٹر کے معنی ہیں قوت، غیر محدود قوت، ایک قاہرہ قوت، جو خود آئین و دستور سے بلند ہو اور اس کا ہر لفظ قانون ہو۔"

اٹلی کے ہر مدرسہ کی دیوار پر فسطائیت کے اصول آتشیں حروف میں لکھے جاتے تھے جن میں سب سے پہلا اصول یہ تھا کہ مسولینی کا ہر لفظ قانون ہے اور وہ کبھی غلطی نہیں کر سکتا۔ المانیہ میں ہٹلر کا ہر اشارہ قانون بن کر نافذ ہوتا تھا۔ شاہِ انگلستان کے متعلق بھی دستور و آئین میں یہ شق رکھنی پڑتی ہے کہ وہ کبھی غلطی نہیں کر سکتا۔ ہندوستان میں بھی پچھلے دنوں مہاتما گاندھی کے متعلق علانیہ کہا گیا کہ وہ منزہ عن الخطا ہیں یعنے ہر جگہ اس کی ضرورت پڑتی ہے کہ نظامِ آئین و دستور میں سب سے اوپر کی کڑی کسی کی مطیع و فرمانبردار نہ ہو، اس کے برعکس نظامِ خداوندی میں کوئی بھی کڑی ایسی نہیں ہوتی جو احاطۂ اطاعت و اتباع سے باہر نکل جائے بلکہ وہاں تو

اطاعت اور بلندئ مدارج لازم و ملزوم ہیں جتنا کوئی بلند ہوتا ہے اتنی ہی زیادہ اطاعت اُسے کرنی پڑتی ہے۔ اور جتنی زیادہ کوئی عبادت کرتا ہے اسی نسبت سے اُسے سرفرازی و سربلندی کے مدارج عطا ہوتے ہیں۔ نظام خداوندی میں ذاتِ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کو جو مرتبہ حاصل ہے وہ ظاہر و باہر ہے۔

بعد از خدا بزرگ توئی قصہ مختصر

لیکن خود حضور کے لئے سب سے بڑا شرف اجتباء یہ ہے کہ "عبدہٗ" اللہ کے غلام، اس کے مطیع و فرمانبردار اور قوانین خداوندی کی سب سے زیادہ اتباع کرنے والے ہیں۔ ارشاد ہے۔

اتبع ما اوحی الیک من ربک (۶-۱۰۷)

جو کچھ تیرے رب کی طرف سے وحی کیا جاتا ہے اس کی اتباع کر۔

اس نظام کائنات کا ایک ایک ذرہ اطاعت کے اٹل اور بے پناہ قانون میں جکڑا ہوا ہے۔ اگر سورج کا عظیم الشان کرہ ایک سکینڈ کے سویں حصہ کے برابر بھی اس قانون اطاعت میں تساہل برتے تو یہ تمام نظام شمسی دھنی ہوئی روئی کے گالوں کی طرح فضائے آسمانی میں اڑتا ہوا نظر آئے۔ خاک کے ایک ادنیٰ ذرے سے لیکر ان بڑے محیر العقول کروں تک تمام کے تمام ایک بلند و بالا تر قانون کے مطیع اور منقاد ہیں اسی سے یہ سلسلۂ نظم و ضبط قائم ہے، تو کیا آپ سمجھتے ہیں کہ فطرت کا یہ منشاء ہو سکتا ہے کہ انسان کے لئے کسی منزل (اسٹیج) پر پہنچ کر اطاعت کا قانون

غیر ضروری ہو جائے؟ لیکن انسانوں کے بنائے ہوئے نظام میں اس کے سوا چارہ نہیں کہ ایک خاص منزل پر پہنچ کر کسی نہ کسی انسان یا انسانوں کی جماعت کو اطاعت کے قانون سے مستثنیٰ کیا جائے۔ یہ ہے وہ دوسرا بنیادی نقص جو دنیا میں انسانوں کے وضع کردہ نظام حکومت میں موجود رہتا ہے اور جس کے دور کرنے کا کوئی طریقہ نہیں، کہا جا سکتا ہے کہ جمہوری نظام میں مجلس واضعین قانون کا ہر رکن قانون کی اطاعت پر اسی طرح سے مجبور ہے جس طرح دوسرے انسان، اس لئے وہ جماعت اطاعت کے قانون سے مستثنیٰ نہیں ہوتی، لیکن جس جماعت کے اختیار میں ہو کہ جس وقت چاہے کوئی قانون بنالے اور جب جی چاہے اس میں رد و بدل کر دے یا اُسے منسوخ ہی کر ڈالے تو آپ سمجھ سکتے ہیں کہ وہ جماعت کس وقت تک اطاعت کی مکلف رہے گی؟ صرف اس وقت تک جب اُسے اس قانون کی اطاعت میں اپنا فائدہ نظر آتا ہو۔ اور جب اُسے اس قانون کی اطاعت میں نقصان معلوم ہوگا تو وہ جھٹ سے قانون بدل ڈالے گی جب یہ حالت ہو تو کیا یہ کہنا درست ہوگا کہ یہ جماعت قانون کی اطاعت پر مجبور ہے؟ درست تو یہ کہنا ہوگا کہ خود قانون اس جماعت کی اطاعت پر مجبور ہے۔ قرآن کریم نے ان ہر دو اہم اور بنیادی نقائص کو الگ کر کے رکھ دیا جب اس نے فیصلہ کر دیا کہ

(۱) کسی انسان کو دوسرے انسان پر حکومت کرنے کا حق حاصل نہیں یہ حق صرف ذات باری تعالیٰ کو حاصل ہے۔ اور

(۲) کوئی انسان ایسا نہیں جسے قانونِ اطاعت سے مستثنیٰ قرار دیا جائے۔

اور یہ نقائص ایسی صورت میں دور ہوسکتے ہیں کہ قانون کے اصول انسانوں کے وضع کردہ نہ ہوں بلکہ انسانوں سے اعلیٰ و ارفع ہستی کی متعین فرمودہ ہوں اللہ تعالیٰ کے اس ضابطۂ قوانین کے ماتحت کسی انسان کو قانون زنی کا حق باقی نہیں رہتا اُن کے سپرد صرف یہ خدمت ہوتی ہے کہ ان اصولوں کی روشنی میں جزئیات و فروعات کو ترتیب دیں اور پھر دنیا میں ان قوانین کی تنفیذ کریں جب دنیا میں نظام آئین و دستور کی یہ شکل پیدا ہوگی تو اس وقت کہا جاسکے گا کہ انسان کو فی الواقع آزادی حاصل ہے کیونکہ اس وقت کوئی انسان کسی دوسرے انسان کا غلام نہ ہوگا اس وقت وہ تمام اغلال و سلاسل جو بالادست انسانوں نے زیردست انسانوں کی گردن میں مختلف نام دے کر ڈال رکھے ہیں ایک ایک کرکے اتر جائیں گے اور انسان خدا کی اس کھلی فضا میں اطمینان کا سانس لے گا اور سر اونچا کرکے چل سکے گا۔ اس وقت وہ محسوس کرے گا کہ۔

بندۂ حق بے نیاز از ہر مقام
نے غلام اور ا نہ او کس را غلام
رسم و راہ و دین و آئینش ز حق
زشت و خوب و تلخ و نوشینش ز حق

تحریکِ حکومتِ الٰہیّہ

تعارف! جناب مولٰنا محمد منظور صاحب نعمانی
مدیر "الفرقان" بریلی نے اپنے موقر مجلہ میں "ایک دینی تحریک
کا تعارف" کے عنوان سے ایک مقالہ شائع کیا تھا جو
"ترجمان القرآن" شوال تا ذی الحجہ ۱۳۶۳ھ میں نقل ہوا تھا
یہ مقالہ اس تالیف کو مقدمے سے بے نیاز کر دیتا ہے اسلئے
اس کے اقتباسات دیے جا رہے ہیں۔

جماعتِ اسلامی کے مقاصد اور بعض دیگر بنیادی امور

الحمد للہ رب العلمین وسلام علیٰ
المرسلین
قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم۔ لا یؤمن احدکم
حتی یحب لاخیہ ما یحب لنفسہ (او کما قال)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:- تم میں سے کوئی اُس وقت

تک مومن نہیں ہو سکتا جب تک اپنے ہر دینی بھائی کے لئے
وہی نہ چاہے جو وہ اپنے لئے چاہتا ہے اور وہی پسند کرے جو
وہ اپنے لئے پسند کرتا ہے۔"

ایمان کی حقیقت سے واقف کوئی ایسا ایمان والا نہ ہوگا
جس کے دل میں یہ جذبہ اور سینے میں یہ تڑپ نہ ہو کہ خود ہم اور دوسرے
سارے مسلمان حقیقی معنوں میں مومن و مسلم ہو جائیں۔ ہماری زندگی ہدایتِ
ربانی کے ماتحت ہو۔ خدا ہم سے راضی ہو اور آخرت میں ہم خاسروں میں
سے نہ ہوں۔ اور نہ صرف ہم بلکہ اولادِ آدم کا زیادہ سے زیادہ حصّہ
نجات و فلاح کی اس راہ پر آجائے۔ اللہ کا دینِ حق سارے باطل
دینوں پر اور اللہ کا کلمہ دوسرے تمام کلموں کے مقابلے میں سربلند
ہو۔ دنیا کا نظام اللہ کی مرضی کے مطابق ہو جس میں انسان کے لئے
نیک بننا اور نیک بن کر جینا بد بننے اور بد بنکر جینے سے زیادہ آسان
ہو عزت و عظمت تقوے کی ہو اور خدا کے نافرمانوں اور ظالموں
کے لئے صرف ذلت ہی ذلت ہو۔

یہ بھی ظاہر ہے کہ یہ تمنا اور یہ آرزو کسی "امرِ محال" کی تمنا اور
آرزو نہیں ہے کہ صرف مزاحیہ فقروں غیر سنجیدہ قہقہوں یا سنجیدہ
قسم کے زیرِ لب تبسم سے اس کا استقبال کر کے معاملہ ختم کر دیا جائے۔
پھر یہ بھی ایک کھلی حقیقت ہے کہ صرف "جذبہ" اور "تڑپ"
سے، صرف "تمنا" اور "آرزو" سے ان میں سے کوئی مقصد بھی حاصل نہیں
ہو سکتا۔ بلکہ اس کے لئے ضرورت ہوگی عملی جد و جہد اور بے انتہا
سعی و سرگردانی کی۔

پھر کوئی صاحبِ عقل وفہم غالباً اس سے بھی اختلاف نہیں کریگا کہ ان پاک مقاصد کے لئے اسی طریقہ پر جد وجہد اور اسی راہ پر تگ ودو کرنا صحیح ہوگا جو ان مقاصد سے مناسبت رکھتے ہوں اور جو اس منزلِ مقصود تک پہنچانے والے ہوں، دوسرے طریقوں پر جس قدر بھی جدوجہد کی جائے گی اور دوسری، راہوں پر جتنی بھی تیزی اور سرگرمی سے چلا جائے گا نہ صرف یہ کہ ان مقاصد تک نہیں پہنچا جاسکیگا بلکہ غالباً اور زیادہ دوری بڑھتی جائے گی۔

پس جو شخص ان مقاصد پر ایمان رکھتا ہو اور یہ اس کو دوسری تمام چیزوں سے زیادہ عزیز ہوں اس کے لئے ضروری ہے کہ جس طرح وہ دنیا میں زندہ رہنے اور اپنی اولاد کی پرورش کے لئے ہرقسم کی مناسب کوشش کرنے کے لئے تیار رہتا ہے اسی طرح بلکہ اس سے زیادہ ان مقاصد کی تکمیل کے واسطے ہرممکن جدوجہد کے لئے اپنے کو تیار کرے پھر اس کے طریقہ کار اور راہِ عمل کو سوچے سمجھے اور متوکلاً علی اللہ اس پر گامزن ہو جائے۔

تھوڑی سی میری سرگزشت | بزرگو! دوستو! اور دینی بھائیو! یہ تھے وہ چند واضح تصورات جنھوں نے اب سے تین چار سال پہلے تفصیلی طور پر میرے دل ودماغ پر قبضہ کیا اس وقت تک سیاسیات اور مذہبیات میں میری دلچسپیوں اور عملی سرگرمیوں کا ایک خاص رُخ تھا جس سے اکثر حضرات "الفرقان" دورِ قدیم کے ذریعہ ضرور واقف رہے ہوں گے[1]۔

[1] مولانا نعمانی کا تعلق سیاسیات میں جمعیت العلماء سے تھا، اور مذہبیات میں مذہبی مناظروں سے۔

جس وقت مذکورہ صدر خیالات کا دل و دماغ پر تسلط ہوا تو مجھے اپنی زندگی پر نظر ثانی کرنی پڑی اور میں اس نتیجہ پر پہنچا کہ سیاسیات میں جس مسلک سے عقیدۃً اتفاق (اور اس کے ساتھ تھوڑا سا عمل بھی) اب تک رہا ہے وہ ان مقاصد کے لئے صحیح نہیں ہے (اور یہ واقعہ ہے کہ وہ مسلک ان مخصوص مقاصد کو سامنے رکھ کر وضع بھی نہیں کیا گیا ہے) علیٰ ہذا مذہبی خدمات کے سلسلہ میں جس خاص شعبہ سے میری دلچسپی تھی بلکہ اس وقت تک جس میں میرا پورا انہماک تھا (یعنی فرق باطلہ بالخصوص اہل بدعت کا مناظرانہ طریق پر رد) میں نے محسوس کیا کہ اگرچہ یہ بھی ایک دینی خدمت ہے مگر مذکورۂ صدر مقاصد کا مطالبہ اس کے طریق کو بدلنے اور دین کے اُن دوسرے شعبوں میں اُس سے زیادہ کام کرنے کے لئے ہے جن کا تعلق ان مقاصد سے براہ راست اور قریب تر ہے۔ ان خیالات کا عملی زندگی پر یہ اثر پڑا کہ پچھلی سیاسی و مذہبی دلچسپیوں اور سرگرمیوں کا رُخ آپ سے آپ بدلنے لگا جس کا اندازہ دیکھنے والوں نے "الفرقان" ہی سے فرمایا ہوگا۔

اس کے بعد سے برابر یہ آرزو بلکہ حسب مقدور کوشش بھی رہی کہ کوئی جماعت ان مقاصد کو صحیح طور پر اپنا نصب العین بنا کر سرگرم عمل ہو تو اپنے کو اُس سے وابستہ کر دیا جائے۔ کیونکہ ظاہر ہے کہ کسی ایک فرد یا بہت سے منتشر افراد کی بھی مساعی اس کار عظیم کے لئے نتیجہ خیز نہیں ہو سکتیں۔ نیز اس کا مزاج بھی اجتماعیت کو چاہتا ہے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ دینی نقطۂ نظر سے بھی اس کی ضرورت ہے،

اور یہی "اُسوۂ نبوی" ہے۔ وَکَفٰی بِہٖ قُدوۃً۔

اسی زمانہ میں مولینا سید ابو الاعلیٰ مودودی نے "دارالاسلام" کے نام سے ایک ادارہ کی بنیاد ڈالی۔ اس سلسلہ کے پہلے اجتماع میں جس میں کہ اس ادارہ کی تاسیس ہوئی تھی، موصوف کی دعوت پر میں بھی شریک ہوا تھا۔ یہ ادارہ مقاصد اور طریق کار کے اعتبار سے بھی میری اس آرزو سے بہت مطابقت رکھتا تھا لیکن اس وقت میں نے اس میں شرکت نہیں کی صرف اس لیے کہ اس کارِ عظیم کو چلانے کے لیے جن اوصاف و خصوصیات کی میں ضرورت سمجھتا تھا مولینا مودودی میں وہ چیزیں میں پوری طرح نہیں پاتا تھا۔

اس کے بعد سے میری جستجو یہ رہی کہ کوئی ایسا اللہ کا بندہ اس کام کو ہاتھ میں لے جو میری آرزوؤں کے مطابق ہر جہت سے کامل و مکمل ہو۔ اس آرزو کی تکمیل کے لئے اپنے مقدور کے مطابق سعی و کوشش اور تلاش و جستجو میں بھی غالباً کوئی کمی نہیں کی اپنے کچھ محترم بزرگ تھے جن کی طرف رہ رہ کے نگاہ جاتی تھی۔ ان کو دوسرے دینی کاموں میں اتنا منہمک یا آج کل کی سیاستکاریوں سے اتنا مانوس و مالوف پایا کہ وہ اس سے ہٹ کر پوری طرح ادھر آنے کے لئے تیار نہ ہو سکتے تھے۔ وہ اپنی عمر دین کا بڑا حصہ اپنی صوابدید کے مطابق جن کاموں اور جن راہوں میں صرف کر چکے ہیں ان کے لئے اس سے یکایک بازگشت کر جانا بہ نسبت ہم جیسوں کے یقیناً بہت مشکل بھی تھا۔

میں یہاں بہت صفائی سے یہ بھی عرض کر دینا چاہتا ہوں

کہ اس دوران میں اپنے آپ کو بھی میں نے بار بار جانچا اور تولا اور ہر دفعہ فی مابینی وبین اللہ میں نے یہی فیصلہ کیا کہ اس کام کے لیئے جن خاص صلاحیتوں کی ضرورت ہے وہ مجھ میں موجود نہیں ہیں اسلئے اس مقصد کے لیئے خود ہی اُٹھ کھڑے ہونے کی ہمت نہ کر سکا اور آگے چلنے والے کی تلاش کا سلسلہ جاری رہا۔

تلاش وجستجو کے اس طویل سلسلہ میں بہت سے ایسے نامعروف اور خاموش بندگان خدا کا پتہ بھی لگا جو اس مقصد کے لیئے اپنے سر میں مجھ سے بدرجہا زیادہ سودا اور سینہ میں مجھ سے کہیں سوا تڑپ رکھتے تھے ان میں بعض وہ بھی تھے جن کو میں نے اپنے خیال میں ان صلاحیتوں اور خصوصیتوں کا حامل یقین کیا جن کو میں ضروری سمجھتا تھا۔ لیکن ان سب کا فیصلہ میں نے یہی پایا کہ ہم اس کار عظیم کی ذمہ داری کا بار سنبھالنے کے قابل نہیں ہیں، ہاں کوئی اللہ کا بندہ اس راہ پر آگے بڑھنے کے لیئے تیار ہو تو ساتھ چلنے والوں میں انشاء اللہ ہم بھی ہوں گے ـــــــ قریب قریب یہی تھا میری دو سال کی تلاش وجستجو کا حاصل۔

تلاش وجستجو کی اس ناکامی کو بھی میں نے اپنے لیئے کافی عذر نہ سمجھا اور اب میں نے طے کر لیا کہ ہر جہت سے کامل و مکمل انسان نہیں ملتا تو اس کے انتظار میں ہاتھ پہ ہاتھ دھرے بیٹھا رہنا غلط ہے جب مقصد کی صحت پر ہمارا ایمان ہے اور ہم خود بہت ناقص ہیں تو اگر کوئی ایسا اللہ کا بندہ میدان میں اترنے کے لیئے تیار ہو جائے جو فی الجملہ ہم سے بہتر ہو اور اس مقصد کے لیئے کام کرنے

کے واسطے جن مخصوص صلاحیتوں کی ضرورت ہے وہ ان میں بس ہم سے اچھا ہو تو اس کے ساتھ ہو لینا چاہیئے۔ بہر حال "مردِ کامل" کی تلاش و جستجو کی اس ناکامی کے بعد کم از کم اپنے حق میں میں نے یہی فیصلہ کر لیا۔

"جماعت اسلامی" کی تاسیس | مجھے اس آخری فیصلہ پر پہنچے چند ہی دن گزرے ہوں گے کہ رسالہ "ترجمان القرآن" لاہور کے محرم سنہ ۶۰ھ کے پرچہ میں (جو غالباً ربیع الثانی میں شائع ہوا تھا) اسی مقصد کے لئے ایک جماعت کی تشکیل کی ضرورت کی طرف مولانا مودودی نے پھر خصوصی طور پر توجہ دلائی اور اجمالی خاکہ بھی پیش کیا۔ —— اس کے بعد ماہِ صفر کے "ترجمان" میں (جو غالباً رجب میں شائع ہوا تھا) ایک عام دعوت دی گئی کہ جو لوگ اس نظریہ سے متفق ہوں اور اس طرز پر کام کرنے کے لئے تیار ہوں وہ اپنے ارادہ سے اطلاع دیں —— پھر جن لوگوں نے اس کے لئے آمادگی کی اطلاع دی ان سے استدعا کی گئی کہ وہ یکم شعبان سنہ ۱۳۶۰ھ (۲۵ اگست سنہ ۱۹۴۱ء) کو لاہور پہنچ جائیں۔ چنانچہ جن حضرات کو یہ اطلاع دی گئی تھی قریب قریب وہ سب ہی حضرات پہنچے۔ ان میں اکثر حضرات تو ایسے تھے جو انفرادی طور پر آئے تھے۔ لیکن کچھ حضرات وہ بھی تھے جن کو کسی ایک جگہ کے چند ہم خیال افراد نے اپنی نمائندگی کا بھی حق دے کر بھیجا تھا۔ یہ حضرات تعداد میں پچھتر تھے۔ راقم سطور بھی ان میں سے ایک تھا۔ یہ اجتماع چار پانچ دن تک جاری رہا۔

ان حضرات نے مجتمعاً و انفراداً بہت کچھ تبادلہ خیالات کے

بعد جماعت کے اساسی عقیدے، نصب العین، نظام جماعت اور ابتدائی لائحۂ عمل کے متعلق ان نقاط پر اتفاق کیا جو "دستور جماعت اسلامی" کے نام سے شائع ہو چکے ہیں۔ اس دستور کا ابتدائی مسودہ مولانا مودودی صاحب ہی کا تیار کیا ہوا تھا۔ لیکن جماعت کی مشاورت اور مبادلہ افکار کے بعد حذف و اضافہ یا تبدیل کی صورت میں اس میں کچھ ترمیمیں بھی ہوئیں اور اب جو دستور شائع ہوا ہے یہ وہی طے شدہ دستور ہے۔

جماعت کی امارت | دستور کے آخری حصہ میں "امارت" کے متعلق جو دفعہ ہے وہ اصل مسودہ میں نہیں تھی، دستور کی تکمیل کے بعد جب تمام شرکاء اجتماع نے اس دستور والی جماعت میں منسلک ہونا طے کر دیا یا بالفاظ دیگر ایک مقصد اور اس کے حصول کے لئے جد و جہد کرنے پر اتفاق کر کے جب وہ ایک "جماعت" بن گئے تو یہ سوال اٹھا کہ جماعتی نظم کے لئے ہم کو کیا شکل اختیار کرنا چاہیئے؟ بالآخر بہت غور و فکر اور طویل بحث و تنقیح کے بعد یہ اجتماع اس نتیجہ پر متفق ہوا کہ جماعت ایک امیر کے زیر ہدایت و سیادت کام کرے جیسا کہ نصوص شرعیہ اور سنتِ سلف اس کے لیئے رہنمائی کرتے ہیں بہر حال جماعت نے اپنے لئے نہ ڈکٹیٹری نظام کو قبول کیا اور نہ یورپ سے سیکھی ہوئی اس جمہوریت کو جس پر آج ہندوستان کی اکثر سیاسی جماعتیں چل رہی ہیں بلکہ "شوروی امارت" کے اسلامی اصول ہی کو اختیار کیا اور امیر کی پوزیشن اور جماعت میں اس کا مقام متعین کرنے کے لئے اس کے متعلق ایک مفصل دفعہ بھی دستور میں شامل

کردی جو یہاں نقل کی جاتی ہے۔

دستور کی دفعہ نمبر (۱) متعلقہ امارت

"اس جماعت کا ایک امیر ہوگا جس کی حیثیت "امیر المومنین" (باصطلاح معروف) کی نہ ہوگی بلکہ صرف اس جماعت کے رہنما کی ہوگی۔ اس کی اطاعت فی المعروف جماعت کے کل افراد اپنے امیر (باصطلاح شرعی) کی حیثیت سے کرینگے امیر کے انتخاب میں تقویٰ، علم دین بصیرت، اصابتِ رائے اور عزم و حزم کو ملحوظ رکھا جائے گا۔ جماعت کی دعوت اپنے عقیدے اور نصب العین کی طرف ہوگی نہ کہ اپنے امیر کی شخصیت اور اس کی امارت کی طرف۔ جماعت کی نظر میں انتخاب کے وقت جو شخص بھی مذکورہ بالا اوصاف کے لحاظ سے اہل تر ہوگا اس کو وہ اس منصب کے لئے منتخب کرے گی۔

امیر کی خدا ترسی و احساس ذمہ داری سے یہ توقع کی جائیگی کہ اپنے سے زیادہ اہل آدمی کے آجانے پر وہ خود اس کے لئے جگہ خالی کردے گا۔ نیز ایسی صورت میں جب کہ جماعت اپنے نصب العین کے مفاد کے لئے ضرورت محسوس کرے وہ امیر کو معزول کرنے کی بھی مجاز ہوگی۔"

امارت کے متعلق یہ اصول طے کر لینے کے بعد ساتھ ہی جماعت کے سامنے انتخاب امیر کا سوال آگیا۔ امیر میں جو اوصاف ہونے چاہئیں

ان کے لحاظ سے بحیثیت مجموعی مولانا مودودی سے زیادہ بہتر بلکہ ان کے برابر بھی ہم نے شرکاء میں کسی اور کو نہیں پایا۔ اس نئے سب نے انہی کے متعلق رائے ظاہر کی اور انہی سے اس کو قبول کرنے کی درخواست کی۔ چنانچہ وہی جماعت کے امیر منتخب ہوئے۔

مولانا مودودی صاحب نے انتخاب امارت سے پہلے اور بعد میں جماعت کی قیادت و امارت کے متعلق شرکاء اجتماع کے سامنے چند باتیں کہی تھیں۔ ان کا اس جگہ نقل کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے ——— اجتماع کی ابتدائی تمہیدی تقریر میں اس بارہ میں آپ نے فرمایا تھا:-

میرے متعلق کسی کو یہ غلط فہمی نہ ہونی چاہیئے کہ جب دعوت میں نے دی ہے تو آئندہ اس تحریک کی رہنمائی کو بھی میں اپنا ہی حق سمجھتا ہوں۔ ہرگز نہیں، نہ میں اس کا خواہشمند ہوں، نہ اس نظریہ کا قائل ہوں کہ داعی کو ہی آخر کار لیڈر بھی ہونا چاہیئے۔ نہ مجھے اپنے متعلق یہ گمان ہے کہ اس عظیم الشان تحریک کا لیڈر بننے کی اہلیت مجھ میں ہے، اور نہ اس کام کی بھاری ذمہ داریوں کو دیکھتے ہوئے کوئی صاحب عقل آدمی یہ حماقت کر سکتا ہے کہ اس بوجھ کے اپنے کندھوں پر لادے جانے کی خود تمنا کرے۔ درحقیقت میری غایت تمنا اگر کچھ ہے تو وہ صرف یہ ہے کہ ایک صحیح اسلامی نظام جماعت موجود ہو اور میں اس میں شامل ہوں، اسلامی

نظامِ جماعت کے ماتحت ایک چپراسی کی خدمت انجام دینا بھی میرے نزدیک اس سے زیادہ قابلِ فخر ہے کہ کسی غیر اسلامی نظام میں صدارت اور وزارتِ عظمیٰ کا منصب مجھے حاصل ہو۔ لہٰذا اس مفروضہ پہ نہ چلیئے کہ جس طرح تشکیل جماعت سے پہلے سارے کام میں اپنی ذمہ داری پر چلاتا رہا ہوں، اسی طرح تشکیل جماعت کے بعد بھی میں ہی آپ سے آپ امارت کا کام اپنے ہاتھ میں لے لوں گا یا لینا چاہوں گا۔ جماعت بن جانے کے بعد میری اب تک کی حیثیت ختم ہو جاتی ہے آئندہ کے کام کی پوری ذمہ داری جماعت کی طرف منتقل ہو جاتی ہے اور جماعت اپنی طرف سے اس ذمہ داری کو جس کے بھی سپرد کرنے کا فیصلہ کرے اس کی اطاعت اور خیر خواہی اور اس کے ساتھ تعاون کرنا ہر فردِ جماعت کی طرح میرا بھی فرض ہو گا۔ (روئداد اجتماع ص ۹-۱۰)

پھر جب جماعت نے مودودی صاحب ہی کو امارت کے لئے منتخب کیا اور جماعت کا امیر بنایا تو اس وقت آپ نے جو تقریر کی اس کا ابتدائی حصہ یہ تھا۔

"میں آپ کے درمیان نہ سب سے زیادہ علم رکھنے والا تھا، نہ سب سے زیادہ متقی، نہ کسی اور خصوصیت میں مجھے فضیلت حاصل تھی۔ بہرحال جب آپ نے مجھ پر اعتماد کر کے اس کارِ عظیم کا بار میرے اوپر رکھ دیا تو میں اب

اللہ سے دعا کرتا ہوں اور آپ لوگ بھی دعا کریں کہ مجھے
اس بار کو سنبھالنے کی قوت عطا فرمائے اور آپ
کے اس اعتماد کو مایوسی میں تبدیل نہ ہونے دے میں
اپنی حد وسع تک انتہائی کوشش کرونگا کہ اس کام
کو پوری خدا ترسی اور پورے احساس ذمہ داری کے
ساتھ چلاؤں۔ میں قصداً اپنے فرض کی انجام دہی میں
کوئی کوتاہی نہ کروں گا میں اپنے علم کی حد تک کتاب اللہ
وسنت رسول اللہ اور خلفاء راشدین کے نقش قدم
کی پیروی میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھوں گا۔ تاہم اگر مجھ
سے کوئی لغزش ہو اور آپ میں سے کوئی محسوس کرے
کہ میں راہ راست سے ہٹ گیا ہوں تو مجھ پر یہ بد
گمانی نہ کرے کہ میں عمداً ایسا کر رہا ہوں، بلکہ حسن ظن
سے کام لے اور نصیحت سے مجھے سیدھا کرنے کی
کوشش کرے۔ مجھے اس تحریک کی عظمت اور خود
اپنے نقائص کا پورا احساس ہے...... مجھے ایک
لمحہ کے لئے بھی اپنے بارے میں یہ غلط فہمی نہیں ہوئی کہ
میں اس عظیم الشان تحریک کی قیادت کا اہل ہوں،
بلکہ میں تو اس کو ایک بد قسمتی سمجھتا ہوں کہ اس وقت
اس کار عظیم کے لئے آپ کو مجھ سے بہتر کوئی آدمی نہیں
ملا۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ اپنے فرائض امارت
کی انجام دہی کے ساتھ میں برابر اس تلاش میں رہوں گا

کہ کوئی اہل تر آدمی اس کام کا بار اٹھانے کے لئے
مل جائے۔ اور جب میں ایسے کسی آدمی کو پاؤں گا
تو خود سب سے پہلے اس کے ہاتھ پر بیعت کروں گا
نیز میں ہمیشہ ہر اجتماع عام کے موقع پر جماعت سے
بھی درخواست کرتا رہوں گا کہ اگر اب اس نے کوئی
مجھ سے بہتر آدمی پالیا ہے تو وہ اُسے اپنا امیر منتخب کرلے
اور میں اس منصب سے بخوشی دست بردار ہو جاؤں گا
بہرحال میں انشاء اللہ اپنی ذات کو کبھی خدا کے راستہ
میں سدِّ راہ نہ بننے دوں گا" (روئداد اجتماع ص۱۹-۲۰ مختصراً)

اس انتخاب "امارت" کے متعلق یہ چیز ملحوظ رکھنے کی ہے کہ
یہ انتخاب "امیر المومنین" یا "امیر الہند" کا نہیں ہے۔ اور نہ ہم کو
یہ حق ہے کہ اپنی رائے سے کسی کو مسلمانان ہند کا امیر منتخب
کردیں اور وہ ان کے لئے واجب التسلیم اور واجب الاطاعت
ہو بلکہ "جماعت اسلامی" کی تاسیس کے اس اجتماع میں جو لوگ
شریک تھے انھوں نے ہدایات نبوی کے پیش نظر جن میں مسلمانوں
کی چھوٹی سے چھوٹی جماعت کے لئے بھی ایک امیر کا ہونا ضرور
تبلایا گیا ہے۔ صرف اس جماعت کے لئے "امیر" کا انتخاب کیا
ہے ـــــ "دستور" کی دفعہ متعلقہ امارت میں جو ابھی ابھی نقل ہو چکی
ہے اگرچہ اس کی صراحت اور وضاحت موجود ہے، لیکن پھر
بھی کچھ اللہ کے بندے ہیں جو صرف امارت کا لفظ سن کر شور
مچا رہے ہیں کہ لاہور میں جمع ہونے والے ان چند آدمیوں کو

کیا حق تھا کہ انھوں نے ملک کے تمام ارباب حل وعقد کو جمع کئے بغیر امیر کا انتخاب کرڈالا۔ کاش اس قسم کے حضرات "دستور" کو ایک نظر دیکھ ہی لیتے۔

جماعت میں میری شرکت اور اس پر میرے اطمینان کے اسباب۔

جماعت میں شرکت کا فیصلہ میں نے پہلی ہی دعوت پر کیوں کر لیا؟ اس کی وجہ آپ کو ان سطروں سے معلوم ہو گئی ہو گی جو شروع میں میں نے "تھوڑی سی اپنی سرگزشت" کے زیر عنوان لکھی ہیں کہ میں اس جماعت کی تاسیس سے بہت پہلے طویل تعطل سے تنگ آکر اپنے حق میں یہ فیصلہ کر چکا تھا، اور اس لئے لاہور کے اس "اجتماع" کے لئے میں جب گھر سے روانہ ہوا تھا تو جماعت میں شرکت ہی کے ارادے سے چلا تھا ——— لیکن اجتماع کے چند مشاہدات میرے لئے مزید ترغیب وطمانیت کا باعث ہوئے، اور انھوں نے رہے سہے تردد کو بھی طمانیت سے اور فکر کی بعض الجھنوں کو بصیرت سے بدل دیا اور اس طرح میں نے طمانیت وبصیرت کے ساتھ اپنے کو اس جماعت سے وابستہ کر دینا ہی اپنے حق میں بہتر بلکہ ضروری سمجھا۔ وہ چند مشاہدات یہ تھے:۔

(۱) جماعت میں شرکت کے لئے جو لوگ مختلف مقامات سے آئے تھے نہ صرف ان کی گفتار سے بلکہ عام طرز عمل سے بھی اخلاص للہ اور دینداری کا رجحان میں نے نمایاں پایا۔

(۲) یہ لوگ عموماً اس جماعت اور دوسری عام سیاسی جماعتوں اور اداروں کے فرق کو سمجھنے والے تھے۔

(۳) ان میں (میری توقع کے خلاف) "باضابطہ علماء" کی بھی خاصی تعداد تھی (غالباً دس بارہ حضرات ہوں گے) ان میں مختلف مسلکوں کے اور مختلف مکاتب خیال کے فیض یافتہ حضرات تھے مثلاً مجھ جیسے دیوبندی حنفی بھی، اور پھلواروی اور ندوی بھی، نیز سلفی المسلک اہل حدیث بھی۔ مگر بحمد اللہ سب ان مسالک کے جزوی اختلاف کے حدود کو صحیح طور پر سمجھنے والے اور وقت کے دینی تقاضوں کا احساس رکھنے والے تھے۔

(۴) انگریزی تعلیم یافتہ اور اعلیٰ تعلیم یافتہ حضرات بھی خاصی تعداد میں تھے۔ مگر میں نے ان میں اور کالجوں اور یونیورسٹیوں سے نکلنے والے آج کے عام تعلیم یافتوں میں خاص فرق محسوس کیا۔ ان میں دین کا جذبہ اور اکثر میں دین کی سمجھ اور اس کے مطابق عمل بھی تھا۔ معلوم ہوتا تھا کہ مولینا مودودی کی دعوت نے اس طبقہ کے صرف انہی دلوں کو اپیل کیا ہے جن میں اللہ اور اس کے دین کے لئے اچھی جگہ ہے۔ پھر جب ہر ایک کے تفصیلی حالات معلوم کرنے کا موقع ملا تو ان میں سے بہت سوں کے متعلق معلوم ہوا کہ وہ پہلے "آزاد" بلکہ "آوارہ مزاج" قسم کے نوجوان تھے، مودودی صاحب کے مضامین و مقالات نے ان میں دین کے احساس کو تازہ کیا اور اس طرح ان میں یہ خوش گوار تبدیلی پیدا ہوئی۔

(۵) علاوہ اور چیزوں کے ان "جدید تعلیم یافتہ" حضرات میں ایک خاص چیز میں نے یہ محسوس کی کہ وہ قریب قریب سب ہی اس کا احساس رکھتے تھے کہ "جماعتِ اسلامی" جس کام کو لے کر

اٹھ رہی ہے وہ خالص دین ہے اس لئے اس میں بڑی حصہ داری اور ذمہ دارانہ رائے زنی کے لیے علم دین کی ضرورت ہے۔ کسی اجتماعی کام کے متعلق یہ احساس و اعتراف آجکل کے انگریزی تعلیم یافتہ طبقہ میں بالکل مفقود ہوتا جارہا ہے۔ اور نتائج کے لحاظ سے یہ بڑی خطرناک چیز ہے اس لئے مجھے اس کی بڑی قدر ہوئی۔

(۶) سب سے زیادہ جس چیز سے میں متاثر ہوا وہ اس اجتماع کا یہ اصول اور طرزِ عمل تھا کہ ہر معاملہ میں کتاب و سنّت اور صحابۂ کرام کا طریق عمل ہمارے لئے حَکم ہوگا۔ اجتماع میں جو کچھ ہوا وہ اسی اصول کے ماتحت ہوا۔ کئی دفعہ ایسا ہوا کہ بعض امور میں رائیں مختلف ہوئیں مگر کتاب و سنّت یا تعامل صحابۂ کرام سے جب کسی ایک جانب کی ترجیح معلوم ہوگئی تو سب نے بلا چون و چرا اُسی کو تسلیم کر لیا حتیٰ کہ جماعت کے آئین کے بارے میں بھی صرف انہی اُصولِ دین کو چراغِ راہ بنایا گیا ——— میرا دل اس چیز سے اسلئے بہت زیادہ متاثر ہوا کہ مجھے مُسلمانوں کی ان بہت سی سیاسی یا نیم سیاسی و نیم مذہبی جماعتوں کی مجالس خاصہ و عامہ میں جو بیسیوں برس سے اپنے صوابدید کے مطابق مسلمانوں کی خدمت کر رہی ہیں بارہا حاضری بلکہ شرکت کا موقع ملا ہے۔ وہاں میں نے زیرِ غور مسائل میں اس پہلو سے غور ہوتا بہت کم دیکھا یا بالکل نہیں دیکھا! اور نظامِ کار تو وہاں کا بالکل ہی یورپین جماعتی اصولوں سے ماخوذ پایا۔ ایک دفعہ نہیں بلکہ بارہا کا میرا مشاہدہ ہے کہ ان مجالس میں جب کوئی آئینی بحث آپڑی تو اگر وہاں کوئی سینٹرل اسمبلی یا صوبہ جاتی

اسمبلی کے ممبر موجود ہوئے تو ان سے استصواب کیا گیا کہ اس بارہ میں آپ کے یہاں کا طریقہ کیا ہے۔ اور معلوم ہونے پر اسی کے مطابق عمل کیا گیا۔ اس سے میرا مقصد ان جماعتوں پر تنقید نہیں ہے۔ بلکہ میں صرف یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ بگڑے ہوئے اس زمانہ میں جب کہ دنیا نے ان امور میں کتاب و سنت اور اسوۂ نبوی و تعامل سلف کی اقتداء عملاً چھوڑ دی ہے، کسی جماعت کا اس بھولے ہوئے سبق کو پھر یاد کرنا عملاً اس کا التزام کرنا کم از کم میرے لئے بےحد طمانیت اور بہت زیادہ کشش کا باعث ہوا۔

ہم لوگوں کے قصور علم کے باعث یہ ممکن ہے کہ کسی معاملہ کے متعلق نقطۂ صواب تک پہنچنے سے قاصر رہے ہوں اور ہمارا فیصلہ نفس الامر میں صحیح نہ ہو لیکن یہ واقعہ ہے کہ ہم سب نے فی ما بیننا و بین اللہ اس کی پوری کوشش کی ہے کہ کتاب و سنت کی پیروی ہی میں ہمارا قدم اٹھے۔ واللہ الموفق!

بہرحال یہ تھیں وہ چند خاص چیزیں جو میرے لئے "جماعتِ اسلامی" میں شرکت کے بارہ میں مزید رغبت و طمانیت کا باعث ہوئیں اور اب بحمد اللہ پوری طمانیت و بصیرت کے ساتھ میرا یہی فیصلہ ہے۔

مصلحت دید من آنست کہ یاراں ہمہ کار
بگذارند و سرِ طرۂ یارے گیرند

واقعات کی اس مختصر سی روداد کو پیش نظر رکھ کر "جماعت" کی

وہ "دستور" ملاحظہ کیجئے جو اس کے بنیادی عقیدے، نصب العین اور نظامِ جماعت پر مشتمل ہے اور اپنی دینی ذمہ داریوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے اپنے حق میں خود فیصلہ کیجئے کہ اعلاء کلمۃ الحق اور قانونِ خداوندی کی سربلندی کے لئے اس جماعت کی شرکت و رفاقت اور اس کے ساتھ تعاون خدمتِ دین کی ایک اعلیٰ صورت ہے یا نہیں؟ اور اس سے اللہ تعالیٰ کی خوشنودی اور آخرت کی بہبودی کی توقع کی جا سکتی ہے یا نہیں؟ نیز یہ بھی آپ سوچیں کہ اگر کوئی جماعت اعلاءِ کلمۃ اللہ کے لئے آج اٹھنا چاہے تو کیا اس کے لئے اس کے سوا کوئی اور نظام یا کوئی اور طریق کار ہو سکتا ہے؟ —— پھر خواہ آپ کا فیصلہ اپنے حق میں کچھ ہو اگر آپ کو علمِ دین کی نعمت اللہ نے دی ہے تو خدا کا واسطہ دے کر ہم آپ سے عرض کرتے ہیں کہ اس "دستور" میں بلکہ جماعت کی تشکیل کے پورے سلسلے میں کتاب و سنت اور اُسوۂ نبوی کے نقطۂ نظر سے اگر ہم سے کوئی غلطی آپ کے نزدیک ہو رہی ہے تو للہ ہم کو اُس پر ضرور متنبہ فرمائیے تاکہ غور کر کے ہم اس کی اصلاح کر سکیں۔ فَوْقَ كُلِّ ذِي عِلْمٍ عَلِيمٌ پر ہمارا ایمان ہے۔ ہم ناقص العلم بشر ہیں اور ہم سے غلطی ہو سکتی ہے لیکن براہ کرم کتاب و سنت اور اپنے ذاتی فہم و فکر یا تجربہ کو گڈمڈ نہ کیجئے۔ اگرچہ آپ کے فہم و فکر اور تجربات سے استفادہ سے بھی ہم کو استنکاف نہ ہوگا۔

بعض شکوک و شبہات اور اُن کے جوابات

خدا کا شکر ہے ہم اپنے کو تنقید سے بالاتر نہیں سمجھتے اور یقین

رکھتے ہیں کہ دوسروں کی طرح ہم سے بھی غلطیاں ہو سکتی ہیں اسلئے نیک نیتی کے ساتھ جو تنقید ہماری رائے اور ہمارے کام پر کی جائے اور جو کوشش ہماری اصلاح کے لئے کسی طرف سے عمل میں آئے ہم پوری خوش دلی کے ساتھ اس پر غور کرنے کے لئے اپنے کو تیار پاتے ہیں۔ ان چند ہی دنوں میں بعض حضرات کی مخلصانہ تنقیدوں اور مصلحانہ مشوروں سے جہاں ہم نے فائدہ اٹھایا وہیں کچھ سوالات اور شکوک و شبہات اس قسم کے بھی سامنے آئے جو اگرچہ محض کسی غلط فہمی یا کم غوری کا نتیجہ ہیں۔ لیکن بہت سے دلوں میں پیدا ہو سکتے ہیں۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ کم از کم ان سوالات اور شبہات کے جوابات بھی یہاں عرض کر دیئے جائیں تاکہ ناظرین میں سے کسی صاحب کے دل میں اگر ان میں سے کوئی خلجان پیدا ہو تو ان کو جواب حاصل کرنے کی زحمت نہ اٹھانا پڑے۔

(۱) کسی نئی جماعت کی تشکیل، اور کسی جدید تحریک کے آغاز کا ذکر سنتے ہی بعض حضرات کے دل میں سب سے پہلا خیال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جماعتوں، انجمنوں اور تحریکوں کی مسلمانوں میں پہلے ہی سے کیا کمی ہے جو ایک جدید جماعت کی تشکیل کی ضرورت محسوس کی گئی اور ایک نئی تحریک کے کھڑا کرنے کا قصد کیا گیا۔

یہ سوال بہت سے دلوں میں پیدا ہوتا ہے اور پیدا ہو سکتا ہے لیکن ایسے حضرات اگر صرف اعتراض کا فرض ادا کر دینا ہی نہیں بلکہ سنجیدگی سے معاملہ کو سمجھنا چاہتے ہیں تو ان کو غور کرنا چاہیئے کہ اگر دین کا مطالبہ اور وقت کا تقاضا کسی خاص نہج پر کام کرنے کا

ہو اور پہلے سے موجود رہنے والی جماعتیں اور انجمنیں (خواہ اپنی غفلت کی وجہ سے اور خواہ اس لئے کہ وہ اس کو دینی مطالبہ اور وقتی تقاضا ہی نہ سمجھتی ہوں) اس طرف توجہ نہ کریں اور بار بار توجہ دلانے پر بھی اس فرض کو ادا کرنے کے لئے آمادہ نہ ہوں تو جو لوگ دیانت داری سے اس کو دین کا مطالبہ اور اسلام کا وقتی فریضہ سمجھتے ہیں، ان لوگوں کے لئے اس کے سوا کیا چارہ کار رہ جاتا ہے کہ وہ خود ہی پھر اس کے لئے کمر ہمت باندھیں، اور اگر وہ کام کسی جماعت کے بغیر انجام نہیں پا سکتا تو پھر خود ہی اسکے لئے "جماعت" بھی بنائیں ـــــ اگر اس سوال کے کرنے والے حضرات کو معلوم نہیں ہے تو معلوم ہونا چاہئے کہ پہلے برسوں تک ہندوستان کی تمام موجودہ ہوتی اسلامی جماعتوں کو مخاطب کر کے یہ عرض کیا گیا کہ وہ اس چیز کو اپنا نصب العین بنائیں اور اس طریق پر کام کریں۔ لیکن جب پکارنے والے کو مسلسل لم یزدھم دعائی الا فراراً ہی کا تجربہ ہوتا رہا اور کسی ایک جماعت نے بھی اس راہ پہ آنا پسند نہ کیا تو اس کے سوا کیا کیا جا سکتا تھا کہ جو لوگ اس نصب العین اور اس طریق کار کو صحیح سمجھتے تھے وہ خود ہی ایک جماعت بن کر اٹھنے کا فیصلہ کر لیں؟ بلکہ یہ فیصلہ کر لینے کے بعد بھی جماعت کی تشکیل سے چار ماہ پہلے "ترجمان القرآن" ہی کے ذریعہ ایک آخری اعلان کیا گیا کہ "دین کا مطالبہ اور وقت کا تقاضا یہ کام اس طرح کرنے کے لئے ہے اور ہمارے سامنے اس کے لئے یہ خاکہ ہے۔ اگر مسلمانوں کی موجودہ کارکن جماعتوں میں سے

کوئی اس کو اختیار کر لے تو پھر ہماری خدمات اس کے ساتھ ہیں ورنہ اس کے نئی جماعت کی تشکیل ناگزیر ہو گی اور مجبوراً ہم کو کرنی پڑے گی "— پھر جب پہلی پکاروں کی طرح یہ آخری اعلان بھی "صدا بصحرا" ہی ثابت ہوا تو ہم کو اسی فیصلہ پر عمل کرنا پڑا ورنہ کسی سرپھرے کو اس کی کیا ضرورت ہوتی کہ وہ اتنی بڑی ذمہ داری اپنے سر لے اور غیروں کی طرف سے آنے والے خطرات کے علاوہ اپنوں کے "طنز آمیز تیر" کا نشانہ بھی بنے

(۲) بعض حضرات نے جماعت کا "دستور" وغیرہ دیکھ کر فرمایا — اس میں تو کوئی بھی نئی بات نہیں، اس قسم کی ایک جماعت قریب ہی زمانہ میں فلاں مولٰنا صاحب نے بھی بنانی چاہی تھی، یہ بس اسی کا "تازہ ایڈیشن" ہے۔

گویا ان بندگانِ خدا کے نزدیک کسی کام کے غلط اور فضول ہونے کی یہ بھی ایک دلیل ہے کہ "یہ کام پہلے بھی کیا جا چکا ہے"—

خدا کے بندو! کوئی صحیح اور ضروری کام اگر ہزار بار بھی کیا جا چکا ہے تو صرف اس وجہ سے آج وہ کیوں غلط اور فضول ہو سکتا ہے کہ وہ پہلے بھی ہو چکا ہے۔ ہمارا تو کہنا یہی ہے کہ ہم کوئی بالکل نیا اور اچھوتا کام لیکر کھڑے نہیں ہو رہے ہیں بلکہ دنیا کی طویل عمر میں یہ کام ہزاروں بار ہو چکا ہے۔

ہمارے پیشِ نظر اللہ کے دین اور اس کے پیغمبروں کے لائے ہوئے پیغام کی خدمت اور اس کی سربلندی ہی تو ہے۔ یہ کام اپنے اپنے وقت میں ہر پیغمبر اور ان کی متبع جماعت نے کیا ہے اور دورِ

نبوت کے اختتام کے بعد بھی اللہ کے ہزاروں صالح بندوں نے مختلف زمانوں میں اس کے لئے اپنے حسبِ مقدور کوششیں کی ہیں۔ ہم ضعفاء وعصاۃ بھی اسی کو اپنا مقصدِ حیات بنانا اور دوسروں کو اسی کی طرف دعوت دینا چاہتے ہیں۔ ہم صاف کہتے ہیں کہ ہمارے سامنے کوئی نیا اور اچھوتا کام نہیں ہے بلکہ "پرانی لکیر کی فقیری" ہی ہمارا مسلک ہے۔ ہم اس امت کی فلاح "نئے نظریوں" اور "نئے نظاموں" میں نہیں سمجھتے بلکہ ہمارا ایمان ہے کہ ہماری نجات وفلاح صرف اسی قدیم نظریے اور اسی پرانے نظام میں ہے جو اللہ کی کتاب اور اسوۂ نبوی نے ہمارے لئے متعین کیا ہے۔ ——

ولن یصلح اٰخر ھٰذہ الامۃ الا بما صلح بہ اولھا۔

(۳) "جماعتِ اسلامی" کا دستور دیکھ کر اور ہماری باتوں کو سن کر بعض حضرات نے ناصحانہ انداز میں فرمایا ہے کہ دیوانے ہو گئے ہو؟ یہ کیا آوازیں منہ سے نکالتے ہو اور کیسے دوراز کار منصوبوں میں وقت ضائع کر رہے ہو؟ جانتے ہو کہ خود تمہارے اوپر وہ طاقت مسلط ہے جس کے ایک ادنیٰ اشارے پر دولتِ مستقلہ ایران کے خود مختار بادشاہ کو اپنے تاج وتخت سے دست بردار ہو کر بہ یک بینی و دو گوش ایران ہی سے نکل جانا پڑا۔

درحقیقت یہ خیال ایسا ہے جو بہت سے سوچنے سمجھنے والے دلوں میں پیدا ہو سکتا ہے لیکن "سوچنے سمجھنے والے" یہ حضرات ذرا اور سوچ سمجھ کر بتلائیں کہ اُن کی اس منطق کا نتیجہ کیا نکلتا ہے؟ یہی نا کہ جب تک کفر طاقتور رہے اور باطل کو تسلط واقتدار حاصل رہے

اس وقت تک اعلاء کلمۃ الحق اور تغلیب دین الہٰی کا تصور، اور اس کے لئے ابتدائی تیاری بھی نہ کی جائے۔ ہاں جب کبھی کفر خود بخود سرنگوں ہو جائے، باطل بے جان ہو کر خود گرنے لگے اور طاقت و اقتدار اللہ کے صالح بندوں کے ہاتھوں میں آجائے تو اُس وقت یہ عباد صالحین اعلاء کلمۃ اللہ اور "اظہار دین حق" کے لئے اٹھیں، اگر ان ناصح بزرگوں کا مطلب یہی ہے تو براہ کرم وہ اپنی رائے پر نظر ثانی فرمائیں اور سوچیں کہ دینی عقلی یا تجربی کسی حیثیت سے بھی ان کی یہ رائے درست ہے؟ اور کیا کوئی قوم، اور کوئی پارٹی اس اصول پر کسی وقت بھی اٹھ کے کچھ کرنے کا ارادہ کر سکتی ہے؟ نیز غور فرمایا جائے کہ اگر قرون اولیٰ کے مسلمان بھی اس منطق کے قائل ہوتے تو کیا اسلام کا پیغام مکہ اور مدینے سے آگے بڑھ سکتا تھا؟ کیا ان کو ان الناس قد جمعوا لکم فاخشوھم سنا سنا کے ڈرا وے نہیں دیئے گئے تھے؟ اور کیا اس سے بھی پہلے ایسے ہی کچھ کہنے والوں نے موسیٰ علیہ السلام سے ان فیھا قوما جبارین وانا لن ندخلھا حتیٰ یخرجوا منھا فانا داخلون نہیں کہا تھا؟ پھر خدا کی وحی نے اس بارہ میں جو فیصلہ کیا آج کے حالات میں کیا ہم اس سے کوئی روشنی اور ہدایت حاصل نہیں کر سکتے؟

اور اگر ان بزرگوں کی نصیحت کے سمجھنے اور اس کا منطقی نتیجہ نکالنے میں ہم سے غلطی ہو رہی ہے تو براہِ کرم ہماری اس غلطی کی وہ خود ہی تصحیح کر کے ممنون فرمائیں۔ اور اگر ان بزرگوں کا یہ خیال ہے کہ

ہم لوگ اپنی ناتجربہ کاری اور ناعاقبت اندیشی کی بناء پر کسی "خطرناک اقدام" کے لیئے پر تول رہے ہیں اور بس ابھی کود جانا چاہتے ہیں تو یہ محض خوش فہمی ہی کہی جا سکتی ہے ـــــ ہر کام کی طرح ہوتا ہے۔ ہر قدم صحیح وقت آجانے اور اس کے ضروری اسباب ووسائل مہیا ہو جانے ہی پر اٹھایا جا سکتا ہے ـــــ لیکن یہ اسباب ووسائل اور علیٰ ہذا ان اسباب کے ابتدائی اسباب بھی تو آپ سے آپ مہیا نہیں ہو جائیں گے۔ فتکفروا ولا تکونوا من المستعجلین۔

(۴) بعض حضرات نے "جماعت اسلامی" کی دعوت سن کر فرمایا کہ اب سے کوئی سوا سو برس پہلے حضرت سید احمد شہیدؒ اور شاہ اسمٰعیل شہیدؒ اس تحریک کو لے کر کھڑے ہوئے تھے۔ ان کے اخلاص اور تقدس اور تقوے کا جو حال تھا وہ واقفین تاریخ کو معلوم ہے۔ انکے ساتھ مجاہدین کی اچھی خاصی تعداد بھی تھی، سامان جنگ بھی خاصا تھا، اور سب سے بڑھ کر یہ کہ سینکڑوں نہیں بلکہ ہزاروں ایسے صلحاء و اتقیاء ان کے رفقا میں تھے جن کی آج ڈھونڈھنے سے بھی دو چار نظیریں نہیں مل سکتیں بلکہ اخلاص و دینداری کے لحاظ سے پورے قافلے کا یہ حال تھا کہ گویا صحابہ کرام کا عہد پھر عود کر آیا ہے ـــــ پھر جس باطل طاقت سے ان کا مقابلہ تھا آج کل کی منظم طاغوتی طاقتوں سے اُسے کوئی نسبت نہیں دی جا سکتی ـــــ تو اب جب کہ نہ وہ باخدا ہستیاں ہیں، نہ وہ ساز و سامان ہے، اور اس کے برعکس مخالف طاقتیں اس وقت کے

اعتبار سے بدرجہا طاقتور ہیں کیونکہ اس قسم کی کسی تحریک کے کامیاب ہونے کی توقع کی جا سکتی ہے۔

"تجربہ کاری" کے مدعی بعض حضرات نے حضرت سید صاحب کی تحریک کے علاوہ اسی کے ضمیمہ تحریک صادق پور (پٹنہ) اور حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کی ماضی قریب کی تحریک کی ناکامی کا حوالہ دے کر بھی ہم کو یہی درس دیا ہے کہ اب زمانہ اس کام کے لئے سازگار نہیں رہا، اور اب اس راہ پر چلنا اپنی کوششوں اور اپنے وقت کو صرف ضائع کرنا ہے۔

درحقیقت "جماعت اسلامی" کے متعلق اب تک جو سوالات یا اعتراضات سننے میں آئے ہیں ان میں سب سے زیادہ مایوس کن اور خطرناک یہی مغالطہ ہے اس لئے اس کا جواب کسی قدر تفصیل سے عرض کرنے کی ضرورت ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ جن چند تحریکوں کا اوپر حوالہ دیا گیا ہے ان کا انجام بظاہر ناکامی ہی پر ہوا ہے۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ کسی تحریک کی علمبردار جماعت کے شکست کھا جانے کے بعد اس کے بقایا (پس ماندگان) دو قسم کا اثر لیا کرتے ہیں، یا یوں کہنا چاہیئے کہ دو حصوں میں بٹ جاتے ہیں۔ کچھ لوگ وہ ہوتے ہیں جو فاتح طاقت کی غیر معمولی طاقتوری سے مرعوب ہو کر تحریک ہی سے دست بردار ہو جاتے ہیں اور "رضا بالقضا" یا "مجبوری" کو تقاعد (ہاتھ پہ ہاتھ دھرے بیٹھے رہنے) کی پالیسی کا بہانہ بنا لیتے ہیں اور دوسرا گروہ وہ ہوتا ہے جو شکست کے بعد بھی تحریک سے

دست برداری و تقاعد پر راضی نہیں ہوتا، بلکہ وہ اپنی شکست کے اسباب کا کھوج لگاتا ہے، تحریک کی پوری سرگزشت اور پارٹی کی جدوجہد کے تمام واقعات پر عمیق نظر ڈالتا ہے اور اس غور و فکر کے بعد وہ جن کمزوریوں، جن غلطیوں اور جن غفلتوں کو شکست کا باعث سمجھتا ہے اُن کو خاص طور سے پیش نظر رکھ کر اور ماضی کے تمام تلخ و شیریں تجربات سے فائدہ اٹھا کر پھر سے جدوجہد کے لئے تیاری کرتا ہے۔ وہ پچھلی شکستوں سے یاس و ہراس کا سبق نہیں لیتا بلکہ ان کو قدرت کا تازیانہ سمجھ کر پہلے سے زیادہ آمادۂ عمل ہو جاتا ہے۔ یہ وہ گروہ ہوتا ہے جو اپنے جماعتی مقاصد ہی کے لئے جینے اور مرنے کا فیصلہ کئے ہوئے ہوتا ہے۔

پہلے گروہ کے فیصلہ اور پالیسی کا انجام ہمیشہ جمود و تقاعد اور دائمی ذلت و محکومیت پر قناعت و صبر ہوتا ہے ——— اور دوسرے گروہ کے فیصلہ کا نتیجہ مسلسل جدوجہد اور آخر کار ایک دن حصولِ مقصد اور وصول بہ منزل کی صورت میں نکلتا ہے ——— ان دونوں پالیسیوں کے یہ دو نتیجے اتنے ظاہر اور غیر مشتبہ ہیں کہ دنیا کی انقلابی تحریکوں سے معمولی سی واقفیت رکھنے والا بھی کوئی شخص اور غالباً اوسط درجہ کی عقل رکھنے والا کوئی انسان بھی اس میں شک نہیں کر سکتا۔

پھر اس سے بھی غالباً کسی کو انکار نہ ہو سکے گا کہ مقصد سے صحیح عشق رکھنے والوں کے لئے دوسرے ہی گروہ کا طریق کار لائق تقلید ہے اور اگر فتح و ظفر کی توقع کبھی کی جا سکتی ہے تو اسی سے کی جا سکتی ہے۔

قرآن پاک نے بھی اپنی پارٹی (حزب اللہ) کے لئے شکست

کھا جانے کی صورت میں اسی طرف رہنمائی کی ہے، غزوۂ اُحد میں جب بعض خاص وجوہ سے ایمان والی جماعت کو شکست ہوئی تو ان کو ہدایت فرمائی گئی:-

وَلَا تَهِنُوا وَلَا تَحْزَنُوا وَأَنتُمُ الْأَعْلَوْنَ إِن كُنتُم مُّؤْمِنِينَ ط

اور (اس شکست کی وجہ سے) ہمت ہار کے بیٹھ نہ جاؤ اور غم نہ کھاؤ۔ تم ہی غالب رہو گے بشرطیکہ تمھارا ایمان پختہ اور سچا ہو۔

إِن يَمْسَسْكُمْ قَرْحٌ فَقَدْ مَسَّ الْقَوْمَ قَرْحٌ مِّثْلُهُ ۚ وَتِلْكَ الْأَيَّامُ نُدَاوِلُهَا بَيْنَ النَّاسِ ط (آل عمران ع)

اگر اس جنگ میں تم پر چوٹ پڑی ہے تو اس سے پہلے ایسی ہی چوٹ دشمن کو بھی تمھارے ہاتھ سے (بدر میں) لگ چکی ہے اور فتح و شکست کے یہ دن تو ہم قوموں میں ادلتے بدلتے رہتے ہی ہیں۔

پھر اسی سلسلہ میں چند آیتوں کے بعد ان شکست خوردہ مجاہدین اُحد کو سبق دینے ہی کے لئے پچھلے زمانہ کے بعض ان پیغمبروں اور ان کے ساتھ جہاد کرنے والے مومنوں کا ذکر کیا گیا جن کو طاغوتی طاقتوں سے جنگوں میں بڑی بڑی مصیبتیں اور تکلیفیں بھی اٹھانی پڑیں لیکن پھر بھی وہ ہمت ہار کے نہ بیٹھے بلکہ اپنی جد و جہد میں برابر لگے رہے۔ چنانچہ فرمایا گیا۔

وَكَأَيِّنْ مِنْ نَبِيٍّ قَاتَلَ مَعَهُ رِبِّيُّونَ كَثِيرٌ فَمَا وَهَنُوا لِمَا أَصَابَهُمْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَمَا ضَعُفُوا وَمَا اسْتَكَانُوا وَاللَّهُ يُحِبُّ الصَّابِرِينَ ۝ وَمَا كَانَ قَوْلَهُمْ إِلَّا أَنْ قَالُوا رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا ذُنُوبَنَا وَإِسْرَافَنَا فِي أَمْرِنَا وَثَبِّتْ أَقْدَامَنَا وَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكَافِرِينَ ۝ (آل عمران ۱۵ ع)

اور پہلے کتنے ہی ایسے نبی ہوئے ہیں جن کے ساتھ ہو کر بہت سے اللہ والوں نے جنگیں کی ہیں، پھر اللہ کے راستے میں ان پر جو مصیبتیں پڑیں اور جو سخت آفتیں آئیں ان کی وجہ سے انھوں نے ہمت نہیں ہار دی اور نہ سُست ہوئے اور نہ "عاجز و لاچار" ہو کر بیٹھے (بلکہ ثابت قدمی کے ساتھ اپنی جد و جہد میں لگے رہے) اور اللہ ایسے صبر و ثبات والوں کو بہت چاہتا ہے —— اور (حد یہ ہے کہ دشمن کے مقابلے میں پیش آنے والی مصیبتوں کی ان گھڑیوں میں بھی) ان اللہ والوں کی زبان سے اسکے سوا کچھ نہ نکلا کہ انھوں نے عرض کیا اے ہمارے رب ہمارے گناہوں ہماری زیادتیوں کو بخش دے ہم کو اس جد و جہد میں ثابت قدم رکھ! اور کافروں پر ہم کو غالب کر دے!!

قرآنِ پاک کی ان ہدایات اور اس حکمتِ عملی سے صاف ظاہر ہے کہ وہ اس کے سخت خلاف ہے کہ اللہ کی راہ میں کام

کرنے والے اور اعلاء کلمۃ الحق کے لئے جدوجہد کرنے والے کسی معرکہ کی شکست کو سند بنا کر ہمت ہار کے بیٹھ جائیں اور ہمیشہ کے لئے اپنے آپ کو مایوس کر لیں ـــــ بلکہ اس بارہ میں اس کی ہدایت یہ ہے کہ خدا کے سپاہی اس قسم کی شکستوں کو اپنے لئے قدرتی تازیانہ سمجھیں اور ان مجاہدین فی سبیل اللہ کے نقشِ قدم پر چلیں جو شکست پہ شکست کھانے اور مصیبتوں پہ مصیبتیں اٹھانے کے باوجود اپنی جدوجہد جاری رکھتے ہیں۔

حضرت سید احمد شہید رحمۃ اللہ علیہ وغیرہ کی تحریکوں کا انجام یاد دلا کر ہم کو نصیحت کرنے والے یہ بزرگ للہ غور فرمائیں کہ کیا یہ آیتیں قرآن میں صرف تلاوت کے لئے ہی نازل ہوئی ہیں یا ان میں ہمارے لئے کوئی سبق اور ہدایت بھی ہے؟ نیز ذرا اس پر غور فرمایا جائے کہ اگر آپ کا یہ طریقہ فکر صحیح ہے تو کیا اس کا نتیجہ اس کے سوا کچھ اور ہو سکتا ہے کہ "اعلاء کلمۃ الحق کے لئے عملی جدوجہد" کے دفتر کو قیامت تک کے لئے لپیٹ کر رکھ دیا جائے کیوں کہ آپ کی منطق کی رو سے تو جب تک حضرت سید احمد شہید اور شاہ اسمٰعیل شہید سے بھی اچھے اور بزرگ تر رہنما نہیں ملتے اور ان کے جیسے صالح اور مخلص و متقی رفقا پیدا نہیں ہوتے، کوئی قدم اس مقصد کے لئے اٹھایا ہی نہیں جا سکتا ـــــ اور لہٰذا ہر اب ایسے لوگوں کی توقع نہیں۔ تو حاصل یہی ہوا نا کہ اب اس مسئلہ کو داخل دفتر ہی کر دیا جائے ـــــ کیا فی الحقیقت آپ حضرات کا یہی فیصلہ ہے؟

نیز ذرا یہ بھی سوچا جائے کہ کیا حق و باطل کی آویزش کی ساری تاریخ میں حق کے حامیوں اور علمبرداروں نے ہمیشہ شکست ہی شکست کھائی ہے۔ یا کبھی اس کے خلاف بھی ہوا ہے؟ پھر آخر اپنے حق میں فیصلہ کرنے کے لئے صرف شکستوں ہی کو کیوں سامنے رکھا جاتا ہے اور کیوں صرف اسی ماضی تاریخ کو دہرایا جاتا ہے؟ تاریخ کے دوسرے روشن حصے سے کیوں سبق نہیں لیا جاتا؟ حالانکہ قرآن پاک نے ایسے موقع پر اسی دوسرے روشن حصے کی طرف خاص توجہ دلائی ہے (وَكَمْ مِنْ فِئَةٍ قَلِيلَةٍ غَلَبَتْ فِئَةً كَثِيرَةً بِإِذْنِ اللهِ)

اور قطع نظر اس ساری بحث سے انجام کے متعلق آپ کا خطرہ اور آپ کا یہ سوچ بچار اگر خدانخواستہ صحیح بھی ثابت ہو تو بس زیادہ سے زیادہ یہی تو ہوگا کہ آج کی تحریک کا بھی وہی انجام ہو رہے گا جو آب سے ایک صدی پہلے سید صاحبؒ کی تحریک کا ہوا۔ تو کیا ایک مومن کے لئے یہ انجام کچھ کم قیمتی ہے؟ (هَلْ تَرَبَّصُونَ بِنَا إِلَّا إِحْدَى الْحُسْنَيَيْنِ)

اور اگرچہ بظاہر وہ تحریک ناکامیابی پر ختم ہوئی اور اس کے علمبردار آخر بالاکوٹ میں شہید ہی ہو گئے لیکن کیا کوئی واقف کار اس سے انکار کر سکتا ہے کہ اس تحریک سے مسلمانانِ ہند کو کتنا عظیم دینی نفع پہنچا؟ اور کیا عجب کہ اسی مقدس خون کی برکت ہو کہ وہ سلوک آج تک اس کفرستان ہند میں یاد کیا جا رہا ہے۔

بعض حضرات ایسے بھی ہیں جو حضرت سید صاحبؒ کی تحریک

اور حضرت شیخ الہندؒ کی اسکیم کی بظاہر ناکامی کو "تقاعد" کی پالیسی کی سند اور دلیل تو نہیں بناتے البتہ وہ اس پوری تاریخ سے یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ اب اعلاء کلمۃ الحق کے لئے جدوجہد کے امکانات ختم ہو گئے ہیں۔ اب بس یہی صورت ممکن ہے کہ ملک میں جو فلاں فلاں تحریکیں چل رہی ہیں بس انہی سے اپنی کوششوں کو وابستہ کر دیا جائے اور اس کے بعد پھر انشاء اللہ یوں یوں ہو جائیگا۔

چونکہ اس خوش فہمی کے متعلق اب سے سال دو سال پہلے الفرقان میں بہت تفصیل سے لکھا جاتا رہا ہے نیز یہ مغالطہ بہت طویل بحث کا محتاج ہے۔ اس لئے یہاں اس بارہ میں کچھ نہیں عرض کیا جا رہا ہے۔ جو حضرات اس مغالطہ میں مبتلا ہوں ان سے گزارش ہے کہ وہ مولینا سید ابوالاعلیٰ مودودی کی کتاب "سیاسی کشمکش" کا کم از کم "تیسرا حصہ" ضرور ملاحظہ فرمائیں، بلکہ "جماعت اسلامی" کے متعلق کچھ سوچنے والے تمام حضرات کے لئے ضروری ہے کہ وہ پہلے اس کا مطالعہ ضرور فرمالیں وہ اس جماعت اور تحریک کے بنیادی لٹریچر کا اہم ترین حصہ ہے۔

(۵) بعض لوگوں کو "دستور" میں "تجدید ایمان" اور "ادائے شہادتین" کا لفظ دیکھ کر یہ شبہ ہوا ہے کہ مَعَاذَ اللّٰہ ہم اُن تمام مسلمانوں کو جو اِس جماعت سے باہر ہیں مومن اور مسلمان ہی نہیں سمجھتے ہیں۔

خُدا کی پناہ! بدگمانی بھی انسان کو بعض اوقات کہاں سے کہاں لے جاتی ہے ——— اِس "تجدید ایمان" اور "ادائے شہادتین"

کا مقصد تو صرف یہ ہے کہ "ایمان لانے" اور صدق دل سے سوچ سمجھ کر توحید و رسالت کی شہادت ادا کرنے سے جو ذمہ داریاں ایک مومن پر عائد ہوتی ہیں، جن کا ذکر "دستور" میں کر دیا گیا ہے ان کا احساس پھر تازہ ہو جائے اور ان کو اچھی طرح ذہن نشین کر کے آدمی اس جماعت میں داخل ہو جس کے داخلہ کی شرط بس ان ذمہ داریوں کی ادائیگی کا عہد و پیمان ہی ہے۔

نیز اس کا ایک خاص فائدہ یہ بھی ہے کہ خدا اور رسول پر واقعی ایمان رکھنے والے مومنین صادقین اور دین کے بنیادی اصولوں تک سے ناآشنا (بلکہ ان کے منکرین تک) جس طرح "مسلمان قوم" میں آج گڈمڈ ہو رہے ہیں اور "مسلمان سوسائیٹی" کے مساوی درجہ کے ممبر سمجھے جاتے ہیں، یہ جماعت اس طرح کے خلط ملط سے محفوظ رہے جو آئے خدا اور رسول پر ایمان رکھنے والا، ایمان لانے والا ہی آئے بہر حال "تجدید ایمان" اور "سمجھ بوجھ کر ادائے شہادتین" سے ہماری غرض صرف یہی ہے۔ نہ یہ کہ ہم دوسرے سارے مسلمانوں کو "غیر مومن" سمجھتے ہیں۔ مَعَاذَ اللہِ ان نکون من الغالین۔

خود ہماری نگاہوں میں بہت سے ایسے ایمان و صلاح والے ہیں جن کا ایمان اور جن کا وَرَع و تقویٰ خود ہمارے لئے لائق تقلید نمونہ ہو سکتا ہے۔ اور ہم خدا سے دعا کرتے ہیں کہ ہم کو اُن کے اُن محاسن اعمال میں اُن کے نقشِ قدم پر چلنے کی توفیق دے۔

(۶) کچھ شکوک و شبہات اور اعتراضات وہ ہیں جن کا تعلق مولینا مودودی کی ذات سے ہے۔

ان میں کچھ اعتراضات تو وہ ہیں جو محض افتراء و بہتان کے قبیل سے ہیں۔ اس قسم کے اعتراضات کے متعلق ہم کو کچھ بھی عرض کرنا نہیں ہے بجز اس کے کہ اللہ پاک ان لوگوں کو جھوٹ اور افتراء سے بچنے کی توفیق دے اور مسلمانوں کو اتنی سمجھ اور دیانت دے کہ وہ بلا تحقیق کسی کے متعلق اس قسم کی بدگمانیوں کو اپنے دلوں میں جگہ دینے کے لئے تیار نہ ہوں۔

ان کے علاوہ کچھ اور شبہات و اعتراضات بھی ہیں جن کے لئے فی الواقع کوئی منشا اور مظنہ ہو سکتا ہے اور صرف انہی کے متعلق یہاں کچھ عرض کرنا ہے۔

مثلاً بعض حضرات کو ان کے فقہی مسلک پر اعتراض ہے۔ اور یہ عجیب بات ہے کہ اس بارہ میں بالکل متضاد قسم کے اعتراضات خود میرے علم میں آئے ہیں۔ مثلاً بعض انتہا پسند قسم کے غیر مقلد حضرات کو ان پر اعتراض ہے کہ وہ تقلید اور آراء فقہا سے پورے آزاد نہیں ہیں اور اس کے برعکس بعض سخت قسم کے مقلد حضرات سے میں نے خود سنا کہ اُن میں غیر مقلدی کا رنگ ہے ــــ اور اس تضاد رائے میں تعجب کی کوئی بات نہیں ہے۔ اصل واقعہ یہ ہے کہ اصولی درجہ میں ان کا مسلک اور طریق عمل اس بارہ میں وہ ہے جو حنابلہ میں حافظ ابن تیمیہ اور حافظ ابن قیمؒ کا اور حنفیہ میں حضرت شاہ ولی اللہ (قدس سرہم) کا تھا اور ان حضرات کے متعلق بھی یہی کھینچا تان آج تک باقی ہے۔

بعض دوسرے حضرات کو ان کے اس رویہ پر اعتراض ہے کہ

وہ دین کے قدیم حقایق کو ان جدید اصطلاحات سے تعبیر کرتے ہیں جن کے موضوع لہ کچھ اور ہیں، اور جو خالص مادی فلسفہ کی پیداوار ہیں اس سے ان کو یہ خطرہ ہے کہ جدید تعلیم یافتہ طبقہ یا کم از کم اس کا تجدد پسند حصہ دینی حقائق کو انھیں اصطلاحات کی خراد پر چڑھانے لگے گا اور مولانا مودودی کا یہ طریق عمل ان کے لئے تائیدی سند بن جائے گا۔

بعض اور حضرات کو ان کی "غیر مولویانہ" وضع پر بھی اعتراض ہے۔

اس قسم کی تمام چیزوں کے متعلق صرف یہ عرض کرنا ہے کہ اگر اللہ نے آپ کو دین کا صحیح علم دیا ہے تو برائے خدا سوچیئے کہ کیا ان میں سے کوئی چیز بھی اتنی اہم اور اتنی سنگین ہے کہ اس کی وجہ سے نفس جماعت کی مخالفت کرنا آپ کے لئے ضروری یا درست ہو؟ کیا آپ جیسا "پکا غیر مقلد" یا "پکا مقلد" ہونا بھی شرائطِ ایمان اور ضروریات اسلام سے ہے؟ —— یقیناً ایسا نہیں ہے! —— علیٰ ہذا آپ کو ان کی جن تعبیرات اور جس طرز کلام پر اعتراض ہے اس کو آپ زیادہ سے زیادہ حکمت اور احتیاط کے خلاف ہی تو کہہ سکتے ہیں بالخصوص جبکہ اُن "جدید اصطلاحوں" کے استعمال کے ساتھ اصل مسائل کی پوری تشریح بھی ہوتی ہے جس کے بعد وہ خطرہ باقی نہیں رہتا، تو کس دلیل شرعی سے اس تعبیر کو آپ حرام اور اس درجہ کا ممنوع سمجھتے ہیں کہ اس کا مرتکب جس جماعت کا قاعد اور امیر ہو اس کی مخالفت آپ کے لئے ضروری ہو جائے؟ اسی طرح "مولویانہ وضع" میں آپ اُن کو نہیں دیکھتے کیا

اس کے بارہ میں کوئی ایسی نص ہے جس کی وجہ سے اس سے نا بت
حرام یا نا جائز ہو؟

اگرچہ ان امور میں خود میرا مذاق اور میرا مسلک اُن سے الگ
ہے اور میں اپنے مذاق اور اپنے مسلک ہی کو بہتر سمجھتا ہوں۔
لیکن اس گزارش سے میری غرض یہ ہے کہ یہ چیزیں اس قسم کی نہیں
ہیں کہ ان کو اتنی اہمیت دی جائے اور ان کی بنیاد پر "جماعت
اسلامی" سے اختلاف یا اس کی مخالفت کی جائے۔ بالخصوص
جب کہ ان کی حیثیت "جماعت" کے "امیر مطلق" کی بھی نہیں ہے،
اور جب کہ "جماعت" کی دعوت نفس عقیدہ اور مسلک کی
طرف ہے نہ کہ اپنے امیر کی شخصیت اور اس کی امارت کی طرف
اور جب کہ "جماعت" اپنے مفاد کے تحفظ کے لئے امیر کو معزول
کرنے کی بھی مجاز ہے (ملاحظہ ہو دستور کی دفعہ (۱۰) متعلقہ امارت)

مولانا مودودی کے متعلق ایک آخری اور جامع بات یہ اور
عرض کرنی ہے کہ ہمارے نزدیک وہ علم دین میں اچھی بصیرت رکھنے
والے سے ایک مومن ہیں، ہم نے ان کو فرائض کی ادائیگی اور معصیات
سے اجتناب کا عملاً اہتمام کرنے والا بھی پایا اور "جماعت اسلامی"
کے نصب العین کے پیش نظر اس کے قائد اور امیر میں جو خاص صلاحیتیں
ہونی چاہئیں وہ بھی ہم نے ان میں سمجھیں اور اس پوری جماعت
میں جو تاسیس کے وقت لاہور میں موجود تھی مجموعی حیثیت سے
اس منصب کے لئے انہی کو سب سے زیادہ اہل دیکھا۔ اور صرف
اسی بنیاد پر ہم نے ان کا انتخاب کیا ہے ــــ نہ اس لئے کہ ہما

نزدیک وہ دنیائے اسلام کے سب سے بڑے عالم اور سب سے بڑے متقی اور خدارسیدہ شخص ہیں اور نہ وہ خود اس کے مدعی ہیں۔ اس قسم کے غلو اور اطراء سے ہم خدا کی پناہ چاہتے ہیں۔

دردمندانہ دعوت اور مخلصانہ گزارش

"جماعت اسلامی" کا دستور آپ ملاحظہ فرما چکے ہیں۔ اس کی حیثیت اور حالت کے متعلق جو کچھ یہاں عرض کیا گیا وہ بھی آپ کی نظر سے گزر چکا ہے جو شکوک و شبہات عام طور سے پیدا ہوتے ہیں یا پیدا کئے جاتے ہیں ان کی حقیقت بھی آپ کو معلوم ہو چکی ہے۔ اب آپ اپنی دینی اور ایمانی ذمہ داریوں کو پوری طرح ملحوظ رکھ کے غور فرمائیں اور خوب اچھی طرح غور فرمائیں کہ جو "جماعت" ان مقاصد کے لئے اٹھی ہے اور جس کے اصول اور شرائط یہ ہیں وہ آپ کی طرف سے کس رویہ کی مستحق ہے اور آپ کے دین و ایمان کا مطالبہ اس کے بارہ میں کیا ہے۔ یہاں روپے پیسے کے چندے کا سوال نہیں

"درکار ہیں دیوانے چند"

اسلام کا نظریۂ سیاسی

حکومتِ الٰہیہ کا قیام

حضرت مولٰینا سید ابوالاعلیٰ مودودی مدیر "ترجمان القرآن" تحریک "حکومتِ الٰہیہ" کے داعی ہیں انھوں نے اس موضوع پر عظیم الشان تحریری ذخیرہ فراہم کر دیا ہے مسلمانوں کے ایک وسیع حلقہ میں مولٰینا کی تصانیف پہنچ چکی ہیں اور ان کا حلقۂ ترویج و اشاعت روز افزوں ترقی کر رہا ہے جن لوگوں نے ابتک مولٰینا کی تصانیف نہیں دیکھی ہیں وہ "تحریکِ حکومتِ الٰہیہ" کی تفصیلات و جزئیات سمجھنے کیلئے مولٰینا کی تصانیف کا مطالعہ کریں۔ یہاں اُن کی مشہور تصنیف "مسلمان اور موجودہ سیاسی کشمکش" حصۂ سوم کے بعض صفحات نقل کئے جا رہے ہیں تاکہ جن لوگوں کے ہاتھوں میں صرف یہی کتاب پہنچے وہ مولٰینا کی دعوت اور "تحریکِ حکومتِ الٰہیہ" سے روشناس ہو جائیں۔

اسلام کے متعلق یہ فقرہ آپ اکثر سنتے رہتے ہیں کہ یہ "ایک جمہوری نظام" ہے۔ پچھلی صدی کے آخری دور سے اس فقرے کا بار بار اعادہ کیا جا رہا ہے۔ مگر جو لوگ اس کو زبان سے نکالتے ہیں مجھے یقین ہے کہ ان میں سے شائد ایک فی ہزار بھی ایسے نہیں ہیں جنہوں نے اس دین کا باقاعدہ مطالعہ کیا ہو، اور یہ سمجھنے کی کوشش کی ہو کہ اسلام کی جمہوریت کس حیثیت سے ہے اور کس نوعیت کی ہے۔ ان میں سے بعض لوگ تو اسلامی نظام جماعت کی چند ظاہری شکلوں کو دیکھ کر جمہوریت کا نام اس پر چسپاں کر دیتے ہیں اور اکثر ایسے ہیں جن کی ذہنیت کچھ اس طور پر بنی ہے کہ دنیا میں (اور خصوصاً ان کے حکمرانوں میں) جو چیز مقبول عام ہو، اس کو کسی نہ کسی طرح اسلام میں موجود ثابت کر دینا ان کے نزدیک اس مذہب کی سب سے بڑی خدمت ہے۔ شائد وہ اسلام کو اس یتیم بچے کی طرح سمجھتے ہیں جو ہلاکت سے بس اسی طرح بچ سکتا ہے کہ کسی با اثر شخص کی سرپرستی اس کو حاصل ہو جائے۔ یا پھر غالباً ان کا خیال یہ ہے کہ ہماری عزت محض مسلمان ہونے کی حیثیت سے قائم نہیں ہو سکتی بلکہ صرف اس طرح قائم ہو سکتی ہے کہ ہم اپنے مسلک میں دنیا کے کسی چلتے ہوئے مسلک کے اصولوں کی جھلک دکھا دیں۔ اسی ذہنیت کا نتیجہ ہے کہ جب دنیا میں اشتراکیت کا غلغلہ بلند ہوا تو مسلمانوں میں کچھ لوگوں نے پکارنا شروع کیا کہ اشتراکیت تو محض اسلام ہی کا ایک جدید ایڈیشن ہے اور جب ڈکٹیٹرشپ کا آوازہ اٹھا تو کچھ دوسرے لوگوں نے اطاعت امیر

اطاعت امیر کی صدائیں بلند کرنی شروع کر دیں، اور لگے کہنے کہ دیکھو یہاں سارا نظامِ جماعت ڈکٹیٹرشپ ہی پر قائم ہے۔ غرض اسلام کا نظریۂ سیاسی اس زمانہ میں ایک چیستان، ایک چوں چوں کا مربہ بن کر رہ گیا ہے، جس میں سے ہر وہ چیز نکال کر دکھا دی جاتی ہے جس کا بازار میں چلن ہو۔ ضرورت ہے کہ باقاعدہ علمی طریقے سے اس امر کی تحقیق کی جائے کہ فی الواقع اسلام کا سیاسی نظریہ کیا ہے۔ اس طرح نہ صرف اُن پراگندہ خیالیوں کا خاتمہ ہو جائے گا جو ہر طرف پھیلی ہوئی ہیں، اور نہ صرف اُن لوگوں کا منہ بند ہو جائیگا جنہوں نے حال میں علی الاعلان یہ لکھ کر اپنی جہالت کا ثبوت دیا تھا کہ "اسلام سرے سے کوئی سیاسی و تمدنی نظام تجویز ہی نہیں کرتا" بلکہ درحقیقت تاریکیوں میں بھٹکنے والی دنیا کے سامنے ایک ایسی روشنی نمودار ہو جائے گی جس کی وہ سخت حاجتمند ہے اگرچہ اس حاجتمندی کا شعور نہیں رکھتی۔

تمام اسلامی نظریات کی اساس سب سے پہلے یہ بات ذہن نشین کر لیجئے کہ اسلام محض چند منتشر خیالات اور منتشر طریقہ ہائے عمل کا مجموعہ نہیں ہے جس میں اِدھر اُدھر سے مختلف قسم کی چیزیں لاکر جمع کر دی گئی ہوں بلکہ یہ ایک باضابطہ نظام ہے جس کی بنیاد چند مضبوط اصولوں پر رکھی گئی ہے۔ اس کے بڑے بڑے ارکان سے لے کر چھوٹے سے چھوٹے جزئیات تک ہر چیز اس کے بنیادی اصولوں کے ساتھ ایک منطقی ربط رکھتی ہے۔ انسانی زندگی کے تمام مختلف شعبوں کے متعلق اس نے جتنے قاعدے اور ضابطے مقرر کئے ہیں ان سب کی

روح اور ان کا جوہر اس کے اصول اوّلیہ ہی سے ماخوذ ہے۔ ان اُصولِ اوّلیہ سے پوری اسلامی زندگی اپنی مختلف شاخوں کے ساتھ بالکل اسی طرح نکلتی ہے جس طرح درخت میں آپ دیکھتے ہیں کہ بیج سے جڑیں اور جڑوں سے تنہ، اور تنے سے شاخیں اور شاخوں سے پتیاں پھوٹتی ہیں اور خوب پھیل جانے کے باوجود اس کی ایک ایک پتی اپنی جڑ کے ساتھ مربوط رہتی ہے۔ پس آپ اسلامی زندگی کے جس شعبے کو بھی سمجھنا چاہیں آپ کے لئے ناگزیر ہے کہ اس کی جڑ کی طرف رجوع کریں، کیونکہ اس کے بغیر آپ اس کی روح کو نہیں پا سکتے۔

انبیاء علیہم السّلام کا مشن

اسلام کے متعلق یہ بات تو آپ مجملاً جانتے ہی ہیں کہ یہ انبیاء علیہم السّلام کا مشن ہے یہ صرف محمد ابنِ عبداللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی کا مشن نہیں ہے، بلکہ انسانی تاریخ کے قدیم ترین دور سے جتنے انبیاء بھی خدا کی طرف سے آئے ہیں، اُن سب کا یہی مشن تھا اس کے ساتھ یہ بھی اجمالی طور پر آپ کو معلوم ہے کہ یہ سب نبی ایک خدا کی خدائی منوانے اور اسی کی عبادت کرانے آئے تھے لیکن میں چاہتا ہوں کہ اس اجمال کا پردہ اُٹھا کر ذرا آپ گہرائی میں اتریں اور سب کچھ اسی پردے کے نیچے چھپا ہوا ہے۔ تجسس کی نگاہ ڈال کر اچھی طرح دیکھئے کہ ایک خدا کی خدائی منوانے سے مقصد کیا تھا۔ اور صرف اسی کی عبادت کرانے کا مطلب کیا تھا؟ اور آخر اس میں ایسی کونسی بات تھی کہ جہاں کسی اللہ کے بندے نے مالکم من الٰہٍ غیرہٗ کا اعلان کیا اور ساری طاغوتی طاقتیں جھاڑ کا کانٹا بن کر اس کو چمٹ گئیں؟ اگر بات صرف اتنی ہی تھی جتنی آج کل سمجھی جاتی

ہے کہ مسجد میں خدائے واحد کے آگے سجدہ کرلو اور پھر باہر نکل کر حکومت وقت (جو بھی وقت کی حکومت ہو) کی وفاداری و اطاعت میں لگ جاؤ تو کس کا سر پھرا تھا کہ اتنی سی بات کے لئے خواہ مخواہ اپنی وفادار رعایا کی مذہبی آزادی میں مداخلت کرتا؟ آئیے ہم تحقیق کرکے دیکھیں کہ خدا کے بارے میں انبیا علیہم السلام کا اور دنیا کی دوسری طاقتوں کا اصل جھگڑا کس بات پر تھا۔

قرآن میں ایک جگہ نہیں بکثرت مقامات پر یہ بات صاف کردی گئی ہے کہ کفار و مشرکین جن سے انبیاء کی لڑائی تھی اللہ کے منکر نہ تھے ان سب کو تسلیم تھا کہ اللہ ہے، اور وہی زمین و آسمان کا خالق، اور خود ان کفار و مشرکین کا خالق بھی ہے۔ کائنات کا سارا انتظام اسی کے اشارے سے ہو رہا ہے، وہی پانی برساتا ہے وہی ہواؤں کو گردش دیتا ہے۔ اسی کے ہاتھ میں سورج اور چاند اور زمین سب کچھ ہیں۔

قُلْ لِّمَنِ الْاَرْضُ وَمَنْ فِيْهَآ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ؞ سَيَقُوْلُوْنَ لِلّٰهِ قُلْ اَفَلَا تَذَكَّرُوْنَ؞ قُلْ مَنْ رَّبُّ السَّمٰوٰتِ السَّبْعِ وَرَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِيْمِ؞ سَيَقُوْلُوْنَ لِلّٰهِ ۔ قُلْ اَفَلَا تَتَّقُوْنَ؞ قُلْ مَنْ بِيَدِهٖ مَلَكُوْتُ كُلِّ شَيْءٍ وَّهُوَ يُجِيْرُ وَلَا يُجَارُ عَلَيْهِ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ؞ سَيَقُوْلُوْنَ لِلّٰهِ قُلْ فَاَنّٰى تُسْحَرُوْنَ؟

(المومنون - ۵ع)

ان سے پوچھو کہ زمین اور جو کچھ زمین میں ہے وہ کس کا ہے
بتاؤ اگر تم جانتے ہو؟ وہ کہینگے اللہ کا ہے کہو پھر تم غور نہیں
کرتے؟ ان سے پوچھو ساتوں آسمانوں کا رب اور عرش عظیم
کا رب کون ہے؟ کہیں گے اللہ کہو پھر تم اس سے ڈرتے
نہیں؟ ان سے پوچھو وہ کون ہے جس کے ہاتھ میں ہر چیز
کا اختیار ہے اور وہ سب کو پناہ دیتا ہے مگر کوئی اس کے
مقابلے میں کسی کو پناہ نہیں دے سکتا؟ بتاؤ اگر تم جانتے ہو؟
وہ کہیں گے اللہ کہو پھر تم کس دھوکے میں ڈال دئیے گئے ہو؟

وَلَئِنْ سَأَلْتَهُمْ مَنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ
وَسَخَّرَ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ لَيَقُوْلُنَّ اللّٰهُ
فَاَنّٰى يُؤْفَكُوْنَ ؟ ...... وَلَئِنْ سَأَلْتَهُمْ
مَنْ نَّزَّلَ مِنَ السَّمَاءِ مَاءً فَاَحْيَا بِهِ الْاَرْضَ
مِنْۢ بَعْدِ مَوْتِهَا لَيَقُوْلُنَّ اللّٰهُ (العنکبوت-۶)

اگر تم ان سے پوچھو کہ کس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا
کیا ہے؟ اور کس نے سورج اور چاند کو اپنا تابع فرمان بنا
رکھا ہے؟ وہ ضرور کہیں گے کہ خدا نے۔ پھر آخر یہ کدھر بھٹکائے
جا رہے ہیں؟ ..... اور اگر تم ان سے پوچھو کہ کس نے آسمان سے
پانی اتارا اور کس نے مری ہوئی زمین کو روئیدگی بخش دی؟
وہ ضرور کہیں گے کہ اللہ نے۔

وَلَئِنْ سَأَلْتَهُمْ مَنْ خَلَقَهُمْ لَيَقُوْلُنَّ
اللّٰهُ فَاَنّٰى يُؤْفَكُوْنَ ؟ (الزخرف-۷)

اور اگر تم ان سے پوچھو کہ تم کو کس نے پیدا کیا ہے؟ وہ
ضرور کہیں گے کہ اللہ نے۔ پھر آخر یہ کدھر بھٹکائے جا رہے ہیں۔

اِن آیات سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اللہ کے ہونے
میں، اور اس کے خالق ہونے اور مالک ارض و سما ہونے میں کوئی
اختلاف نہ تھا۔ لوگ اِن باتوں کو خود ہی مانتے تھے، لہذا ظاہر
ہے کہ انہی باتوں کو منوانے کے لیئے تو انبیاء کے آنے کی ضرورت
تھی ہی نہیں۔ اب پوچھیئے کہ انبیاء کی آمد کس لیئے تھی اور جھگڑا
کس چیز کا تھا؟ قرآن کہتا ہے کہ سارا جھگڑا اس بات پر
تھا کہ انبیا کہتے تھے، جو تمہارا اور زمین و آسمان کا خالق ہے وہی
تمہارا رب اور اِلٰہ بھی ہے اسکے سوا کسی کو اِلٰہ اور رب نہ
مانو مگر دنیا اس بات کو ماننے کے لیئے تیار نہ تھی۔ آئیے ذرا پھر
تحقیق کریں کہ اس جھگڑے کی تہ میں کیا ہے؛ اِلٰہ سے کیا
مراد ہے؟ رب کسے کہتے ہیں؟ انبیا کو کیوں اصرار تھا کہ صرف
اللہ ہی کو اِلٰہ اور رب مانو اور دنیا کیوں اس پر لڑنے کھڑی
ہو جاتی تھی؟

اِلٰہ کے معنی آپ سب جانتے ہیں کہ معبود کے ہیں۔ مگر معاف
کیجیئے گا، معبود کے معنی آپ بھول گئے ہیں۔ معبود کا مادہ عبد ہے
عبد بندے اور غلام کو کہتے ہیں۔ عبادت کے معنی محض پوجا کے
نہیں ہیں، بلکہ بندہ اور غلام جو زندگی غلامی اور بندگی کی حالت
میں بسر کرتا ہے وہ پوری کی پوری سراسر عبادت ہے۔ خدمت
کے لیئے کھڑا ہونا، احترام میں ہاتھ باندھنا، اعترافِ بندگی میں سر

جھکانا، فرماں برداری میں دوڑدھوپ اور سعی وجہد کرنا جس کام کا اشارہ ہو اسے بجالانا جو کچھ آقا طلب کرے اسے پیش کردینا، اس کی طاقت وجبروت کے آگے ذلت اور عاجزی اختیار کرنا، جو قانون وہ بنائے اس کی اطاعت کرنا جس کے خلاف وہ حکم دے اس پر چڑھ دوڑنا، جہاں اس کا فرمان ہو سر تک کٹوا دینا یہ عبادت کا اصلی مفہوم ہے، اور آدمی کا معبود حقیقت میں وہی ہے جس کی عبادت وہ اس طرح سے کرتا ہے۔

اور رب کا مفہوم کیا ہے؟ عربی میں رب کے اصلی معنی پرورش کرنے والے کے ہیں اور چونکہ دنیا میں پرورش کرنیوالے ہی کی اطاعت و فرماں برداری کی جاتی ہے، لہٰذا رب کے معنی مالک اور آقا کے بھی ہوئے چنانچہ عربی محاورہ میں مال کے مالک کو رَبُّ المال۔ اور صاحب خانہ کو رَبُّ الدار کہتے ہیں آدمی جس کو اپنا رازق اور اپنا مربی سمجھے جس سے نوازش اور سرفرازی کی امید رکھے جس سے عزت اور ترقی اور امن کا متوقع ہو جس کی نگاہِ لطف کے پھر جانے سے خوف کرے کہ میری زندگی بگڑ جائیگی جس کو اپنا آقا اور مالک قرار دے اور جس کی فرماں برداری و اطاعت کرے، وہی اُس کا رب ہے۔

ان دونوں لفظوں کے معنی پر نگاہ رکھئے اور پھر غور سے دیکھئے انسان کے مقابلے میں یہ دعوی لے کر کون کھڑا ہو سکتا ہے کہ میں تیرا الله ہوں، اور میں تیرا رب ہوں، میری بندگی وعبادت کر؟ کیا درخت؟ پتھر؟ دریا؟ جانور؟ سورج؟ چاند؟ تارے؟

کسی میں بھی یہ یارا ہے کہ وہ انسان کے سامنے آکر یہ دعویٰ پیش کرسکے؟ نہیں ہرگز نہیں۔ وہ صرف انسان ہی ہے جو انسان کے مقابلہ میں خدائی کا دعویٰ لے کر اٹھتا ہے اور اٹھ سکتا ہے۔ خدائی کی ہوس انسان ہی کے سر میں سما سکتی ہے۔ انسان ہی کی حد سے بڑھی ہوئی خواہشِ اقتدار یا خواہشِ انتفاع اُسے اِس بات پر اُبھارتی ہے کہ وہ دوسرے انسانوں کا خدا بنے۔ اُن سے اپنی بندگی کرائے ان کے سر اپنے آگے جھکوائے۔ اُن پر اپنا حکم چلوائے اُن کو اپنی خواہشات کے حصول کا آلہ بنائے۔ یہ خدا بننے کی لذت ایسی ہے کہ اس سے بڑھ کر کوئی لذیذ چیز انسان آج تک دریافت نہیں کرسکا ہے جس کو کچھ طاقت یا دولت، یا چالاکی و ہوشیاری یا کسی نوع کا زور حاصل ہے وہ یہی چاہتا ہے کہ اپنے فطری اور جائز حدود سے آگے بڑھے، پھیل جائے اور آس پاس کے انسانوں پر جو اس کے مقابلے میں ضعیف یا مفلس یا بیوقوف، یا کسی حیثیت سے بھی کمزور ہوں، اپنی خدائی کا سکہ جما دے۔

یہی وہ بنیادی اصلاح تھی جو انسانی زندگی میں انبیاء علیہم السلام نے کی۔ وہ دراصل انسان پر انسان کی خدائی تھی جس کو مٹانے کے لئے یہ لوگ آئے۔ اُن کا اصلی مشن یہ تھا کہ انسان کو اس ظلم سے۔ ان جھوٹے خداؤں کی بندگی سے، اس طغیان اور ناجائز انتفاع سے نجات دلائیں۔ ان کے آنے کا مقصد یہ تھا کہ جو انسان، انسانیت کی حد سے آگے بڑھ گئے ہیں انھیں دھکیل کر پھر اُس حد میں واپس پہنچائیں، جو اس حد سے نیچے گرا دیئے گئے ہیں، انھیں اُبھار کر اِس حد تک

اٹھا لائیں اور سب کو ایک ایسے عادلانہ نظامِ زندگی کا پابند بنا دیں جس میں کوئی انسان نہ کسی دوسرے انسان کا عبد ہو نہ معبود بلکہ سب ایک اللہ کے بندے بن جائیں، ابتدا سے جتنے نبی دنیا میں آئے ان سب کا ایک ہی پیغام تھا اور وہ یہ تھا کہ یاقوم اعْبُدُوا اللّٰہَ مَا لَکُمْ مِّنْ اِلٰہٍ غَیْرُہٗ "لوگو! اللہ کی بندگی کرو اسکے سوا تمہارا کوئی اِلٰہ نہیں ہے" یہی حضرت نوحؑ نے کہا یہی حضرت ہودؑ نے کہا، یہی حضرتِ صالحؑ نے کہا[۱] اور اسی کا اعلان محمدؐ عربی صلی اللہ علیہ وسلم نے کیا کہ :-

اِنَّمَآ اَنَا مُنْذِرٌ وَّمَا مِنْ اِلٰہٍ اِلَّا اللّٰہُ الْوَاحِدُ الْقَھَّارُ رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَیْنَھُمَا۔ (ص-۵)

میں تمہیں خبردار کرنے آیا ہوں۔ کوئی اِلٰہ نہیں ہے بجز اس ایک اللہ کے جو سب پر غالب ہے، جو رب ہے آسمانوں اور زمین کا اور ہر اس چیز کا جو آسمان وزمین کے درمیان ہے

اِنَّ رَبَّکُمُ اللّٰہُ الَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ .... وَالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ وَالنُّجُوْمَ مُسَخَّرٰتٍ بِاَمْرِہٖ اَلَا لَہُ الْخَلْقُ وَالْاَمْرُ۔ (اعراف-۷)

یقیناً تمہارا رب اللہ ہے جس نے پیدا کیا ہے آسمانوں اور زمین کو...... اور سورج اور تاروں کو سب اس کے تابع ہیں۔ خبردار! خلق بھی اسی کی ہے اور حکومت بھی اسی کی ہے

---

[۱] ملاحظہ ہو سورۂ ہود رکوع ۴-۵-۶-۸

ذَٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمْ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ خَالِقُ كُلِّ شَيْءٍ فَاعْبُدُوْهُ وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ وَّكِيْلٌ ۔ (انعام - ۱۰۲)

وہ ہے اللہ، وہی تمھارا رب ہے اور اس کے سوا کوئی الٰہ نہیں وہ ہر چیز کا خالق ہے ۔ لہٰذا تم اس کی بندگی کرو ۔ اور وہ ہر چیز پر نگہبان ہے ✦

وَمَآ اُمِرُوْٓا اِلَّا لِيَعْبُدُوا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ حُنَفَآءَ (   )

انسانوں کو کوئی حکم نہیں دیا گیا بجز اس کے کہ اللہ کی بندگی کریں ۔ سب کو چھوڑ کر صرف اسی کی اطاعت کریں ✦

تَعَالَوْا اِلٰى كَلِمَةٍ سَوَآءٍ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ اَلَّا نَعْبُدَ اِلَّا اللّٰهَ وَلَا نُشْرِكَ بِهٖ شَيْـًٔا وَّلَا يَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ (آل عمران ۷)

آؤ ایک ایسی بات کی طرف جو ہمارے اور تمھارے درمیان یکساں ہے ۔ یہ کہ ہم اللہ کے سوا کسی کی بندگی نہ کریں اور خدائی میں کسی کو اس کا شریک نہ قرار دیں اور ہم میں سے کوئی کسی کو خدا کے سوا اپنا رب نہ بنا لے ✦

یہی وہ منادی تھی جس نے انسان کی روح اور اس کی عقل و فکر، اور اس کی ذہنی و مادی قوتوں کو غلامی کی ان بندشوں سے رہا کرایا جن میں وہ جکڑے ہوئے تھے، اور وہ بوجھ ان پر سے

اتارے جن کے نیچے وہ دبے ہوئے تھے۔ یہ انسان کے لئے حقیقی آزادی کا چارٹر تھا۔ محمد رسول اللہ کے اسی کارنامے کے متعلق قرآن میں ارشاد ہوا ہے کہ وَ یَضَعُ عَنْهُمْ اِصْرَهُمْ وَ الْاَغْلٰلَ الَّتِیْ كَانَتْ عَلَیْهِمْ یعنے یہ نبی ان پر سے وہ بوجھ اتارتا ہے جو اُن پر لدے ہوئے تھے اور ان بندھنوں کو کاٹتا ہے جن میں وہ کسے ہوئے تھے۔

نظریۂ سیاسی کا نقطۂ آغاز | انبیاء علیہم السلام نے انسانی زندگی کے لئے جو نظام مرتب کیا اس کا مرکز و محور اس کی روح اور اس کا جوہر یہی عقیدہ ہے اور اسی پر اسلام کے نظریۂ سیاسی کی بنیاد بھی قائم ہے۔ اسلامی سیاست کا اوّلین اصول یہ ہے کہ حکم دینے اور قانون بنانے کے اختیارات تمام انسانوں سے فرداً فرداً اور مجتمعاً سلب کر لئے جائیں۔ کسی شخص کا یہ حق تسلیم نہ کیا جائے کہ وہ حکم دے اور اور دوسرے اس کی اطاعت کریں۔ وہ قانون بنائے اور دوسرے اس کی پابندی کریں۔ یہ اختیار صرف اللہ کو ہے۔

اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ اَمَرَ اَلَّا تَعْبُدُوْا اِلَّاۤ اِیَّاهُ ذٰلِكَ الدِّیْنُ الْقَیِّمُ (یوسف ۵)

حکم سوائے اللہ کے اور کسی کا نہیں۔ اس کا فرمان ہے کہ اس کے سوا کسی کی بندگی نہ کرو۔ یہی صحیح دین ہے۔

یَقُوْلُوْنَ هَلْ لَّنَا مِنَ الْاَمْرِ مِنْ شَیْءٍ؟ قُلْ اِنَّ الْاَمْرَ كُلَّهٗ لِلّٰهِ (آل عمران ۱۶)

وہ پوچھتے ہیں کہ اختیارات میں ہمارا بھی کچھ حصہ ہے؟

کہہ دو کہ اختیارات تو سارے اللہ کے ہاتھ میں ہیں۔
وَلَا تَقُولُوا لِمَا تَصِفُ أَلْسِنَتُكُمُ الْكَذِبَ هَٰذَا حَلَالٌ وَهَٰذَا حَرَامٌ ۔ (النحل - ۱۵۰)
اپنی زبانوں سے یونہی غلط سلط نہ کہہ دیا کرو کہ یہ حلال ہے اور یہ حرام +

وَمَنْ لَمْ يَحْكُمْ بِمَا أَنْزَلَ اللَّهُ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الظَّالِمُونَ + (مائدہ - ۷)
جو خدا کی نازل کی ہوئی شریعت کے مطابق فیصلہ نہ کریں وہی دراصل ظالم ہیں۔

اس نظریہ کے مطابق حاکمیت sovereignty صرف خدا کی ہے قانون ساز (law - giver) صرف خدا ہے کوئی انسان خواہ وہ نبی ہی کیوں نہ ہو بذات خود حکم دینے اور منع کرنے کا حقدار نہیں نبی خود بھی الٰہی کے حکم کا پیرو ہے۔ اِنْ أَتَّبِعُ إِلَّا مَا يُوحَىٰ إِلَيَّ (انعام - ۵) "میں تو صرف اس حکم کی پیروی کرتا ہوں جو مجھ پر وحی کیا جاتا ہے"۔ عام انسان نبی کی اطاعت پر صرف اس لئے مامور ہیں کہ وہ اپنا حکم نہیں بلکہ خدا کا حکم بیان کرتا ہے۔

وَمَا أَرْسَلْنَا مِنْ رَسُولٍ إِلَّا لِيُطَاعَ بِإِذْنِ اللَّهِ ۔ (النساء - ۹)
ہم نے جو رسول بھیجا ہے اس لئے بھیجا ہے کہ اللہ کے اذن (SANCTION) کے تحت اس کی اطاعت کی جائے +

روح اور ان کا جوہر اس کے اصول اوّلیّہ ہی سے ماخوذ ہے۔ ان اُصولِ اوّلیہ سے پوری اسلامی زندگی اپنی مختلف شاخوں کے ساتھ بالکل اسی طرح نکلتی ہے جس طرح درخت میں آپ دیکھتے ہیں کہ بیج سے جڑیں اور جڑوں سے تنہ، اور تنے سے شاخیں اور شاخوں سے پتیاں پھوٹتی ہیں اور خوب پھیل جانے کے باوجود اس کی ایک ایک پتی اپنی جڑ کے ساتھ مربوط رہتی ہے۔ پس آپ اسلامی زندگی کے جس شعبے کو بھی سمجھنا چاہیں آپ کے لئے ناگزیر ہے کہ اس کی جڑ کی طرف رجوع کریں، کیونکہ اس کے بغیر آپ اس کی روح کو نہیں پاسکتے۔

انبیاء علیہم السّلام کا مشن اسلام کے متعلق یہ بات تو آپ مجملاً جانتے ہی ہیں کہ یہ انبیا علیہم السّلام کا مشن ہے یہ صرف محمد ابنِ عبداللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی کا مشن نہیں ہے، بلکہ انسانی تاریخ کے قدیم ترین دور سے جتنے انبیا بھی خدا کی طرف سے آئے ہیں، اُن سب کا یہی مشن تھا اس کے ساتھ یہ بھی اجمالی طور پر آپ کو معلوم ہے کہ یہ سب نبی ایک خدا کی خدائی منوانے اور اسی کی عبادت کرانے آئے تھے لیکن میں چاہتا ہوں کہ اس اجمال کا پردہ اٹھاکر ذرا آپ گہرائی میں اتریں سب کچھ اسی پردے کے نیچے چھپا ہوا ہے۔ تجسس کی نگاہ ڈال کر اچھی طرح دیکھئے کہ ایک خدا کی خدائی منوانے سے مقصد کیا تھا۔ اور صرف اسی کی عبادت کرانے کا مطلب کیا تھا؟ اور آخر اس میں ایسی کونسی بات تھی کہ جہاں کسی اللہ کے بندے نے مالکم من الٰہٍ غیرہٗ کا اعلان کیا اور ساری طاغوتی طاقتیں جھاڑ کا کانٹا بن کر اس کو چمٹ گئیں؟ اگر بات صرف اتنی ہی تھی جتنی آج کل سمجھی جاتی

کی طرف سے اس کے نبی نے دیا ہے۔ اور اس اسٹیٹ کو چلانے والی گورنمنٹ صرف اس حال میں اور اس حیثیت سے اطاعت کی مستحق ہوگی کہ وہ خدا کے قانون کو نافذ کرنے والی ہو۔

اسلامی اسٹیٹ کی نوعیت | ایک شخص بیک نظر ان خصوصیات کو دیکھ کر سمجھ سکتا ہے کہ یہ جمہوریت (Democracy) نہیں ہے اس لئے کہ جمہوریت تو نام ہی اس طرز حکومت کا ہے جس میں ملک کے عام باشندوں کو حاکمیت حاصل ہو، انہی کی رائے سے قوانین بنیں اور انہی کی رائے سے قوانین میں تغیر و تبدل ہو جس قانون کو وہ چاہیں وہ نافذ ہو اور جسے نہ چاہیں وہ کتاب آئین پر سے محو کر دیا جائے، یہ بات اسلام میں نہیں ہے' لہٰذا اس معنی میں اسے جمہوریت نہیں کہا جا سکتا۔ اس کے لئے زیادہ صحیح نام "الٰہی حکومت" ہے جس کو انگریزی میں (Theocracy) کہتے ہیں۔ مگر یورپ جس تھیاکریسی سے واقف ہے اسلامی تھیاکریسی اس سے بالکل مختلف ہے۔ یورپ اُس تھیاکریسی سے واقف ہے جس میں ایک مخصوص مذہبی طبقہ (Priest class) خدا کے نام سے خود اپنے بنائے ہوئے قوانین نافذ کرتا ہے[1]، اور عملاً اپنی خدائی عام باشندوں پر مسلط کر دیتا ہے۔ ایسی حکومت کو تو

---

[1] عیسائی پاپاؤں اور پادریوں کے پاس مسیح کی چند اخلاقی تعلیمات کے سوا کوئی شریعت سرے سے تھی ہی نہیں لہٰذا وہ اپنی مرضی سے اپنی خواہشات نفس کے مطابق قوانین بناتے تھے اور یہ کہہ کر انھیں نافذ کرتے تھے کہ یہ خدا کی طرف سے ہیں۔ فویل للذین یکتبون الکتاب بایدیھم ثم یقولون ھٰذا من عند اللہ۔

الٰہی حکومت کے بجائے شیطانی حکومت کہنا زیادہ موزوں ہوگا۔ بخلاف اس کے اسلام جس تھیاکریسی کو پیش کرتا ہے وہ کسی مخصوص مذہبی طبقہ کے ہاتھ میں نہیں ہوتی بلکہ عام مسلمانوں کے ہاتھ میں ہوتی ہے، اور یہ عام مسلمان اسے خدا کی کتاب اور اس کے رسول کی سنت کے مطابق چلاتے ہیں۔ اگر مجھے ایک نئی اصطلاح وضع کرنے کی اجازت دی جائے تو میں اس طرز حکومت کو (THEO DEMOCRACY) یعنے الٰہی جمہوری حکومت" کے نام سے موسوم کروں گا۔ کیونکہ اس میں خدا کی حاکمیت اور اس کے اقتدار اعلیٰ (Paramountcy) کے تحت مسلمانوں کو ایک محدود عمومی حاکمیت (Limited Popular Sovereignty) عطا کی گئی ہے۔ اس میں عاملہ یعنے (Executive) مسلمانوں کی رائے سے بنے گی مسلمان ہی اس کو معزول کرنے کے مختار ہوں گے سارے انتظامی معاملات اور تمام وہ مسائل جن کے متعلق خدا کی شریعت میں کوئی صریح حکم موجود نہیں ہے مسلمانوں کے اجماع ہی سے طے ہوں گے، اور الٰہی قانون جہاں تعبیر طلب ہوگا وہاں کوئی مخصوص نسل یا طبقہ نہیں بلکہ عام مسلمانوں میں سے ہر وہ شخص اس کی تعبیر کا مستحق ہوگا جس نے اجتہاد کی قابلیت بہم پہنچائی ہو۔ اس لحاظ سے یہ ڈیموکریسی ہے مگر جیسا کہ اوپر عرض کرچکا ہوں، جہاں خدا اور اس کے رسول کا حکم موجود ہو وہاں مسلمانوں کے کسی امیر کو کسی لیجسلیچر کو کسی مجتہد اور عالم دین کو، بلکہ ساری دنیا کے مسلمانوں کو مل کر بھی اس حکم میں یک سرِ مو ترمیم کرنے کا حق حاصل نہیں ہے اس لحاظ سے یہ تھیاکریسی ہے۔

ایک اعتراض | آگے بڑھنے سے پہلے میں اس امر کی تھوڑی سی تشریح کر دینا چاہتا ہوں کہ اسلام میں ڈیموکریسی پر یہ حدود وقیود کیوں عاید کئے گئے ہیں۔ اور ان حدود وقیود کی نوعیت کیا ہے۔ اعتراض کرنے والا یہ اعتراض کرسکتا ہے کہ اس طرح تو خدا نے انسانی عقل وروح کی آزادی سلب کر لی، حالانکہ ابھی تم یہ ثابت کر رہے تھے کہ ایک خدا کی الہٰیت انسان کو عقل وفکر اور جسم وجان کی آزادی عطا کرتی ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ قانون سازی کا اختیار اللہ نے اپنے ہاتھ میں انسان کی فطری آزادی سلب کرنے کے لئے نہیں بلکہ اس کو محفوظ کرنے کے لئے لیا ہے۔ اس کا مقصد انسان کو بے راہ ہونے اور اپنے پاؤں پر آپ کلہاڑی مارنے سے بچانا ہے۔

یہ مغرب کی نام نہاد ڈیموکریسی جس کے متعلق دعویٰ کیا جاتا ہے کہ اس میں عمومی حاکمیت (Popular sovereignty) ہوتی ہے اس کا ذرا تجزیہ تو کر کے دیکھئے جن لوگوں سے مل کر کوئی اسٹیٹ بنتا ہے وہ سب کے سب نہ تو خود قانون بناتے ہیں اور نہ خود اس کو نافذ کرتے ہیں۔ انھیں اپنی حاکمیت چند منتخب لوگوں کے سپرد کر لنی پڑتی ہے تاکہ اُن کی طرف سے وہ قانون بنائیں اور انھیں نافذ کریں۔ اسی غرض سے انتخاب کا ایک نظام مقرر کیا جاتا ہے اس انتخاب میں زیادہ تر وہ لوگ کامیاب ہوتے ہیں جو عوام کو اپنی دولت اپنے علم، اپنی چالاکی اور اپنے جھوٹے پروپیگنڈا کے زور سے بیوقوف بنا سکتے ہیں۔ پھر یہ خود عوام کے ووٹ ہی سے

ان کے الٰہ بن جاتے ہیں۔ عوام کے فائدے کے لیئے نہیں بلکہ اپنے شخصی اور طبقاتی فائدے کے لیئے قوانین بناتے ہیں اور اسی طاقت سے جو عوام نے ان کو دی ہے ان قوانین کو عوام پر نافذ کرتے ہیں۔ یہی مصیبت امریکہ میں ہے۔ یہی انگلستان میں ہے اور یہی ان سب ممالک میں ہے جن کو آج جمہوریت کی جنت ہونے کا دعوےٰ ہے۔

پھر اس پہلو کو نظر انداز کر کے اگر یہ تسلیم کر لیا جائے کہ وہاں عام لوگوں ہی کی مرضی سے قانون بنتے ہیں، تب بھی تجربہ سے یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ عام لوگ خود بھی اپنے مفاد کو نہیں سمجھ سکتے۔ انسان کی یہ فطری کمزوری ہے کہ یہ اپنی زندگی کے اکثر معاملات میں حقیقت کے بعض پہلوؤں کو دیکھتا ہے اور بعض کو نہیں دیکھتا اس کا فیصلہ (JUDGMENT) عموماً یک طرفہ ہوتا ہے، اس پر جذبات اور خواہشات کا اتنا غلبہ ہوتا ہے کہ یہ خالص عقلی اور علمی حیثیت سے بے لاگ رائے بہت کم قائم کر سکتا ہے۔ بلکہ بسا اوقات عقلی و علمی حیثیت سے جو بات اس پر روشن ہو جاتی ہے اس کو بھی یہ جذبات و خواہشات کے مقابلہ میں رد کر دیتا ہے۔ اس کے ثبوت میں بہت سی مثالیں میرے سامنے ہیں مگر طوالت سے بچنے کے لیئے میں صرف امریکہ کے قانون منع شراب (PROHIBITION LAW) کی مثال پیش کرونگا علمی اور عقلی حیثیت سے یہ بات ثابت ہو چکی تھی کہ شراب صحت کے لیئے مضر ہے، عقلی و ذہنی قوتوں پر برا اثر ڈالتی ہے اور انسانی

تمدن میں فساد برپا کرتی ہے۔ انہی حقائق کو تسلیم کرکے امریکہ کی رائے عام اس بات کے لئے راضی ہوئی تھی کہ منع شراب کا قانون پاس کیا جائے چنانچہ عوام کے ووٹ ہی سے یہ قانون پاس ہوا تھا مگر جب وہ نافذ کیا گیا تو انہی عوام نے جن کے ووٹ سے وہ پاس ہوا تھا اس کے خلاف بغاوت کی۔ بد تر سے بد تر قسم کی شرابیں ناجائز طور پر بنائیں اور پئیں۔ پہلے سے کئی گنا زیادہ شراب کا استعمال ہوا جرائم میں اور زیادہ اضافہ ہو گیا۔ آخر کار انہی عوام کے ووٹوں سے وہ شراب جو حرام کی گئی تھی، حلال کر دی گئی۔ یہ حرمت کا فتویٰ حلت سے جو بدلا گیا اس کی وجہ یہ نہ تھی کہ علمی و عقلی حیثیت سے اب شراب کا استعمال مفید ثابت ہو گیا تھا۔ بلکہ صرف یہ وجہ تھی کہ عوام اپنی جاہلانہ خواہشات کے بندے بنے ہوئے تھے۔ انھوں نے اپنی حاکمیت اپنے نفس کے شیطان کی طرف منتقل کر دی تھی، اپنی خواہش کو اپنا الٰہ بنا لیا تھا اور اس الٰہ کی بندگی میں وہ اس قانون کو بدلنے پر مُصر تھے جسے اُنھوں نے خود ہی علمی اور عقلی حیثیت سے صحیح تسلیم کر کے پاس کیا تھا۔ اس قسم کے اور بہت سے تجربات ہیں جن سے یہ بات روشن ہو جاتی ہے کہ انسان خود اپنا واضع قانون (Legislator) بننے کی پوری اہلیت نہیں رکھتا۔ اگر اس کو دوسرے الٰہوں کی بندگی سے رہائی مل بھی جائے تو وہ اپنی جاہلانہ خواہشات کا بندہ بن جائے گا۔ اپنے نفس کے شیطان کو الٰہ بنا لے گا لہٰذا وہ اس کا محتاج ہے کہ اس کی آزادی پر خود اس کے اپنے مفاد کیلئے مناسب حدیں لگا دی جائیں۔

اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے وہ قیود عائد کی ہیں جن کو اسلام کی اصطلاح میں "حدود اللہ" (Divine limits) کہا جاتا ہے یہ حدود زندگی کے ہر شعبے میں چند اصول۔ چند ضوابط اور چند قطعی احکام پر مشتمل ہیں جو اس شعبے کے اعتدال و توازن کو برقرار رکھنے کے لئے لگائی گئی ہیں۔ اُن کا منشاء یہ ہے کہ یہ تمہاری آزادی کی آخری حدیں ہیں۔ ان کے اندر رہ کر تم اپنے برتاؤ کے لئے ضمنی اور فروعی قاعدے (Regulations) بنا سکتے ہو مگر ان حدود سے تجاوز کرنے کی تمھیں اجازت نہیں ہے۔ ان سے تجاوز کرو گے تو تمھاری اپنی زندگی کا نظام فاسد و مختل ہو جائے گا۔

حدود اللہ کا مقصد | مثال کے طور پر انسان کی معاشی زندگی کو لیجئے۔ اس میں اللہ تعالیٰ نے شخصی ملکیت کا حق زکوٰۃ کی فرضیت، سود کی حرمت۔ جوے اور سٹے کی ممانعت، وراثت کا قانون، اور دولت کمانے، جمع کرنے اور خرچ کرنے پر پابندیاں عائد کر کے چند سرحدی نشانات لگا دئے ہیں، اگر انسان اُن نشانات کو برقرار رکھے اور اُن کے اندر رہ کر اپنے معاشی معاملات کی تنظیم کرے تو ایک طرف شخصی آزادی (Personal liberty) بھی محفوظ رہتی ہے اور دوسری طرف طبقاتی جنگ (class war) اور ایک طبقہ پر دوسرے طبقے کے تسلط کی وہ حالت بھی پیدا نہیں ہو سکتی جو ظالمانہ سرمایہ داری سے شروع ہو کر مزدوروں کی ڈکٹیٹر شپ پر منتہی ہوتی ہے اسی طرح عائلی زندگی (Family life) میں اللہ نے حجاب شرعی، مرد کی قوامیت، شوہر بیوی اور بچوں کے حقوق و فرائض

طلاق اور خلع کے احکام، تعداد ازواج کی مشروط اجازت، زنا اور قذف کی سزائیں مقرر کر کے ایسی حدیں کھڑی کر دی ہیں کہ اگر انسان ان کی ٹھیک ٹھیک نگہداشت کرے اور ان کے اندر رہ کر اپنی خانگی زندگی کو مضبوط کرے تو نہ گھر ظلم و ستم کی دوزخ بن سکتے ہیں اور نہ انہی گھروں سے عورتوں کی شیطانی آزادی کا وہ طوفان اُٹھ سکتا ہے جو آج پوری انسانی تہذیب کو غارت کر دینے کی دھمکیاں دے رہا ہے۔

اسی طرح انسانی تمدن و معاشرت کی حفاظت کے لئے اللہ تعالےٰ نے قصاص کا قانون، چوری کے لئے ہاتھ کاٹنے کی سزا، شراب کی حرمت، جسمانی ستر کے حدود اور ایسے ہی چند مستقل قاعدے مقرر کر کے فساد کے دروازے ہمیشہ کے لئے بند کر دئے ہیں۔

میرے لئے اتنا موقع نہیں ہے کہ میں حدود اللہ کی ایک مکمل فہرست آپ کے سامنے پیش کر کے تفصیل کے ساتھ بتاؤں کہ انسانی زندگی میں توازن و اعتدال قائم کرنے کے لئے ان میں سے ایک ایک حد کس قدر ضروری ہے۔ یہاں میں صرف یہ بات آپ کے ذہن نشین کرنا چاہتا ہوں کہ اللہ تعالےٰ نے اس طریقہ سے ایک ایسا مستقل ناقابلِ تغیر و تبدل دستور (Constitution) بنا کر انسان کو دے دیا ہے جو اس کی روح کی آزادی کو سلب اور اس کی عقل و فکر کو معطل نہیں کرتا، بلکہ اس کے لئے ایک صاف واضح اور سیدھا راستہ مقرر کر دیتا ہے تاکہ وہ اپنی جہالت اور اپنی کمزوریوں کے سبب سے تباہی کی بھول بھلیوں میں بھٹک نہ جائے اور اس کی قوتیں غلط راستوں میں ضائع نہ ہوں، اور وہ اپنی حقیقی فلاح و ترقی کی راہ پر سیدھا بڑھتا

چلا جائے۔ اگر آپ کو کسی پہاڑی مقام پر جانے کا اتفاق ہوا ہے تو آپ نے دیکھا ہوگا کہ پُرپیچ پہاڑی راستوں میں جن کے ایک طرف عمیق غار اور دوسری طرف بلند چٹانیں ہوتی ہیں سڑک کے کناروں کو ایسی رکاوٹوں سے محفوظ کر دیا جاتا ہے کہ مسافر غلطی سے کھڈ کی طرف نہ چلا جائے۔ کیا ان رکاوٹوں کا مقصد راہ رَو کی آزادی کو سلب کرنا ہے؟ نہیں۔ درصل ان سے مقصد یہ ہے کہ اُس کو ہلاکت سے محفوظ رکھا جائے۔ اور ہر پیچ، ہر موڑ اور ہر امکانی خطرہ کے موقع پر اُسے بتایا جائے کہ تیرا راستہ اُدھر نہیں اِدھر ہے، تجھے اُس رُخ پر نہیں اس رُخ پر مڑنا چاہئیے تاکہ تو بہ سلامت اپنی منزلِ مقصود پر پہنچ سکے۔ بس یہی مقصد ان حدوں کا بھی ہے جو خدا نے اپنے دستور میں مقرر کی ہیں۔ یہ حدیں انسان کے لئے زندگی کے سفر کا صحیح رُخ معیّن کرتی ہیں اور ہر پُرپیچ مقام، ہر موڑ، ہر دوراہے پر اُسے بتاتی ہیں کہ سلامتی کا راستہ اس طرف ہے، تجھے ان سمتوں پر نہیں بلکہ اس سمت پر پیش قدمی کرنی چاہیئے۔

جیسا کہ عرض کر چکا ہوں خدا کا مقرر کیا ہوا یہ دستور ناقابلِ تغیر و تبدل ہے، آپ اگر چاہیں تو ٹرکی اور ایران کی طرح اس دستور کے خلاف بغاوت کر سکتے ہیں مگر اس کو بدل نہیں سکتے۔ یہ قیامت تک کے لئے اٹل دستور ہے۔ اسلامی اسٹیٹ جب بنے گا اسی دستور کے ساتھ بنے گا جب تک قرآن اور سنتِ رسول دنیا میں باقی ہے اس دستور کی ایک دفعہ بھی اپنی جگہ سے نہیں ہٹائی جا سکتی۔ جس کو مسلمان رہنا ہو وہ اس کی پابندی پر مجبور ہے۔

اسلامی اسٹیٹ کا مقصد اس دستور کی حدود کے اندر جو اسٹیٹ بنے اس کے لئے ایک مقصد بھی خدا نے معین کر دیا ہے، اور اس کی تشریح قرآن میں متعدد مقامات پر کی گئی ہے مثلاً فرمایا۔

لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَيِّنٰتِ وَاَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتٰبَ وَالْمِيْزَانَ لِيَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ وَاَنْزَلْنَا الْحَدِيْدَ فِيْهِ بَاْسٌ شَدِيْدٌ وَّمَنَافِعُ لِلنَّاسِ (الحدید-۳)

ہم نے اپنے رسولوں کو واضح ہدایتوں کے ساتھ بھیجا اور ان کے ساتھ کتاب اور میزان اتاری تاکہ لوگ انصاف پر قائم ہوں اور ہم نے لوہا اتارا جس میں زبردست طاقت ہے اور لوگوں کے لئے فائدے ہیں۔

اس آیت میں لوہے سے مراد سیاسی قوت ہے اور رسولوں کا کام یہ بتایا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی واضح ہدایات اور اپنی کتاب آئین میں جو میزان اُن کو دی ہے۔ یعنے جس ٹھیک ٹھیک متوازن (well balanced) نظامِ زندگی کی طرف ان کی رہنمائی فرمائی ہے اُس کے مطابق اجتماعی عدل (social justice) قائم کریں۔

دوسری جگہ فرمایا:۔

اَلَّذِيْنَ اِنْ مَّكَّنّٰهُمْ فِى الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ وَاَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ (الحج-۶)

یہ وہ لوگ ہیں جن کو اگر ہم زمین میں تمکن (حکومت)

عطا کریں گے تو یہ نماز قائم کریں گے، زکوٰۃ دیں گے، نیکی کا حکم کریں گے اور بدی سے روکیں گے۔

ایک اور جگہ فرمایا۔

كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَتُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ (آل عمران ۱۱۰)

تم وہ بہترین جماعت ہو جسے نوعِ انسانی کے لئے نکالا گیا ہے، تم نیکی کا حکم دیتے ہو اور بدی سے روکتے ہو اور اللہ پر ایمان رکھتے ہو۔

ان آیات پر غور کرنے سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ قرآن جس اسٹیٹ کا تخیل پیش کر رہا ہے اس کا مقصد محض سلبی (NEGATIVE) نہیں ہے بلکہ وہ ایک ایجابی (Positive) مقصد اپنے سامنے رکھتا ہے، اس کا مدعا صرف یہی نہیں ہے کہ لوگوں کو ایک دوسرے پر زیادتی کرنے سے روکے، ان کی آزادی کی حفاظت کرے اور مملکت کو بیرونی حملوں سے بچائے۔ بلکہ اس کا مدعا اجتماعی عدل کے اس متوازن نظام کو رائج کرنا ہے جو خدا کی کتاب پیش کرتی ہے اس کا مقصد بدی کی ان تمام شکلوں کو مٹانا اور نیکی کی ان تمام صورتوں کو قائم کرنا ہے جن کو خدا نے اپنی واضح ہدایات میں بیان کیا ہے اس کام میں حسبِ موقع و محل سیاسی طاقت بھی استعمال کی جائیگی تبلیغ و تلقین سے بھی کام لیا جائے گا۔ تعلیم و تربیت کے ذرائع بھی کام میں لائے جائیں گے، اور جماعتی اثر اور رائے عام کے دباؤ کو بھی

استعمال کیا جائے گا۔

ہمہ گیر اسٹیٹ اس نوعیت کا اسٹیٹ، ظاہر ہے کہ اپنے عمل کے دائرے کو محدود نہیں کرسکتا۔ یہ ہمہ گیر اور کلی اسٹیٹ ہے۔ اس کا دائرۂ عمل پوری انسانی زندگی پر محیط ہے۔ یہ تمدن کے ہر شعبے کو اپنے مخصوص اخلاقی نظریہ اور اصلاحی پروگرام کے مطابق ڈھالنا چاہتا ہے۔ اس کے مقابلہ میں کوئی شخص اپنے کسی معاملہ کو پرائیویٹ اور شخصی (Personal) نہیں کہہ سکتا۔ اس لحاظ سے یہ اسٹیٹ فاشستی اور اشتراکی حکومتوں سے یک گونہ مماثلت رکھتا ہے۔ مگر آگے چل کر آپ دیکھیں گے کہ اس کلیت کے باوجود اس میں موجودہ زمانہ کی کلی (Totalitarian) اور استبدادی (Authoritarian) حکومتوں کا سا رنگ نہیں ہے۔ اس میں شخصی آزادی سلب نہیں کی جاتی۔ ورنہ اس میں آمریت (Dictatorship) پائی جاتی ہے۔ اس معاملہ میں کمال درجہ کا اعتدال اسلامی نظام حکومت میں قائم کیا گیا ہے اور حق و باطل کے درمیان جیسی نازک اور باریک سرحدیں قائم کی گئی ہیں، انھیں دیکھ کر ایک صاحب بصیرت آدمی کا دل بے اختیار گواہی دینے لگتا ہے کہ ایسا متوازن نظام حقیقت میں خدائے حکیم وخبیر ہی وضع کرسکتا ہے۔

جماعتی اور مسلکی اسٹیٹ دوسری بات جو اسلامی اسٹیٹ کے دستور اور اس کے مقصد اور اس کی اصلاحی نوعیت پر غور کرنے سے خود بخود واضح ہوجاتی ہے وہ یہ ہے کہ ایسے اسٹیٹ کو صرف وہی لوگ چلا سکتے ہیں جو اس کے دستور پر ایمان رکھتے ہوں، جنھوں نے اس کے مقصد کو

اپنی زندگی کا مقصد بنایا ہو، اور جو اس کے اصلاحی پروگرام سے نہ صرف پوری طرح متفق ہوں، نہ صرف اس میں کامل عقیدہ رکھتے ہوں بلکہ اس کی اسپرٹ کو اچھی طرح سمجھتے بھی ہوں اور اس کی تفصیلات سے واقف بھی ہوں۔ اسلام نے اس باب میں کوئی نسلی جغرافی، لونی یا لسانی قید نہیں رکھی ہے۔ وہ تمام انسانوں کے سامنے اپنے دستور، اپنے مقصد، اور اپنے اصلاحی پروگرام کو پیش کرتا ہے جو شخص بھی اسے قبول کرے خواہ وہ کسی نسل کسی ملک اور کسی قوم سے تعلق رکھتا ہو وہ اس جماعت میں شریک ہو سکتا ہے جو اس اسٹیٹ کو چلانے کے لئے بنائی گئی ہے۔ مگر جو اسے قبول نہ کرے اسے اسٹیٹ کے کام میں دخیل نہیں کیا جا سکتا۔ وہ اسٹیٹ کے حدود میں ذمی (Subjects) کی حیثیت سے رہ سکتا ہے اس کے لئے اسلام کے قانون میں معین حقوق اور مراعات موجود ہیں اس کی جان ومال اور عزت کی پوری حفاظت کی جائے گی، اور اگر وہ کسی خدمت کا اہل ہوگا تو اس سے خدمت بھی لی جائے گی لیکن بہر حال حکومت میں شریک کی حیثیت نہیں دی جائے گی، کیونکہ یہ ایک خاص مسلک رکھنے والی پارٹی کا اسٹیٹ ہے یہاں بھی اسلامی اسٹیٹ اور کمیونسٹ اسٹیٹ میں یک گونہ مماثلت پائی جاتی ہے لیکن دوسرے مسلکوں پر اعتقاد رکھنے والوں کے ساتھ جو برتاؤ اشتراکی جماعت کا اسٹیٹ کرتا ہے اس کو اس برتاؤ سے کوئی نسبت نہیں جو اسلامی جماعت کا اسٹیٹ کرتا ہے۔ اسلام میں وہ صورت نہیں ہے جو کمیونسٹ حکومت میں ہے کہ غلبہ واقتدار حاصل کرنے ہی اپنے تمدنی

اصولوں کو دوسروں پر بجبر مسلط کر دیا جائے۔ جائدادیں ضبط کی جائیں قتل وخون کا بازار گرم ہو اور ہزاروں لاکھوں آدمیوں کو پکڑ کر زمین کے جہنم سائبیریا کی طرف پھینک دیا جائے۔ اسلام نے غیر مسلموں کے لئے جو فیاضانہ برتاؤ اپنے اسٹیٹ میں اختیار کیا ہے، اور اس بارے میں عدل وظلم اور راستی و ناراستی کے درمیان جو باریک خطِ امتیاز کھینچا ہے اُسے دیکھ کر ہر انصاف پسند آدمی بہ یک نظر معلوم کر سکتا ہے کہ خدا کی طرف سے جو مُصلح آتے ہیں وہ کس طرح کام کرتے ہیں، اور دنیا میں جو مصنوعی اور جعلی مصلحین اُٹھ کھڑے ہوتے ہیں ان کا طریق کار کیا ہے۔

ذیل کا اقتباس حضرت مولانا مودودی کی ایک بسیط اور اہم بحث کا ٹکڑا ہے

اسلامی نصب العین کیا ہے؟

اس سوال کا جواب قرآن مجید میں جو کچھ دیا گیا ہے وہ یہ ہے:-

هُوَ الَّذِیْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰی وَدِیْنِ الْحَقِّ لِیُظْهِرَهٗ عَلَی الدِّیْنِ کُلِّهٖ وَلَوْ کَرِهَ الْمُشْرِکُوْنَ

"وہی ہے (یعنے اللہ) جس نے اپنے رسول کو ہدایت اور دینِ حق کے ساتھ بھیجا تاکہ اس کو پوری جنسِ دین پر غالب کر دے خواہ یہ کام مشرکوں کو کتنا ہی ناگوار ہو"

Slali

اس آیت میں اَلْھُدٰی (ہدایت) سے مراد دنیا میں زندگی بسر کرنے کا صحیح طریقہ ہے۔ انفرادی برتاؤ، خاندانی نظام، سوسائٹی کی ترکیب، معاشی معاملات، ملکی انتظام، سیاسی حکمت عملی، بین الاقوامی تعلقات غرض زندگی کے تمام پہلوؤں میں انسان کی زندگی کے لئے صحیح رویہ کیا ہونا چاہیئے۔ یہ چیز اللہ نے اپنے رسول کو بتا کر بھیجا ہے۔

دوسری چیز جو اللہ کا رسول لے کر آیا ہے وہ دین حق ہے دین کے معنی اطاعت کے ہیں۔ کیش اور مذہب کے لئے جو دین کا لفظ استعمال ہوتا ہے یہ اس کا اصل معنی موضوع لہٗ نہیں ہے بلکہ اس کو دین اس وجہ سے کہتے ہیں کہ اس میں انسان خیال و عمل کے ایک خاص سسٹم کی اطاعت کرتا ہے۔ ورنہ دراصل دین کا لفظ قریب قریب وہی معنی رکھتا ہے جو زمانہ حال میں لفظ "اسٹیٹ" کے معنی ہیں۔ لوگوں کا کسی بالاتر اقتدار کو تسلیم کر کے اس کی اطاعت کرنا یہ "اسٹیٹ" ہے۔ یہی دین کا مفہوم بھی ہے۔ اور "دین حق" یہ ہے کہ انسان دوسرے انسانوں کی، خود اپنے نفس کی اور تمام مخلوقات کی بندگی و اطاعت چھوڑ کر صرف اللہ کے اقتدار اعلیٰ کو تسلیم کرے اور اسی کی بندگی و اطاعت اختیار کرے۔ پس درحقیقت اللہ کا رسول اپنے بھیجنے والے کی طرف سے ایک ایسے "اسٹیٹ" کا نظام لے کر آیا ہے جس میں نہ تو انسان کی خود اختیاری کے لئے کوئی جگہ ہے، نہ انسان پر انسان کی حاکمیت کے لئے کوئی مقام بلکہ حاکمیت و اقتدار اعلیٰ جو کچھ بھی ہے صرف اللہ کے لئے ہے۔

پھر رسول کے بھیجنے کا مقصد یہ بتایا گیا ہے کہ وہ اس نظام اطاعت

(دین) اور اس قانونِ حیات (الہدیٰ) کو پوری جنسِ دین پر غالب کر دے۔ پوری جنسِ دین سے مراد یہ ہے کہ دنیا میں انسان انفرادی یا اجتماعی طور پر جن جن صورتوں سے کسی کی اطاعت کر رہا ہے وہ سب "جنسِ دین" کی مختلف انواع ہیں بیٹے کا والدین کی اطاعت کرنا، بیوی کا شوہر کی اطاعت کرنا، نوکر کا آقا کی اطاعت کرنا، ماتحت کا افسر کی اطاعت کرنا، رعیت کا حکومت کی اطاعت کرنا، پیرووں کا پیشواؤں اور لیڈروں کی اطاعت کرنا، یہ اور ایسی ہی دوسری بے شمار اطاعتیں بحیثیت مجموعی ایک نظامِ اطاعت بناتی ہیں، اور اللہ کی طرف سے رسول کے آنے کا مقصد یہ ہے کہ یہ پورا نظامِ اطاعت اپنے تمام اجزاء سمیت ایک بڑی اطاعت اور ایک بڑے قانون کے ماتحت ہو جائے، تمام اطاعتیں اللہ کی اطاعت کے تابع ہوں اُن سب کو منضبط (REGULATE) کرنے والا ایک اللہ ہی کا قانون ہو، اور اس بڑی اطاعت اور اس ضابطۂ قانون کی حدود سے باہر کوئی اطاعت باقی نہ رہے۔

یہ رسول کا مشن ہے اور رسول اس مشن کو پورا کرنے پر مامور ہے خواہ شرک کرنے والے اس پر کتنی ہی ناک بھوں چڑھائیں شرک کرنے والے کون ہیں؟ وہ سب لوگ جو اپنی انفرادی و اجتماعی زندگی میں اللہ کی اطاعت کے ساتھ دوسری مستقل بالذات (یعنے خدا کی اطاعت سے آزاد) اطاعتیں شریک کرتے ہیں جہاں تک اللہ کے قانونِ طبیعی (LAW OF NATURE) کا تعلق ہے، ہر انسان طوعاً و کرہاً اس کی اطاعت کر رہا ہے کیونکہ اس اطاعت کے

بغیر تو اس کے لئے کوئی چارہ ہی نہیں ہے۔ مگر جہاں تک انسان کے دائرہ اختیار کا تعلق ہے، اُس دائرے میں بعض انسان تو بالکل ہی غیر اللہ کے مطیع بن جاتے ہیں اور بعض انسان اپنی زندگی کو مختلف حصوں میں تقسیم کر کے کسی حصہ میں خدا کے بھیجے ہوئے قانونِ اخلاقی (شریعت) کی اطاعت کرتے ہیں اور کسی دوسرے حصہ میں اپنے نفس کی یا دوسروں کی اطاعت کرتے ہیں۔ اسی چیز کا نام اللہ کی اطاعت کے ساتھ دوسری اطاعتوں کو شریک کرنا ہے اور جو لوگ شرک کی ان مختلف صورتوں میں مبتلا ہیں ان کو یہ بات ناگوار ہوتی ہے کہ اپنی فطری اطاعت کی طرح اپنی اختیاری اطاعت و بندگی کو بھی بالکلیہ اللہ کے لئے خالص کر دیں۔ خواہ نادانی کے سبب سے یا اخلاقی کمزوری کے سبب سے بہرحال وہ شرک پر اصرار کرتے ہیں۔ لیکن اللہ کے رسول پر یہ فرض عائد کیا گیا ہے کہ ایسے لوگوں کی مزاحمت کے باوجود اپنے مشن کو پورا کرے۔

اسلامی نصب العین تک پہنچنے کا سیدھا راستہ

یہ ہے اسلامی نصب العین اور اس نصب العین کی طرف پیش قدمی کرنے کے لئے راہِ راست وہی ہے جو اللہ کے رسول نے اختیار کی، یعنی یہ کہ لوگوں کو "الھدیٰ" اور "دین حق" کی طرف دعوت دی جائے۔ پھر جو لوگ اس دعوت کو قبول کر کے اپنی بندگی و اطاعت کو اللہ کے لئے خالص کر دیں، دوسری اطاعتوں کو اللہ کی اطاعت کے ساتھ شریک کرنا چھوڑ دیں، اور خدا کے قانون کو

اپنی زندگی کا قانون بنالیں اُن کا ایک مضبوط جتھا بنایا جائے۔ پھر یہ جتھا تمام ان اخلاقی، علمی اور مادی ذرائع سے جو اس کے امکان میں ہوں، دینِ حق کو قائم کرنے کے لئے جہادِ کبیر کرے یہاں تک کہ اللہ کے سوا دوسری اطاعتیں جن جن طاقتوں کے بَل پر قائم ہیں اُن سب کا زور ٹوٹ جائے اور پورے نظامِ اطاعت پر وہی الھدیٰ اور "دینِ حق" غالب ہو جائے۔

اِس راہِ راست کا ہر جز قابلِ غور ہے۔

پہلا جزء یہ ہے کہ انسانوں کو بالعموم اللہ کی حاکمیت و اقتدارِ اعلیٰ تسلیم کرنے اور اس کے بھیجے ہوئے قانون کو اپنی زندگی کا قانون بنانے کی دعوت دی جائے۔ یہ دعوت عام ہونی چاہیئے ہر وقت جاری رہنی چاہیئے۔ اور اس کے ساتھ دوسری غیر متعلق باتوں کی آمیزش نہ ہونی چاہیئے۔ قوموں اور نسلوں اور ملکوں کے باہمی جھگڑے خود اپنے سیاسی اور معاشی مفادات کی بحثیں غیر الٰہی نظامات میں سے ایک کو دوسرے پر ترجیح دینا یا کسی نسبے نظامِ فاسد کی خودغرضانہ حمایت کرنا، یا کسی نظامِ فاسد میں اپنی جگہ بنانے کی کوشش کرنا، یہ سب چیزیں نہ صرف یہ کہ الھدیٰ اور دینِ حق کی دعوت کے ساتھ میل نہیں کھاتیں بلکہ صریح طور پر اُس کے منافی اور اس کے لئے مضرت رساں ہیں۔ پس جب کسی شخص یا گروہ کو دعوتِ حق کی خدمت انجام دینی ہو تو اسے ان تمام جھگڑوں اور بحثوں سے الگ ہو جانا چاہیئے اور اپنی دعوت کے ساتھ کسی دوسرے غیر متعلق اور بے جوڑ قضیئے کو شامل نہ کرنا چاہیئے۔

دوسرا جزء یہ ہے کہ جتھا صرف ان لوگوں کا بنایا جائے جو اس دعوت کو جان کر اور ... سمجھ کر قبول کریں، جو بندگی اور اطاعت کو فی الواقع اللہ کے لیئے خالص کر دیں، جو دوسری اطاعتوں کو اللہ کی اطاعت کے ساتھ واقعی شریک کرنا چھوڑ دیں اور حقیقت میں اللہ کے قانون کو اپنا قانونِ زندگی بنالیں رہے دوسرے لوگ جو اس طرزِ خیال یا اس طرزِ زندگی کے محض معترف ہوں، یا اس سے ہمدردی رکھتے ہوں تو وہ مجاہدہ کرنے والے جتھے کے لیڈر کیا معنی، کارکن بھی نہیں بن سکتے۔ اس میں شک نہیں کہ جو جس درجہ میں بھی اس کا ہمدرد یا بیرونی معاون بن جائے بسا غنیمت ہے، مگر ارکان اور ہمدردوں کے درمیان جو حقیقی فرق و امتیاز ہے اُسے کسی حال میں نظر انداز نہ کرنا چاہیئے۔

تیسرا جزء یہ ہے کہ براہِ راست غیر الٰہی نظامِ اطاعت پر حملہ کیا جائے۔ تمام کوششوں کا مقصود صرف ایک بات کو بنایا جائے کہ اللہ کی حاکمیت ہو اور اس کے سوا کسی دوسری چیز کو مقصود بنا کر اسکے پیچھے قوتیں ضائع نہ کی جائیں۔

امامِ تفسیر حضرت مولانا حمید الدین فراہی رحمۃ اللہ علیہ

کے افادات

تعارف ۔ حضرت مولانا حمید الدین فراہی رحمۃ اللہ علیہ کے افادات پیش کرنے سے پہلے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ قارئین سے حضرت مولانا کا مختصر تعارف کرا دیا جائے۔

حضرت مولانا حمید الدین کا وطن اعظم گڑھ کا ایک گاؤں ہے جس کی نسبت سے آپ فراہی مشہور ہیں۔ مولانا کی ولادت سنہ ۱۲۸۰ھ / ۱۸۶۲ء میں ہوئی اور وفات ۱۳۴۹ھ / ۱۹۳۰ء میں، دینیات میں درس نظامیہ کے فارغ التحصیل تھے۔ اور انگریزی میں علیگڈھ کے بی۔ اے، عربی ادب کی تکمیل شارح حماسہ مولانا فیض الحسن صاحب سے کی تھی جو علامہ شبلی مرحوم کے بھی استاد تھے۔

جامعہ عثمانیہ حیدر آباد دکن سے حضرت مولانا حمید الدین صاحب

کو خصوصی تعلق ہے، مولانا ہی نے اس کی تعلیم کا خاکہ تیار کیا تھا اور تجویز پیش کی تھی کہ دینیات کی تعلیم عربی میں ہو اور باقی تمام علوم وفنون، اصولِ فقہ تک کی تعلیم اردو زبان میں دی جائے، کتابوں کے ترجمے اور اصطلاحات کی وضع کے لئے جو مجلس بنائی گئی تھی اُس میں مولانا بھی شامل تھے۔

مولانا حمید الدین کی سب سے بڑی خصوصیت اُن کی قرآن فہمی کی درک و مہارت تھی، قیامِ حیدرآباد کے زمانہ میں مولانا نے وہاں درسِ قرآن کا ایک حلقہ قائم کیا تھا لوگ اس میں اپنے شکوک بھی پیش کرتے اور مولانا جواب دیتے۔ اس حلقہ میں شرکت کرنے والوں میں مولانا مناظر احسن گیلانی اور مولوی وحید الدین سلیم مرحوم بھی تھے۔

جامعہ عثمانیہ کی تعلیم کے متعلق راس مسعود صاحب اور نواب سر حیدر نواز جنگ نے مولانا حمید الدین کی تجویز کا یہ حصہ تو منظور کر لیا کہ تعلیم کی زبان اُردو ہو، لیکن اِس حصہ کو قبول نہ کیا کہ تمام لڑکوں کو دینیات کی تعلیم عربی میں دی جائے، اس کا مولانا پر یہ اثر ہوا کہ ۱۹۱۹ء میں جب جامعہ عثمانیہ کا قیام عمل میں آ رہا تھا ارکانِ حکومت کی خواہش کے برعکس ایک ہزار روپئے ماہوار کی جگہ چھوڑ کر آپ حیدرآباد سے وطن چلے آئے۔

علامہ شبلی مرحوم کی وفات کے بعد سیرۃ النبی کی تکمیل اور دار المصنفین کی بقا کے لئے خطرہ پیدا ہو گیا

تھا، حضرت مولانا حمید الدین نے بھوپال اور حیدر آباد جاکر کوشش کی، اور ان دونوں ریاستوں سے علامہ شبلی کو جو وظیفے ملتے تھے ان کا سلسلہ جاری رہا۔ مولانا آخر وقت تک دار المصنفین کی مجلس عاملہ کے صدر رہے۔

مولانا حمید الدین کی یادگار **مدرسۃ الاصلاح** سرائے میر ہے جو قرآن مجید کی تعلیم کے لئے ہندوستان کے دینی مدارس میں ایک امتیازی خصوصیت کا مالک ہے۔[۵]

علم و عمل میں حضرت مولانا حمید الدین کا جو مرتبہ تھا اس کا اندازہ اکابر ملت کی آراء سے ہو سکتا ہے حضرت مولانا ابو الکلام آزاد تحریر فرماتے ہیں:۔

"مولانا حمید الدین مرحوم .... ان علمائے حق میں سے تھے جن کا سرمایۂ امتیاز صرف علم ہی نہیں بلکہ عمل بھی ہوتا ہے، اور اس دوسری جنس کی کمیابی کا جو عالم ہے وہ اہل نظر سے پوشیدہ نہیں۔ میں جب کبھی ان سے ملا مجھ پر ان کے علم سے زیادہ ان کی عملی پاکی کا اثر ہوا۔ وہ پورے معنوں میں ایک متقی اور راست باز انسان تھے، اُن کے دل کی پاکی اور نفس کی طہارت دیکھ کر رشک ہوتا تھا۔"

---

[۵] مولانا سید سلیمان ندوی رسالہ "الاصلاح" سرائے میر میں مولانا فراہی کے سوانح لکھ رہے تھے، یہ حالات اسی سے ماخوذ ہیں۔

حضرت مولانا سید سلیمان ندوی فرماتے ہیں۔

مولانا حمید الدین صاحب رحمۃ اللہ علیہ نہ صرف علم و فضل میں یکتائے زمانہ تھے بلکہ اپنی صحتِ اعتقاد اور زہد و تقویٰ کے لحاظ سے خواص امت میں تھے۔

حضرت مولانا ابوالمحاسن محمد سجاد صاحب مرحوم نائبِ شریعت صوبۂ بہار نے لکھا ہے:۔

"مولانا مرحوم نے اپنی زندگی کا بیشتر حصہ قرآنِ کریم کی خدمت کے لئے وقف کر دیا تھا، اور حق یہ ہے کہ انھوں نے جس وقتِ نظر کے ساتھ قرآنِ کریم کا مطالعہ کر کے قرآنِ کریم کے مضامینِ عالیہ اور اس کے اسلوبِ بیان اور طرزِ ادا کو جس عنوان سے قوم و ملت کے سامنے پیش کیا ہے اس کا ثمرہ بجز اسکے اور کیا ہو سکتا ہے کہ قرآنِ کریم کلامِ ربانی ہے اور تمام لفظی اور معنوی عیوب و نقائص سے پاک ہے"

نواب صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی نے حضرت مولانا حمید الدین کی وفات پر علامہ سید سلیمان ندوی کو لکھا تھا۔

"مجھ کو مولانا سے دیرینہ نیاز حاصل تھا۔ ابتدائی ملاقات کا ذریعہ علامہ شبلی مرحوم تھے۔ علی گڑھ کی پروفیسری کے زمانے میں ملا پھر حیدرآباد میں .... علی گڑھ کے دور میں بھی تدبر قرآنی کا شغف جاری رہا۔ روزانہ دو بجے

شب سے صبح کے نو بجے تک اسی میں وقت صرف کرتے تھے۔ ملاقات کے وقت نتائج تحقیق بیان فرماتے۔"

مولانا عبدالماجد دریا بادی ۱۱ رفروری ۱۹۳۶ء کے صدق میں لکھتے ہیں :۔

"علامہ حمیدالدین فراہی اس دور میں علوم قرآنی کے لحاظ سے امامِ وقت تھے لکھ جانے کی جتنی ضرورت اس کے مساعد تو حالات نہ ہو سکے پھر بھی عربی میں جتنا تحریر فرما گئے ہیں وہ اچھا خاصہ ذخیرہ ہے۔ خدمت قرآن کے مدعی تو بہت ہیں لیکن مولانا اپنی دقتِ نظر عمقِ فکر، حکیمانہ ژرف نگاہی، علم وفضل، تبحرّ ادبی اور تقویٰ وطہارت کے لحاظ سے اپنی نظیر آپ تھے۔"

جمعیۃ علمائے ہند کے ترجمان "اخبار الجمعیۃ" ۱۴ رجولائی ۱۹۳۶ء کی اشاعت میں لکھتا ہے :۔

" مولانا حمیدالدین فراہی مرحوم ومغفوران مخصوص بزرگون اور کتابِ الٰہی کے عاشقوں میں سے تھے جن پر جنابِ الٰہی سے فہمِ قرآن کی راہیں کشادہ ہوئیں اور سعادت ازلی نے جن کو قرآن کے اسرار وحِکَم کا عارف کامل بنایا .... مرحوم کی علمی قابلیت اور معرفت کتابِ الٰہی کے متعلق دنیائے اسلام کا متفقہ فیصلہ ہے کہ وہ اپنی فکری صلاحیت، اجتہادی بصیرت اور قرآن کی معرفت میں اپنا نظیر نہیں رکھتے تھے .... مرحوم علامہ شبلی

ان کی استعداد فرآنی سے تاحیات بہرہ اندوز ہوتے رہے اور عرب کے جیّد اور مفکر علماء اب تک اُن کی بے نظیر تصنیف "اِمعَانٌ فِی اَقْسَامِ الْقُرآن" کو حیرت اور استحسان کی نگاہوں سے دیکھ رہے ہیں[۱]۔

حضرت مولانا حمید الدین کے علمی فضل وکمال کی زندہ یادگار جناب مولانا امین احسن صاحب اور دوسرے اصلاحی علماء ہیں۔

حضرت مولانا کے چھوٹے بھائی رشید الدین صاحب بسلسلۂ تجارت بنارس میں مقیم تھے۔ زندگی کے آخری ایام میں حضرت مولانا ان کے پاس بنارس تشریف لائے تھے اور ہفتوں رہتے تھے، راقم الحروف کے رفقاء نے قرآنِ مجید کے درس کا ایک حلقہ قائم کر رکھا تھا، حضرت مولانا ہماری درخواست پر حلقۂ درس کو اپنی شرکت سے نوازتے، راقم الحروف رفقاء کے ساتھ حضرت مولانا کی قیام گاہ پر بھی حاضری دیتا۔ مدرسۃ الاصلاح جا کر بھی حضرت کی خدمت میں حاضر ہونے کی سعادت حاصل ہوئی مبارک تھیں زندگی کی وہ گھڑیاں جو اُس بابرکت ذات کی خدمت میں گزر گئیں اور حسرت ہے اُن لمحاتِ زندگی پر جو بنارس میں حضرت کی خدمت میں گزر آرجا سکے اس تعارف کے بعد مولانا کے افادات ملاحظہ کیجئے۔

---

[۱] رسالہ الاصلاح سرائے میر اکتوبر ۱۹۳۶ء۔

انبیائے کرام کا مقصدِ بعثت

قیام حکومتِ الٰہیہ

حضرت مولانا حمید الدین نے "سورۃ الکافرون" کی تفسیر کے شروع میں بتایا ہے کہ یہ سورہ کفار سے علیحدگی اور ترک تعلق کی سورہ ہے اس لئے اس کو سورۂ برأت کی طرح ہجرت اور جنگ کی سورہ سمجھنا چاہیئے۔ سورہ برأت فتح مکہ سے پہلے نازل ہوئی۔ اور اس کا نزول ہجرت سے پہلے ہوا، مکہ اور اس کے اطراف کے کفار نے حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت قبول نہ کی اور حضور کے قتل و اخراج کا ارادہ کیا تو اللہ تعالیٰ نے حضور کو برأت ہجرت اور جنگ کا حکم دے دیا۔

اس کے بعد حضرت مولانا نے بتایا ہے کہ انبیائے کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام کی بعثت کا مقصد کیا ہوتا ہے چنانچہ تحریر فرماتے ہیں۔

"انبیائے کرام کی دعوت و تبلیغ کے معاملے میں قانونِ الٰہی ہمیشہ سے یوں ہی رہا ہے۔ ایک مدت تک ان کو صبر و تحمل اور انتظارِ فتح و نصرت کا حکم دیا جاتا ہے کہ ممکن ہے سرکش طبیعتیں تسلیم قبول کی طرف مائل ہوں لیکن جب ان کی طرف سے برابر سرکشی کا اظہار ہوتا ہے اور سرکشی آہستہ آہستہ پیغمبر کے ارادۂ قتل و اخراج تک متعدی ہونے لگتی ہے تو خدا کا آخری حکم برأت، ہجرت، اور جنگ کے اعلان اور انتقام کے تازیانہ کے ساتھ نمودار ہوجاتا ہے۔ یہ

وقت ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے وعدے پورے ہوں ظالم ہلاک ہوں اور ان کی جگہ اہلِ ایمان خدا کی زمین میں متمکن ہوں یہی بعثت کی اصلی غرض ہے۔

کسی قوم میں کسی رسول کی بعثت کا زمانہ اس قوم کے بحران کا زمانہ ہوتا ہے۔ اور اس وقت تین حالتوں میں سے کوئی نہ کوئی حالت ظہور میں آجاتی ہے

(۱) پوری قوم اپنی شرارتوں کی پاداش میں ہلاک کر دی جاتی ہے صرف ایک مختصر جماعت نیکوکاروں کی بچ رہتی ہے اور یہی جماعت ہلاک ہونے والوں کی جگہ زمین کی وارث ہوتی ہے، حضرت نوح علیہ السلام اور اکثر انبیاء کی امتوں کے ساتھ یہی معاملہ پیش آیا۔

(۲) تباہی اور ہلاکت کی آخری منزلوں تک پہنچ کر یک بیک قوم پیغمبر کی دعوت سے چوکنی ہو جاتی ہے اور خدا کی رحمت اس کو اپنے سایہ میں لے لیتی ہے۔ حضرت ابراہیم حضرت داؤد، حضرت یوسف اور پیغمبر عالم علیہم الصلوٰۃ والتسلیم کی امتوں کے ساتھ یہی معاملہ پیش آیا۔

(۳) ایک امت تباہ کر دی جاتی ہے اور دوسری زندہ کی جاتی ہے حضرت موسیٰ اور پیغمبر عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت میں یہی معاملہ پیش آیا۔ حضرت یعقوب اور حضرت ابراہیم کی ذریت کے انتقام میں فرعون اور کسریٰ کی قومیں مٹا دی گئیں، قرآن مجید کی مختلف آیات میں اِن حقائق کی طرف اشارات کئے گئے ہیں سورہ یونس میں ہے۔

اِمّا نرینک بعض الذی نعدھم او نتوفینک فالینا مرجعھم ثم اللّٰہ شھید علیٰ ما یفعلون۔ ولکل امۃ رسول۔ فاذا جاء رسولھم قضی بینھم بالقسط۔ وھم لا یظلمون۔ ویقولون متی ھذا الوعد ان کنتم صٰدقین، قل لا املک لنفسی ضرا ولا نفعا الا ما شاء اللّٰہ۔ لکل امۃ اجل، فاذا جاء اجلھم فلا یستاخرون ساعۃ ولا یستقدمون ٥

"یا تو ہم جس چیز کی ان کو دھمکی دے رہے ہیں اس میں سے کچھ ہم تم کو دکھا دیں گے یا یہ ہوگا کہ ہم تم کو وفات دیں گے اور ان کا پلٹنا ہماری طرف ہوگا پھر اللہ اُن کے اعمال پر گواہ ہوگا۔ ہر امت کے لئے ایک رسول ہے جب ان کا رسول آجاتا ہے عدل کے ساتھ اُن کے درمیان فیصلہ کر دیا جاتا ہے، وہ کہتے ہیں کہ اگر تم سچے ہو تو بتاؤ تمھاری یہ دھمکی کب پوری ہوگی کہدو میں تو اپنی جان کے لئے بھی کسی نفع و نقصان کا مالک نہیں مگر جو اللہ چاہے، ہر اُمت کے لئے ایک اجل مُعیّن ہے جب ان کی اجل آجائے گی نہ ایک گھڑی پیچھے ہٹیں گے نہ ایک گھڑی آگے۔"

اس سے معلوم ہوا کہ انبیاء کی بعثت کا اصلی مقصد صرف یہ ہوتا ہے کہ جو امت صالح اور نیکو کار ہے وہ زندگی اور حیات کے ولولوں سے معمور ہو جائے۔ اور جو قوم راہِ حق و ہدایت سے ہٹ کر، گمراہیوں اور شرارتوں میں پڑ چکی ہے وہ تباہ ہو جائے اور یہ بات بالکل آپ سے آپ ظہور میں آتی ہے۔ سرکش اور نافرمان قوموں کا ہمیشہ سے یہ چلن رہا ہے۔ کہ جب ان کے پاس انبیاء آئے انھوں نے ان کی تکذیب کی قرآنِ مجید نے اُن کی اس حالت کی طرف جابجا اشارات کئے ہیں مثلاً :-

یٰحسرۃً علی العباد ما یاتیھم من رسول الا کانوا بہٖ یستھزؤن۔

"افسوس ہے بندوں پر، نہیں آیا ان کے پاس کوئی رسول مگر انھوں نے اس کے ساتھ استہزاء کیا"

دیکھئے حضرت مولانا حمید الدین نے انبیائے کرام کی دعوت تبلیغ کے متعلق قانونِ الٰہی کی کیا توضیح فرمائی ہے؟ اور انبیائے کرام کی بعثت کا کیا مقصد بیان فرمایا ہے؟ منکروں اور مفسدوں کی ہلاکت و تباہی اور اللہ کی زمین پر اللہ کے اُن فرمانبردار اور نیکوکار بندوں کا تمکن اور اقتدار جو انبیائے کرام کے لائے ہوئے قانون حیات کو نافذ کرتے ہیں۔ یہی ہے حکومتِ الٰہیہ۔

نصرتِ الٰہیہ کے ظہور کا قانون

حضرت مولانا حمید الدین تحریر فرماتے ہیں :

نصرتِ الٰہیہ کے ظہور کا بھی ایک قانون ہے وہ قانون یہ ہے

کہ اس کا ظہور اس وقت ہوتا ہے جب پیغمبر براءت کا اعلان کرکے کفار کو چھوڑ کر ہجرت کر جاتا ہے۔ نصرتِ الٰہیہ کے ظہور سے پہلے پیغمبر کے لئے ان مراحل سے گزرنا ناگزیر ہے۔ قرآنِ مجید نے جا بجا اس قانونِ الٰہی کی طرف اشارات کئے ہیں۔

ان الذین یحادون اللہ ورسولہ اولٰئک فی الاذلین کتب اللہ لاغلبن انا ورسلی۔ ان اللہ قوی عزیز۔ لاتجد قوما یومنون باللہ والیوم الاٰخر یوادون من حاد اللہ ورسولہ ولو کانوا اٰباءھم او ابناءھم او اخوانھم او عشیرتھم اولئک کتب فی قلوبھم الایمان وایدھم بروح منہ ویدخلھم جنٰت تجری من تحتھا الانھر خٰلدین فیھا رضی اللہ عنہ ورضوا عنہ۔ اولئک حزب اللہ الا ان حزب اللہ ھم المفلحون ہ

"بے شک جو لوگ اللہ کی اور اس کے رسول کی مخالفت کرتے ہیں وہی لوگ ذلیل ہونے والوں میں ہوں گے اللہ تعالیٰ نے لکھ دیا ہے کہ البتہ میں غالب رہوں گا اور میرے انبیاء، بے شک اللہ قوی اور غالب ہے، تم کوئی ایسی قوم نہیں پا سکتے جو اللہ پر اور یومِ آخر پر ایمان رکھتی ہو پھر ان لوگوں سے یارانہ رکھتی ہو جو اللہ اور اس کے رسول

کے مخالف ہیں اگرچہ ان کے باپ ہوں یا بیٹے ہوں یا
بھائی ہوں یا کنبہ وخاندان کے ہوں یہی لوگ ہیں کہ
اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں میں ایمان لکھ دیا ہے اور اپنی
جانب سے روح سے ان کی تائید فرمائی ہے اور ان
کو ایسے باغوں میں داخل کرے گا جن کے نیچے نہریں
جاری ہوں گی۔ اس میں ہمیشہ رہیں گے۔ اللہ ان سے
راضی ہوا اور وہ اللہ سے راضی ہوئے۔ یہی لوگ اللہ کی
جماعت ہیں اور یقیناً اللہ ہی کی جماعت کامیاب ہونے
والی ہے۔"

انبیاء کے غلبہ کے لئے جو قانون الٰہی ہے آیت میں پہلے اس کی طرف
اشارہ فرمایا پھر اس سنت برائت کا ذکر فرمایا جو مومنین کے لئے ناگزیر
ہے۔ اس کے بعد اپنے قانون کا حوالہ دیا کہ وہ مومنین کو بخشے گا اور
ان کو اپنی جماعت میں داخل کرے گا اور یہی لوگ کامیاب ہونگے
"انا ورسلی" میں "و" بیان کے لئے ہے۔ ان آیات میں بیان کیا
ہے کہ غلبہ اللہ کی جماعت کے لئے ہے اور اس جماعت ہی کا غلبہ اللہ
اور اس کے رسول کا غلبہ ہے۔ کیونکہ بعض انبیاء کو ان کی زندگی میں
غلبہ حاصل نہیں ہوا بلکہ ان کی موت ہجرت کی قائم مقام ہوئی موت
کے بعد اللہ تعالیٰ نے ان کے متبعین کو فروغ دیا۔ حضرت یحیٰے
علیہ السلام کے معاملہ میں یہی ہوا۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے متبعین
کو بھی ان کے اس دنیا سے چلے جانے کے بعد کامیابی حاصل ہوئی
اس سے معلوم ہوا کہ مومنین کا غلبہ درحقیقت رسول ہی کے غلبہ کا

ثمرہ ہے۔ قرآن مجید میں اس کے شواہد بہت ہیں۔ ایک جگہ فرمایا ہے:۔

انا لننصر رسلنا والذین آمنوا فی الحیوۃ الدنیا ویوم یقوم الاشہاد۔

ہم اپنے رسولوں کو اور ان لوگوں کو جو اُن پر ایمان لائے دنیا کی زندگی میں غالب کریں گے اور اُس دن جس دن گواہ کھڑے کریں گے۔

یہاں بھی "و" بیان کے لئے ہے تاکہ یہ واضح ہو جائے کہ مومنین کا غلبہ رسول کا غلبہ ہے اور رسول کا غلبہ اللہ کا غلبہ ہے یہی "لاغلبن انا ورسلی" کی صحیح تاویل ہے۔

حضرت مولانا حمید الدین نے اوپر جو کچھ تحریر فرمایا ہے اُس پر غور کیجئے۔ ہر نبی کی بعثت و دعوت کو حاکمانہ غلبہ و اقتدار عطا فرمانا اللہ تعالیٰ کا ایک ایسا قانون ہے جو وجود میں آئے بغیر نہیں رہتا۔ یہ قانون کبھی براہِ راست نبی کے غلبہ و اقتدار کی صورت میں نمودار ہوتا ہے کبھی اُن کے متبعین کی فتح و کامرانی کی صورت میں اور کسی نبی کے متبعین کا غلبہ واقتدار بھی اللہ و رسول ہی کا غلبہ و اقتدار ہوتا ہے دیکھئے یہ کتنی کھلی ہوئی حقیقت ہے حکومت الٰہیہ کی۔

یہاں ایک اور اہم حقیقت قابلِ غور ہے۔ (۱) ہر نبی کی بعثت کے لئے حاکمانہ غلبہ و اقتدار لازمی ہے۔ اور حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کسی خاص ملک و قوم اور کسی خاص زمانے تک محدود نہیں ہے حضور کا مادی جسم دنیا میں موجود نہیں لیکن حضور

کی دعوت باقی ہے اور وہ تمام جہان کے لئے قیامت تک باقی رہے گی۔ اس لئے جس زمانے میں بھی حضورؐ کی دعوت غالب اور فتحمند نہ ہو حضورؐ کے متبعین کا فرض ہے کہ وہ حضورؐ کی دعوت کو لے کر اٹھیں اور اُسے غالب و فتحمند بنانے کے لئے جدوجہد کریں۔

(۲) اگر کسی زمانے میں کوئی جماعت حضورؐ کی دعوت کو غالب اور فتحمند بنانے کے نصب العین کو لے کر اُٹھی ہو اور وہ کامیاب نہ ہوئی ہو تو اُس کے یہ معنی نہیں کہ وہ نصب العین غلط تھا بلکہ یہ سمجھا جائے گا کہ اس جدوجہد میں وقت اور حالات کے اعتبار سے کوئی نقص باقی رہ گیا ہوگا۔

(۳) جب ہر نبی کی دعوت کو غلبہ و اقتدار عطا فرمانا اللہ کا قانون ہے تو جس زمانے اور جس ملک میں بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت غالب نہ ہوگی اُسے غالب کرنے کے لئے آنحضرتؐ کے نقش قدم پر صحیح اور کامل جدوجہد کی جائے گی۔ گزشتہ جماعت کو غلبہ و اقتدار حاصل نہ ہونے کے باوجود موجودہ جماعت کو اس طرح غلبہ و اقتدار حاصل ہوگا جس طرح بعض انبیاء کرام کی حیات کے بعد ان کے متبعین کو غلبہ و اقتدار حاصل ہوا۔

(۴) اگر یہ دوسری جماعت بھی اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہو تو مسلمانوں کے لئے پھر بھی اس جدوجہد سے کنارہ کشی جائز نہ ہوگی ان میں سے تیسری جماعت کو کھڑا ہونا پڑے گا تا آنکہ حضورؐ کی دعوت غالب ہو جائے آیۂ کریمہ هو الذی ارسل رسوله بالهدیٰ ودین الحق لیظهره علی الدین کله بھی

اسی حقیقت کی جانب رہنمائی کرتی ہے۔

بعض لوگ دیکھتے ہیں کہ ایسے انبیائے کرام بھی گزرے ہیں جن کو حاکمانہ قوت و شوکت حاصل نہ تھی تو ان کو اس بات میں شبہ ہوتا ہے کہ انبیائے کرام کی بعثت و دعوت کے لئے غلبہ و اقتدار لازمی ہے حضرت مولانا حمید الدین کی مندکرہ صدر تحقیقات سے ایسے لوگوں کا شبہ دور ہو جائے گا۔

قرآن کریم میں ایک اور حقیقت بھی ملتی ہے جو اس شبہے کے جواب میں پیش کی جاسکتی ہے۔ دوسرے پارے کے آخر میں طالوت اور جالوت کی جنگ کا واقعہ مذکور ہے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بعد اپنی ناکردنیوں سے بنی اسرائیل عمالقہ کی دست برد سے غلامی میں مبتلا ہو گئے تھے۔ عمالقہ نے بنی اسرائیل پر حملہ کر کے ان کے بڑے حصے کو محکوم و غلام بنا لیا تھا بنی اسرائیل نے عمالقہ سے انتقام لینا اور اپنی قوم کو اُن سے آزاد کرانا چاہا تو انھوں نے اپنے وقت کے نبی سے درخواست کی کہ وہ اُن کے لئے ایک بادشاہ مقرر کر دیں جس کے زیر علم وہ عمالقہ سے جہاد کریں چنانچہ وحی الٰہی کے مطابق نبی نے جالوت کو بنی اسرائیل کا بادشاہ مقرر کر دیا اس کی قیادت میں بنی اسرائیل عمالقہ سے لڑے اور فتحمند ہوئے درآنحالیکہ عمالقہ کے مقابلے میں بنی اسرائیل محض مٹھی بھر تھے یہ واقعہ اس آیت سے شروع ہوتا ہے:۔

الم تر الى الملا من بنى اسرائيل من بعد موسى اذ قالوا لنبى لهم ابعث لنا ملكا

تقاتل فی سبیل اللہ۔

(اے رسول) کیا تم نے بنی اسرائیل کی ایک
جماعت کے جو موسیٰ کے بعد گزری تھی اس واقعہ پر غور
نہیں کیا جب اُس نے اپنے نبی سے درخواست کی
کہ ہمارے لئے ایک بادشاہ مقرر کر دو تاکہ ہم خدا کی
راہ میں جنگ کریں۔

اس واقعہ کے تحت میں صاحب تفسیر مواہب الرحمٰن لکھتے ہیں۔
"بنی اسرائیل کا کام اسی طرح سنورتا تھا کہ وہ لوگ اپنے بادشاہ
کے حکم پر متفق ہوتے تھے اور ان کے بادشاہ ان کے نبی کے حکم
کے مطیع ہوتے تھے، پس بادشاہ ہی ان کی جماعتوں کو لے کر چلتا
اور نبی اس کو شرع کی بات بتلاتا جاتا اور جو بات راہ کی ہوتی اس
سے اس کو آگاہ کرتا اور وحی الٰہی سے اس کو خبردار کرتا رہتا تھا"۔
اوپر کا واقعہ خود اس صورتِ حال کا موئید ہے، لہٰذا
انبیائے کرام کی دعوت کے غلبہ و اقتدار کی ایک صورت یہ بھی تھی

نصرتِ الٰہیہ کا ظہور کاروبارِ نبوت کی پہلی منزل نصح و دعوت
اور صبر ہے، اس کے بعد برأت
و ہجرت کی منزل آتی ہے اور سب سے آخر میں فتح و کامرانی کی
اللہ تعالیٰ کا یہ معاملہ صرف آنحضرت صلعم کے ساتھ مخصوص نہیں
رہا۔ یہ اس کا ایک عام قانون ہے جو تمام انبیاء بلکہ تمام خلق کے لئے
یکساں ظاہر ہوا ہے، قرآنِ مجید کی متعدد آیات میں اس کی طرف
اشارات ہیں بعض سورتوں میں یہ چیز عمود کی حیثیت رکھتی ہے

اور بعض میں اس کا ذکر نہایت اہتمام سے ہوا ہے۔ سورہ اعراف، ہود، یوسف اور نحل میں اس کی تفصیلات موجود ہیں ہم صرف بعض جامع آیات کے ذکر پر اکتفا کریں گے۔ سورۂ بنی اسرائیل میں ہے۔

وان کادوا لیستفزونک من الارض لیخرجوک منھا واذا لا یلبثون خلافک الا قلیلا۔ سنۃ من قد ارسلنا قبلک من رسلنا ولا تجد لسنتنا تحویلا۔

قریب تھا کہ تجھ کو اس زمین سے گھبرا دیں تا کہ تجھ کو اس سے نکال دیں اور اس وقت تیرے بعد وہ بھی اس میں بہت کم ہی رہتے یہ ہمارا قانون رہا ہے ان انبیاء کے ساتھ جو تم سے پہلے ہم نے بھیجے اور نہ ہی ہمارے قانون میں تبدیلی پاؤ گے۔

دوسری جگہ فرماتا ہے۔

حتیٰ اذا استیئس الرسل وظنوا انھم قد کذبوا جاءھم نصرنا۔

یہاں تک کہ جب انبیاء مایوس ہو گئے اور کفار نے گمان کر لیا کہ ان کو جو دھمکیاں دی گئی ہیں جھوٹ ہیں ہماری مدد ان کے پاس آ گئی۔

اس سے معلوم ہوا کہ جب پیغمبر ہجرت کرتا ہے احتساب کی گھڑی آن پہنچتی ہے اس وقت اسلام غالب ہوتا ہے اور کفر ہزیمت اٹھاتا ہے، یہی اللہ تعالیٰ کا قانون ہے۔"

سورۂ ابراہیم کی ایک طویل آیت پیش کرنے کے بعد مولانا تحریر فرماتے ہیں۔

"انبیاء کے ساتھ جو معاملات پیش آتے ہیں۔ ان آیات میں ان کی تفصیل کردی گئی ہے اس خاص معاملہ میں جو سنّتِ الٰہیہ جاری و نافذ ہے اس کو سمجھنے کے لئے ان آیات کو پیش نظر رکھو، انبیاء کا دستور یہ ہے کہ وہ توحید کی دعوت دیتے ہیں، توبہ کی منادی کرتے ہیں مغفرت کا اعلان کرتے ہیں اور ساتھ ہی ساتھ اپنی بندگی اور بیچارگی کا بھی اعلان کرتے ہیں کہ اللہ کے بھروسہ کے سوا کوئی چیز نہیں ہے جس پر ان کا اعتماد ہو کفار اس کے جواب میں ان کو طرح طرح کی ایذائیں دیتے ہیں توحید کا انکار کرتے ہیں، وعدۂ قیامت کا مذاق اڑاتے ہیں اور بالآخر پیغمبر کو ملک سے نکال دینے پر کمربستہ ہو جاتے ہیں جب یہ سب کچھ ہو لیتا ہے تو پیغمبر دعا کے لئے ہاتھ اٹھاتا ہے اس وقت اللہ کی مدد ظہور میں آتی ہے ظالم ہلاک ہوتے ہیں اور اہلِ ایمان اُن کی جگہ زمین کے وارث ہوتے ہیں!"

ظالموں اور فتنہ پردازوں کی ہلاکت و تباہی کے بعد اُن کی جگہ اہلِ ایمان کا وارثِ زمین ہونا ہی حکومتِ الٰہیہ کا قیام ہے، کیونکہ اہلِ ایمان اسی لئے تو ہر طرح کی جدوجہد اور قربانی کرتے ہیں کہ زمین پر خدا کے بھیجے ہوئے قوانین کا اجراء ونفاذ ہو، چنانچہ عنانِ اقتدار کے ہاتھ میں لیتے ہی وہ اپنے حلقۂ اقتدار میں قوانینِ الٰہی نافذ کردیتے ہیں۔

حضرت مولانا حمید الدین کے یہ افادات اُن کی تفسیر "سورۃ الکافرون" مترجمہ مولانا امین احسن سے لئے گئے ہیں، اب آئیے سورۂ والعصر کے افادات ملاحظہ کیجئے۔

حکومت الٰہیہ کا قیام مسلمانوں پر واجب ہے

والعصر ان الانسان لفی خسر الا الذین آمنو وعملو الصّٰلحٰت وتواصوبالحق وتواصوابالصبر

" زمانہ گواہی دیتا ہے کہ آدمی گھاٹے میں ہے مگر وہ جو ایمان لائے اور بھلائیاں کیں اور ایک دوسرے کو حق کی نصیحت کی اور ایک دوسرے کو صبر کی نصیحت کی "

سورہ کے اجمالی مفہوم کے بیان لفظ عصر کی تحقیق اور زمانے کی قسم کھانے کے وجوہ بتانے کے بعد فرماتے ہیں ۔

" انسانوں کی عام نامرادی بیان کرنے کے بعد ان لوگوں کی خصوصیات بیان کیں جنھوں نے اس حیات چند روزہ کے بدلے میں ابدی مسرت وکامیابی حاصل کی ان لوگوں کی تین خصوصیتیں بیان ہوئی ہیں۔ ایمان، عمل صالح، تواصی۔ ان تین صفتوں نے اپنے اندر دنیا و آخرت کی تمام بھلائیاں سمیٹ لی ہیں۔ جو لوگ اس کلام پر غور کریں گے وہ پائیں گے کہ باوجود غایت ایجاز ان الفاظ کی وسعت کا یہ عالم ہے کہ نیکی اور بھلائی کی قسم کی کوئی بات ان کے دائرے سے باہر نہیں رہ گئی ہے۔ ایمان تمام عقائد کا شیرازہ ہے۔ عمل صالح تمام شرائع کا مجموعہ ہے اور تواصی ایک مرتبہ کمال وفضیلت ہے

جو اللہ تعالیٰ نے اس امت کے لیئے مخصوص فرمایا اور اس امت میں سے بھی خاص طور پر ان لوگوں کے لیئے جو ائمہ ہیں کیونکہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی اصلی ذمہ داری انہی پر ہے۔

اس تواصی کے ذریعہ اللہ تعالیٰ نے اس امت کی شیرازہ بندی فرمائی اور ان کو اختلاف و نزاع کے تمام خطروں سے محفوظ کر کے بھائی بھائی بنا دیا، جب تک امت کے اندر نظام باقی رہا اس کے قدم برابر ترقی کی راہوں میں بڑھتے رہے جیسا کہ اوائل خلافت میں ہم دیکھتے ہیں لیکن جب یہ نظام درہم برہم ہو گیا دفعۃً بڑھتے ہوئے قدم رک گئے۔ قرآنِ مجید کی آیتِ ذیل میں اس فریضہ کی تفصیل کی گئی ہے۔

یا ایہا الذین آمنوا اتقوا اللہ حق تقاتہ
ولا تموتن الا وانتم مسلمون۔
واعتصموا بحبل اللہ جمیعا ولا تفرقوا
واذکروا نعمۃ اللہ علیکم اذ کنتم
اعداء فالف بین قلوبکم فاصبحتم
بنعمۃ اخوانا وکنتم علی شفا
حفرۃ من النار فانقذکم منہا
کذلک یبین اللہ لکم آیاتہ لعلکم
تہتدون، ولتکن منکم امۃ یدعون
الی الخیر ویامرون بالمعروف
وینہون عن المنکر واولئک ہم

المفلحون ۔ ولا تکونوا کالذین تفرقوا
واختلفوا من بعد ما جاءهم البینت
واولئك لهم عذاب عظیم......
الی قوله تعالیٰ......کنتم خیر امة
اخرجت للناس تامرون بالمعروف
وتنهون عن المنکر وتؤمنون باللہ

اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو جیسا کہ اس سے
ڈرنے کا حق ہے اور نہ مرو تم مگر اس حالت میں کہ مسلم
ہو اور اللہ کی رسی سب متحد ہو کر مضبوط پکڑو اور متفرق
نہ ہو اور اللہ کے فضل کو اپنے اوپر یاد کرو جب تم باہم
ایک دوسرے کے دشمن تھے تو اللہ نے تمھارے
دلوں کو باہم جوڑا اور تم اس کے فضل سے بھائی بھائی
بن گئے، اور تم آگ کے گڑھے کے کنارے کھڑے
تھے تو اللہ نے اس سے تم کو بچایا اس طرح اللہ اپنی آیتیں
کھول کھول کر بیان کرتا ہے تاکہ تم ہدایت پاؤ اور چاہئے
کہ تم میں سے ایک امت دعوت الی الخیر امر بالمعروف
اور نہی عن المنکر کے لئے ہو اور وہی لوگ فلاح پانے
والے ہوں گے، اور اُن لوگوں کی طرح نہ ہو جاؤ جو متفرق
ہو گئے۔ اور کھلی کھلی نشانیاں پانے کے بعد انھوں نے
اختلاف کیا یہی لوگ ہیں جن کے لئے عذاب عظیم ہے
...... تم بہترین امت ہو جو لوگوں کی ہدایت کے لئے

اٹھائے گئے ہو تم نیکی کا حکم دو گے برائی سے روکو گے اللہ پر ایمان لاؤ گے۔

اس آیت سے معلوم ہوا کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر اس امت کے مہمات فرائض میں سے ہے۔ چنانچہ اس کے متعلق دوسری آیات بھی وارد ہیں لیکن یہ امر واضح ہے کہ اس کی اصلی ذمہ داری جیسا کہ ولتکن منکم امۃ سے متبادر ہوتا ہے صرف امراء امت پر ہے البتہ تواصی ایک فرض عام ہے جس میں تمام مسلمان برابر کے شریک ہیں اس سے معاملہ کی اصل حقیقت سامنے آتی ہے کہ مسلمانوں کو اپنی ذمہ داری سے عہدہ برآ ہونے کے لئے ضروری ہے کہ وہ پہلے عمل صالح کریں پھر ادائے حقوق کے معاملہ میں ایک دوسرے کی مدد کریں اور چونکہ ادائے حقوق بغیر خلافت و سیاست کے ناممکن ہے اس لئے ضروری ہے کہ خلافت قائم کریں اور خلافت کا قیام چونکہ اطاعت پر منحصر ہے اس لئے ضروری ہے کہ ان کے اندر اطاعت بھی موجود ہو۔"

حکومت کے مستحق مومنین صالحین ہیں

حضرت مولانا فراہی رحمۃ اللہ علیہ عمل صالح کی حقیقت اس طرح سمجھاتے ہیں:۔

"اللہ تعالیٰ نے اعمال حسنہ کو "صالحات" کے لفظ سے تعبیر فرمایا ہے جس سے ایک عظیم الشان حکمت کی طرف رہنمائی ہوتی ہے کہ در حقیقت انسان کی تمام ظاہری و باطنی دینی و دنیاوی شخصی

و اجتماعی جسمانی وعقلی صلاح وترقی کا ذریعہ اعمال حسنہ ہیں یعنے عمل صالح وہ عمل ہوا جو انسان کی زندگی اور نشو ونما کا سبب ہو اور اللہ تعالیٰ نے اس کی فطرت میں جو صلاحیتیں ودیعت کی ہیں ان کے مطابق وہ عروج ترقی کے اعلیٰ مدارج تک پہنچ جائے۔ یہی چیز انسان کے غایتِ وجود کو پورا کرتی ہے اور اسی سے وہ درجہ کمال تک پہنچتا ہے۔ فطرتِ انسان سے یہی چیز مراد ہے۔

ولقد خلقنا الانسان فی احسن تقویم

اور ہم نے انسان کو بہترین ساخت پر بنایا۔

اور آیتِ ذیل میں عبادت سے یہی چیز مقصود ہے:-

وما خلقت الجن والانس الا لیعبدون

اور میں نے نہیں پیدا کیا جنوں اور انسانوں کو مگر تاکہ میری عبادت کریں۔

عبادت یعنے طاعتِ الٰہی جس پر تمام شخصی واجتماعی صلاح وفلاح کا دارومدار ہے۔ اس نکتہ کو دوسرے لفظوں میں یوں سمجھ سکتے ہیں کہ انسان کائنات کی اس مجموعی مشین کا ایک پُرزہ ہے۔ اس لئے اس کے اعمال میں سے صالح اعمال صرف وہی ہوں گے جو اللہ تعالیٰ کی اس حکمت وتدبیر کے موافق ہوں جو اس نے اس کلی نظام کے لئے پسند فرمائی ہے کیونکہ خدا نے اس دنیا کو عبث نہیں بنایا ہے ایک خاص نظام حکومت ہے جو اس پورے کارخانے میں جاری ہے اور اللہ تعالیٰ کی مرضی یہ ہے کہ اس کائنات کے اندر جو کچھ ہو اس نظامِ حکمت کے ماتحت ہو۔ اس سے الگ ہو کر نہ ہو۔

اور یہ جو تم اس کائنات کے ہر گوشہ میں ایک کشمکش اور تصادم

دیکھ رہے ہو تو یہ بھی درحقیقت اس کائنات کی ترقی اور نشوونما ہی کے لئے ہے۔ یہ تغیر و تحول کا سلسلہ ہے جو ہر پرانی حالت کو ایک نئی حالت سے بدل رہا ہے تاکہ یہ نظام اپنی حالت پر قائم رہ سکے۔

قرآن مجید میں صاف تصریح ہے کہ انسان کا ارتقا عمل صالح پر مبنی ہے۔ اور تمام عالم اللہ تعالیٰ کی تدبیر سے ایک خاص حکمت کی طرف جا رہا ہے

الیہ یصعد الکلم الطیب والعمل الصالح
یرفعہ والذین یمکرون السیٔات
لھم عذاب شدید ومکر اولئک
ھو یبور

اسی کی طرف عروج پاتا ہے کلام طیب اور وہ عمل صالح کو رفعت بخشتا ہے (انسان کا یہ عروج عمل صالح اور اس غایت حسن کا نتیجہ ہے جو اس کائنات کی خلقت سے اللہ تعالیٰ کا منشا ہے) اور جو لوگ برائی کی سازشیں کرتے ہیں ان کے لئے سخت عذاب ہے اور ان لوگوں کی تدبیر نامراد ہوگی (کیونکہ بری تدبیریں اس حق کے خلاف ہیں جو کائنات کی اصلی روح ہے اس لئے جو کوشش اس کے ابطال کے لئے ہوگی اللہ تعالیٰ اس کو فروغ نہ دیگا کیونکہ اس کائنات کی تخلیق کا منشا درحقیقت ایک عظیم الشان غایت و حکمت ہے جس کا نام قرآن مجید کی اصطلاح میں "حق" ہے)

اس تفصیل کے بعد یہ حقیقت اچھی طرح کھل گئی کہ زمین کی وراثت صالحین کے لئے کیوں مخصوص ہوئی مفسدین اس غایت کے خلاف چلتے ہیں جو اس عالم کی تخلیق کا منشاء ہے اور صالحین اس روش پر چلتے ہیں جو صحیح منزل مقصود پر پہنچاتی ہے اس لئے فرمایا والذین امنوا وعملوا الصلحت لندخلنهم فی الصالحین۔

جو لوگ ایمان لائے اور بھلائیاں کیں البتہ ہم ان کو داخل کریں گے صالحین میں ۔

یعنے صلحاء کے زمرہ میں جو درحقیقت انبیاء صدیقین اور شہداء کا زمرہ ہے ۔

قرآن مجید اور اگلے صحیفوں میں مفسدین کی ہلاکت اور صالحین کی برکت کا ذکر اکثر آیا ہے ۔

ولقد کتبنا فی الزبور بعد الذکر
ان الارض یرثها عبادی الصالحون
ان فی هذا البلاغ لقوم عابدین ہ

اور ہم نے زبور میں ذکر کے بعد لکھدیا ہے کہ زمین کے وارث ہمارے صالح بندے ہوں گے ، بے شک اس میں پیام (خوشخبری) ہے عبادت کرنے والی قوم کے لئے ۔

"عبادت کرنے والی قوم" یعنے وہ قوم جو اللہ تعالی کے احکام کی تابعدار ہو کیونکہ تمام صلاح وتقویٰ کی جڑ جیسا کہ معلوم ہوچکا ہے

نافرمان شخص صرف اپنا ہی دشمن نہیں ہوتا بلکہ تمام خلق کا دشمن ہوتا ہے۔ اس کے پیشِ نظر صرف اپنا نفس ہوتا ہے اس لیئے وہ شرائع وحدود کو نہایت نفرت کی نظر سے دیکھتا ہے اور نہیں جانتا کہ اسکی بہبود درحقیقت سب کی بہبود سے وابستہ ہے۔ باقی رہے صالحین تو وہ زمین کے نمک ہیں تمام عالم کی اصلاح وترقی انہی کے دم سے ہے وہ جو کچھ سوچتے اور کرتے ہیں تمام عالم کے لئے کرتے ہیں اور صرف اپنے ابنائے زمانہ ہی کے لئے نہیں کرتے بلکہ ان نسلوں کے لئے بھی کرتے ہیں جو اُن کے بعد آئیں گی اور یہی وجہ ہے کہ وہ وراثتِ عالم اور خلافتِ الٰہیہ کے مستحق ہوتے ہیں۔"

حق کا قیام مسلمانوں کیلئے لازمی ہے

حق وصبر کی توضیح کرتے ہوئے حضرت مولانا فراہی تحریر فرماتے ہیں۔

"حق وصبر کی حیثیت درحقیقت دو عظیم الشان پہاڑوں کی ہی جن پر شریعت غرائے اسلامیہ کے ستون اور اس ملکوت اللہ کے ارکان قائم ہیں۔

اوپر گزر چکا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آسمان وزمین کو حق کے ساتھ پیدا کیا ہے۔ حق یعنے عدل وحکمت چنانچہ فرمایا :۔

لو اتبع الحق اھواءھم لفسدت السمٰوات والارض۔

اگر حق ان کے خواہشوں کی پیروی کرتا تو آسمان و زمین دونوں درہم برہم ہو جاتے۔

یہی وجہ ہے کہ جب خدا زمین کی خلافت اور نبوت وشریعت کی

نعمت کسی قوم کو بخشتا ہے تو اس کے لئے سب سے پہلی شرط یہ ہوتی ہے کہ وہ قوم حق کی اطاعت کرنے والی اور قسط کو قائم کرنے والی ہو چنانچہ فرمایا ہے۔

یاایھا الذین آمنوا کونوا قوامین بالقسط شھداء للہ ولو علی انفسکم

اے ایمان والو! عدل کے قائم کرنے والے بنو، اللہ کے لئے گواہی دیتے ہوئے (یعنی قسط کی گواہی) اگرچہ تمہارے خلاف ہو۔

قسط سے مراد حق ہے اور علم و عمل دونوں سے اس کا تعلق ہوتا ہے چنانچہ فرمایا:-

واولوا العلم قائما بالقسط۔ دوسری جگہ فرمایا۔ والحکم بینھم بالقسط ایک جگہ ہے قل امر ربی بالقسط۔ والذین یامرون بالقسط پھر فرمایا۔ یھدون بالحق وبہ یعدلون۔ اسی طرح وقال رب احکم بالحق۔ ثم یفتح بیننا بالحق، فاحکم بیننا بالحق واللہ یقضی بالحق۔

ان آیات سے معلوم ہوا کہ حق کا قیام اللہ تعالیٰ نے ہمارے لئے لازمی فرمایا ہے کیونکہ اس نے آسمانی بادشاہت کی بنیادیں اسی بناء پر قائم کی ہیں

یاداؤد انا جعلنٰک خلیفۃ فی الارض فاحکم بین الناس بالحق ولا تتبع الھوٰی

فیضلک عن سبیل اللہ ان الذین یضلون عن سبیل اللہ لھم عذاب شدید بما نسوا یوم الحساب ۔ وما خلقنا السماء والارض وما بینھما باطلا ذلک ظن الذین کفروا ۰

اے داؤد! ہم نے تم کو زمین میں خلیفہ بنایا ہے پس لوگوں کے درمیان حق کے ساتھ فیصلہ کرو (یعنے قسط کے ساتھ) اور خواہش کے پیچھے نہ چلو (کیونکہ یہ حق کے راستہ سے انحراف ہے) کہ تمھیں اللہ کے راستہ سے ہٹادے (اس آسمانی بادشاہت کے راستے سے جس کے تم اللہ تعالیٰ کی طرف سے خلیفہ مقرر کیئے گئے ہو) بیشک جو لوگ اللہ کے راستے سے بھٹک جاتیں گے ان کے لئے سخت عذاب ہے بوجہ اس کے کہ انھوں نے حساب کے دن کو فراموش کردیا (حساب کا دن یعنے ظالموں کے بدلہ پانے کا دن) اور ہم نے نہیں پیدا کیا آسمان اور زمین کو اور جو کچھ ان کے درمیان ہے باطل (پھر اپنی مخلوق کے لئے کیسے پسند کرسکتا ہوں کہ وہ حق کے راستے سے منحرف ہوجائے) یہ (یعنے آسمان وزمین کا بے مقصد اور باطل ہونا) ان لوگوں کا گمان ہے جنھوں نے کفر کیا (یعنی اللہ تعالیٰ کی پروردگاری کا انکار کیا ۔

حکومتِ الٰہیہ کی تکمیل کی راہ

اس تفسیر کے آخر میں مولانا فراہی رحمۃ اللہ علیہ نے حکومتِ الٰہیہ کی تکمیل کی راہ بتائی ہے ارشاد فرماتے ہیں ۔

"اگر قوموں کی تاریخ پر غور کروگے تو دو باتیں نہایت صاف نظر آئیں گی ایک یہ کہ خدا کا قانونِ عدل ہر گوشہ میں جاری و نافذ ہے اور ہر معاملہ کی آخری ہر کروٹ حق کی طرف ہوتی ہے ۔

بل نقذف بالحق على الباطل فيدمغه دوسری یہ کہ اللہ تعالیٰ کا قانون بندوں کے معاملہ میں نہایت حلیم ہے وہ ان کو آخری حد تک مہلت دیتا ہے تاکہ جو کچھ ان کو بخشا ہے اس میں پوری طرح آزمالے کہ وہ کونسی راہ اختیار کرتے ہیں ۔ ان لوگوں کی جنھوں نے کفرانِ نعمت کیا اور تباہ ہوئے یا ان لوگوں کی جنھوں نے شکر کیا اور اطاعت کی راہ پر چل کر منزلِ مقصود کو پہنچے فرمایا۔

ولقد اهلكنا القرون من قبلكم لما ظلموا وجاءتهم رسلهم بالبينات وما كانوا ليومنوا كذلك نجزي القوم المجرمين ثم جعلناكم خلائف في الارض لننظر كيف تعملون ؟

اور ہم نے بہت سی قوموں کو تم سے پہلے ہلاک کیا انھوں نے ظلم کیا اور آچکے ان کے پاس ان کے رسول کھلی کھلی نشانیاں لے کر نہیں تھے ایمان لانے والے

اور ایسے ہی ہم بدلہ دیتے ہیں مجرم قوم کو۔ پھر ہم نے بنایا
تم کو جانشین ان کا زمین میں تاکہ دیکھیں تم کیسا عمل کرتے ہو۔

اور حلم اور صبر دونوں کی اصل ایک ہی ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ صبر
حق کی بنیاد ہے پس اگر اللہ تعالیٰ عذاب میں جلدی فرمائے تو وہ حکمت
باطل ہو جائے گی جس کو وہ ظاہر فرمانا چاہتا ہے اور وہ حق ظہور میں
نہ آسکے گا جو اس تمام کائنات کا خلاصہ ہے۔ چنانچہ فرمایا ہے۔

وھو الذی یخرج الخبء فی السمٰوٰت
والارض۔

یعنے زمین اور آسمان کی فطرت کے اندر جو مصالح و حکم ودیعت
ہیں ان کو ظاہر فرماتا ہے۔ اس پر ایک حد تک چھٹی اور بارھویں فصل
میں ہم روشنی ڈال چکے ہیں اس لئے مزید تفصیل کی ضرورت نہیں ہے۔
حق اور حلم دونوں کے مزاج میں کس قدر نمایاں تفاوت ہے
ایک سرتا پا سخت گیری اور احتساب کا مظاہرہ ہے دوسرا یکسر
عفو و درگزر کی خاموشی لیکن اس کے باوجود تم نے دیکھ لیا کہ یہ دونوں
اس طرح ساتھ ساتھ نمودار ہوتے ہیں گویا دونوں بالکل توأم ہیں
اور اللہ تعالیٰ نے ہم کو ان دونوں کا حکم ایک ساتھ فرمایا تاکہ ایک
ہی وقت میں ہمارے لئے ہماری باطنی و ظاہری اخلاق کی اصلاح
کے دروازے بھی کھول دے اور زمین کی وراثت اور آسمان
کی تمام نعمتیں و برکتیں بھی بخش دے اور ہم اس راہ پر گامزن
ہو جائیں جو بندگی اور خلافت الٰہیہ کی تکمیل کی راہ ہے اور جو ہمارے
اس پروردگار نے کھولی ہے جو عدل اور عفو کو پسند کرتا ہے اور

انہیں کے ذریعہ اس کائنات کا انتظام فرماتا ہے۔"

حضرت مولانا فراہی رحمتہ اللہ علیہ کے افادات کے آخر میں اس قدر واضح کر دینا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ آپ کا زمانے کے سیاسی و اجتماعی ہنگاموں سے کوئی تعلق نہ تھا۔ آپ قرآن مجید پر خالص قرآنی روشنی میں غور و فکر فرماتے تھے چنانچہ اوپر مولانا کے جو افادات پیش کئے گئے ہیں وہ آپ کے بے لوث قرآنی غور و مطالعہ کا نتیجہ ہیں۔

حضرت مولانا ابوالکلام آزاد کے افادات

تعارف

حضرت مولانا ابوالکلام آزاد جن فضائل واوصاف سے بہرہ ور ہیں وہ صدیوں کے بعد کسی قوم کے فرد واحد میں جمع ہوا کرتے ہیں، وہ اپنی عظمتِ علم، شوکتِ تحریر و تقریر اور اپنی استقامتِ عمل کے اعتبار سے جس بلند مقام پر فائز ہیں اس میں کوئی اُن کا ہمسر نہیں، مولانا کی اولین دعوت کیا تھی؟ وہ کس عقیدے و عمل کے پیغام کے ساتھ مسلمانوں سے روشناس ہوئے؟ اس سوال کا جواب مولانا کے موجودہ موقف اور ان کے موجودہ پیغام و عمل سے نہیں مل سکتا اس کے لئے ہمیں ربع صدی سے بھی کچھ زیادہ پیچھے ہٹنا پڑے گا اور اس مقام کی طرف دیکھنا پڑے گا جہاں کھڑے ہو کر اول اول مولانا نے اپنا ایمان افروز اور روح پرور پیغام سنایا تھا، اور اللہ کی کتاب کو ہاتھوں میں لے کر مسلمانوں

کو پکارا تھا۔ کہ

"مسلمانو! او منزل نا آشنا مسلمانو! او گم کردہ راہ مسلمانو! او بے بصیرتو! او ظلمت کو نور، ضلالت کو ہدایت اور ذلت وخواری کو عزت و برتری سمجھنے والے مسلمانو! تم کدھر جا رہے ہو؟ کن لوگوں کے پیچھے چلے جا رہے ہو؟ تمھاری منزل اس طرف نہیں ہے جس طرف تم گام زن ہو، تمھاری راہ وہ نہیں جس پر تم چل رہے ہو، تمھارے رہنما وہ نہیں جن کی تم پیروی کر رہے ہو، خبردار! خبردار! تم ان کے پیچھے چل کر کبھی اپنی منزلِ مقصود پر نہیں پہنچ سکتے۔ سنو! سنو! اگر تم اسی راہ پر چلتے رہے تو منزل کے ساتھ تم خود بھی کھو جاؤ گے، اِدھر آؤ اِدھر میری سنو! میں بتاؤں کہ تم کس منزل کے رہرو ہو! اور تمھارا امام کون ہے! اور تم کس کی پیروی کرکے اپنی عروسِ منزل سے ہم آغوش ہو سکتے ہو، یہ دیکھو میرے ہاتھ میں اللہ کا سچا اور پاک کلام ہے، یہ تمھارا امام اور تمھارا چراغِ راہ ہے، تم اس کی پیروی کرکے اور اسی کتاب کی روشنی میں چل کر اپنی منزل پہ پہنچ سکتے ہو، تم پیروی کے لئے پیدا نہیں ہوئے ہو تمھارا منصب امامت و قیادت ہے اور یہ منصب تمھیں اسی وقت حاصل ہو سکتا ہے جب تم قرآنِ کریم کو اپنا رہنما اور چراغِ راہ بناؤ، یاد رکھو جو مسلمان کسی عمل و اعتقاد کے لئے بھی اس کتاب کے

سوا کسی دوسری جماعت یا تعلیم کو اپنا رہنما بنائے وہ مسلم نہیں شرک فی صفات اللہ کی طرح شرک فی صفات القرآن کا مجرم ہے۔"

یہاں سے اس اجمال کی تفصیل ملاحظہ فرمائیے۔

۱۹۱۲ء میں جب حضرت مولانا آزاد نے اپنا مشہور جریدہ "الہلال" جاری کیا کسی مسلمان نے مولانا سے اس کا سیاسی مسلک دریافت کیا تھا۔ ۸ ستمبر ۱۹۱۲ء کے الہلال میں جواب دیتے ہوئے مولانا تحریر فرماتے ہیں:

" ان کے خطوط میں کئی باتیں قابل غور ہیں (۱) پولٹیکل مباحث مذہبی تعلیم سے الگ ہونے چاہئیں (۲) ہندوستان میں اس وقت جو پولٹیکل گروہ موجود ہیں ان میں سے "الہلال" کس کا ساتھ دیتا ہے؟

مسلمانوں کا امام و رہنما صرف قرآن ہے

امر اول کی نسبت گزارش ہے کہ جناب نے اس بنیادی اصول کو چھیڑ دیا جس پر ہم "الہلال" کی پوری عمارت کھڑی کرنا چاہتے ہیں آپ کہیں کہ محراب خوشنما نہیں تو ممکن ہے ہم اسے بدل دیں لیکن اگر آپ کی خواہش ہو کہ بنیاد کا پتھر بدل دیا جائے۔ تو معاف فرمائیے اس کی تعمیل سے ہم مجبور ہیں انسانی اعمال کی خواہ کوئی شاخ ہو ہم تو اسے مذہب ہی کی نظر سے دیکھتے ہیں ہمارے پاس اگر کچھ ہے تو صرف قرآن ہی ہے اس کے سوا ہم کچھ نہیں جانتے ساری دنیا کی طرف سے ہماری آنکھیں بند ہیں اور تمام آوازوں

سے کان بہرے ہیں اگر دیکھنے کے لیئے روشنی کی ضرورت ہے تو یقین کیجیئے ہمارے پاس تو "سراج منیر" کی بخشی ہوئی ایک ہی روشنی ہے، اسے مٹا دیجیئے گا تو ہم بالکل اندھے ہو جائیں گے۔

کتاب انزلناہ الیک لتخرج الناس من الظلمت الی النور۔

قرآن ایک کتاب ہے جو تم پر نازل کی گئی اسلئے کہ انسان کو تاریکی سے نکالے اور روشنی میں لائے۔

آپ فرماتے ہیں کہ پولٹیکل مباحث کو مذہبی رنگ سے الگ کر دیجیئے لیکن اگر اسے الگ کر دیں تو ہمارے پاس رہ کیا جاتا ہے؟ ہم نے تو اپنے پولٹیکل خیالات مذہب ہی سے سیکھے ہیں۔ وہ مذہبی رنگ ہی میں نہیں بلکہ مذہب کے پیدا کئے ہوئے ہیں ہم انھیں مذہب سے کیونکر علیحدہ کر دیں؟ ہمارے عقیدے میں تو ہر وہ خیال جو قرآن کے سوا کسی اور تعلیم گاہ سے حاصل کیا گیا ہو۔ ایک کفر صریح ہے۔ اور پالٹیکس بھی اس میں داخل ہے۔ افسوس کہ آپ حضرات نے اسلام کو کبھی بھی اس کی اصلی عظمت میں نہیں دیکھا ما قدروا اللہ حق قدرہ ورنہ پولٹیکل پالیسی کے لئے نہ تو گورنمنٹ کے دروازے پر جھکنا پڑتا اور نہ ہندوؤں کی اقتدا کرنے کی ضرورت پیش آتی۔ اسی سے سب کچھ سیکھتے جس کی بدولت تمام دنیا کو آپ نے سب کچھ سکھلایا تھا اسلام انسان کے لئے ایک جامع اور اکمل قانون لے کر آیا۔ اور انسانی اعمال کا ایسا

کوئی مناقشہ نہیں جس کے لئے وہ محکم نہ ہو وہ اپنی توحید تعلیم میں نہایت غیور ہے۔ اور کبھی پسند نہیں کرتا کہ اس کی چوکھٹ پہ جھکنے والے کسی دوسرے دروازے کے سائل بنیں۔ مسلمانوں کی اخلاقی زندگی ہو یا علمی۔ سیاسی ہو یا معاشر دینی ہو یا دنیاوی۔ حاکمانہ ہو یا محکومانہ۔ وہ ہر زندگی کے لئے ایک اکمل ترین قانون اپنے اندر رکھتا ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو وہ دنیا کا آخری اور عالمگیر مذہب نہ ہوسکتا۔ وہ خدا کی آواز اور اس کی تعلیم گاہ خدا کا حلقۂ درس ہے جس نے خدا کے ہاتھ پر ہاتھ رکھ دیا وہ پھر کسی انسانی دستگیری کا محتاج نہیں، یہی وجہ ہے کہ قرآن نے ہرجگہ اپنے تئیں "اِمامٌ" "تبیانٌ" "حق الیقین" "نور وکتابٌ مبینٌ" "تبیانا لکل شئ" "بصائر للناس" "ھادی واھدیٰ الی السبیل" "جامع اضراب وامثال" "بلاغ للناس" "ھادی بحر وبر" اور اس طرح کے ناموں سے یاد کیا ہے اکثر موقعوں پر کہا کہ وہ ایک روشنی ہے۔ اور روشنی جب نکلتی ہے تو ہر طرح کی تاریکی دور ہو جاتی ہے۔ خواہ مذہبی گمراہیوں کی ہو یا سیاسی۔

قَدْ جَاءَكُمْ مِنَ اللّٰهِ نُورٌ وَكِتَابٌ مُبِينٌ
يَهْدِي بِهِ اللّٰهُ مَنِ اتَّبَعَ رِضْوَانَهُ سُبُلَ
السَّلَامِ وَيُخْرِجُهُمْ مِنَ الظُّلُمَاتِ إِلَى النُّورِ
بِإِذْنِهِ وَيَهْدِيهِمْ إِلَىٰ صِرَاطٍ مُسْتَقِيمٍ (۵:۵)

بے شک تیرے پاس اللہ کی طرف سے روشنی اور ہر بات کو بیان کرنے والی کتاب آئی ہے۔ اللہ اس کے ذریعہ سلامتی کے راستوں پر ہدایت کرتا ہے اس کو جو اس کی رضا چاہتا ہے اور اس کو ہر طرح کی گمراہی کی تاریکی سے نکال کر ہدایت کی روشنی میں لاتا ہے اور صراط مستقیم پر چلاتا ہے۔

دنیا میں کونسی کتاب ہے جس نے خود اپنی زبان سے اپنے نسبت ایسے عظیم الشان دعاوے کئے ہوں ؟۔ اس آیت میں صاف صاف تبلادیا گیا ہے کہ قرآن مجید روشنی ہے۔ اور روشنی ہے تو تمام انسانی اعمال کی تاریکیاں صرف اسی سے دور ہوسکتی ہیں۔ پھر کہا کہ وہ ہر بات کو کھلے کھلے طور پر بیان کرنے والی ہے۔ اور انسانی اعمال کی کوئی شاخ ایسی نہیں جس کے لئے اس کے اندر کوئی فیصلہ نہ ہو اس ٹکڑے کی تائید دوسری جگہ کردی کہ :۔

وَلَقَدْ جِئْنَاهُم بِكِتَابٍ فَصَّلْنَاهُ عَلَىٰ عِلْمٍ هُدًى وَرَحْمَةً لِّقَوْمٍ يُؤْمِنُونَ۔

بے شک ہم نے ان کو کتاب دی جس کو ہم نے علم کے ساتھ مفصل کر دیا ہے وہ ہدایت، بخشش اور رحمت ہے ارباب ایمان کے لئے۔

اس کے بعد پہلی آیت میں قرآن کو سبل السلام کے لئے ہادی تبلایا گیا ہے۔ کہ وہ تمام سلامتی کی راہوں کی طرف رہنمائی کرتا ہے اور اگر آپ کے سامنے پولٹیکل اعمال کی بھی کوئی راہ ہے تو کوئی

وجہ نہیں کہ اس کی سلامتی آپ کو قرآن سے نہ ملے۔ پھر کہا کہ وہ انسان کو تمام گمراہیوں کی تاریکی سے نکال کر ہدایت کی روشنی میں لاتی ہے اور ہم دیکھ رہے ہیں کہ ہماری پولٹیکل گمراہیاں صرف اس لئے ہیں کہ قرآن کے دستِ راہنما کو اپنا ہاتھ سپرد نہیں کیا۔ ورنہ تاریکی کی جگہ آج ہمارے چاروں طرف روشنی ہوتی۔ آخر میں کہہ دیا کہ وہ "صراطِ مستقیم" پر لے جانے والی ہے اور "صراط المستقیم" کی اصطلاح قرآن کی زبان میں ایسی جامع ومانع ہے کہ ساری دنیا اس کے اندر سمجھئے۔

أَنزَلْنَا عَلَيْكَ الْكِتَابَ تِبْيَانًا لِّكُلِّ شَيْءٍ وَهُدًى وَرَحْمَةً لِّقَوْمٍ يُؤْمِنُونَ

(اے پیغمبر) ہم نے تم پر کتاب اُتاری جو ہر چیز کو کھول کھول کر بیان کر دینے والی ہے اور نیز ہدایت بخشش اور رحمت ہے صاحبانِ ایمان کے لئے۔"

اس کے بعد مولانا نے استدلال و استشہاد میں قرآنِ مجید کی متعدد آئتیں پیش کی ہیں اور بتایا ہے کہ مسلمانوں کا امام اور رہنما صرف قرآنِ مجید ہے، اور اس کی تعلیم و ہدایت مسلمانوں کے لئے بس ہے، نیز مسلمان اسی کی اقتداء اور پیروی پر مامور ہیں۔ مسلمانوں کی نجات و سربلندی اسی میں ہے کہ وہ کتاب اللہ کو دستورِ حیات بنائیں۔

بعد ازاں مولانا نے اپنے سائل کے دوسرے سوال پر گفتگو کی ہے، فرماتے ہیں۔

قرآن کے سوا کسی انسانی راہ | آپ کا دوسرا سوال یہ ہے کہ ہندوستان

ہیں پولیٹکل خیالات کے تین راستے موجود ہیں۔ الہلال کس راہ پر قوم کو چلانا چاہتا ہے؟ پھر آپ نے ان کو گنوا بھی دیا ہے لیکن افسوس کہ آپ ایک چوتھی راہ کو بالکل بھول گئے ہیں۔ یہ تین راستے تو آج آپ کے سامنے نمودار ہیں۔ مگر وہ چوتھی راہ تو وہ قدیمی راہ ہے جس پر چل کر ہزاروں ہستیاں منزل مقصود پر پہنچ چکی ہیں، آسمان و زمین کے فاطر نے جس وقت انسان کو دیکھنے کے لئے آنکھیں عطا فرمائیں اسی وقت اس کے سامنے یہ راہ بھی کھول دی تھی۔ آدمؑ نے اس پر قدم رکھا۔ اور نوحؑ نے پتھر کی بارش میں اس کا وعظ کہا۔ ابراہیم نے اسی کی نشانی کے لئے قربانگاہ بنائی اور اسمٰعیل نے اس کے لئے اینٹیں چنیں۔ یوسف نے مصر کے قید خانے میں جب ایک ساتھی نے پوچھا تو اسی راہ کی اس نے رہنمائی کی۔ اور موسیٰ جب وادی ایمن میں روشنی کے لئے بیقرار ہوئے تو اس راہ کی تجلی ایک سبز درخت کے اندر نظر آئی۔ گلیل کا اسرائیلی واعظ جب یروشلم کے قریب ایک پہاڑ پر چڑھا تو اس کی نظر اس راہ پر تھی۔ اور پھر جب خداوند سعیر سے چمکا اور فاران کی چوٹیوں پر نمودار ہوا تو وہی راہ تھی جس کی طرف اس نے دنیا کو دعوت دی:

شَرَعَ لَكُم مِّنَ الدِّينِ مَا وَصَّىٰ بِهِ نُوحًا وَالَّذِي أَوْحَيْنَا إِلَيْكَ وَمَا وَصَّيْنَا بِهِ إِبْرَاهِيمَ وَمُوسَىٰ وَعِيسَىٰ أَنْ أَقِيمُوا الدِّينَ وَلَا تَتَفَرَّقُوا فِيهِ ۔

اللہ نے تمہارے لئے دین کا وہی راستہ ٹھیرایا جس

پر چلنے کا اس نے نوح کو حکم دیا اور اے پیغمبر وہی تمھاری طرف اتارا گیا اور اسی کا ہم نے ابراہیم اور موسیٰ اور عیسیٰ کو حکم دیا کہ اس دین کے راستے کو قائم رکھنا اور اس میں تفرقہ نہ ڈالنا۔

یہی وہ راستہ ہے جس کی نسبت (یوسف صدیق) نے قید خانۂ مصر میں یہ کہہ کر اپنا وعظ ختم کیا تھا۔

ذَالِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ ۝ (۱۲ : ۴۰)

یہی سیدھا راستہ ہے مگر بہت ہیں جو نہیں جانتے۔

اور جس کی نسبت داعیِ اسلام کو حکم ہوا تھا کہ کہدے!

هٰذِهٖ سَبِيْلِيْٓ اَدْعُوْٓا اِلَى اللّٰهِ عَلٰى بَصِيْرَةٍ اَنَا وَمَنِ اتَّبَعَنِيْ ۔ (۱۲ : ۱۰۸)

میرا راستہ یہ ہے کہ تم سب کو اللہ کی طرف بلاتا ہوں اس یقین کے ساتھ جو مجھ کو اور میرے ماننے والوں کو طریقِ الٰہی پر ہے،

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ کہ ہم "وَمَنِ اتَّبَعَنِيْ" کے زمرے میں داخل ہیں اور اسی لئے جناب کی قرار دی ہوئی ان تینوں (انسانی راہوں) سے کوئی واسطہ نہیں رکھتے۔ بلکہ اس چوتھی راہ الٰہی کی طرف دعوت دیتے ہیں۔ یہ قرآن کی بتلائی ہوئی راہ مستقیم ہے اور ہمارا عقیدہ ہے کہ جو مسلمان اپنے کسی عمل و اعتقاد کے لئے بھی اس کتاب کے سوا کسی دوسری جماعت یا تعلیم کو اپنا راہنما بنائے وہ مسلم نہیں بلکہ مشرک

فی صفات اللہ کی طرح شرک فی صفات القرآن کا مجرم ہے اور اس لئے مشرک ہے:۔ الحمد للّٰہ الذی ھدٰنا لھٰذا وما کنا لنھتدی لولا ان ھدٰنا اللّٰہ (۷: ۴۳)۔

ہندوں کی سیاسی پیروی غیرتِ الٰہی کے منافی ہے

آپ پوچھتے ہیں کہ "آجکل ہندوؤں کے دو پولٹیکل گروہ موجود ہیں۔ آپ ان میں سے کس کے ساتھ ہیں؟" گزارش ہے کہ ہم کسی کے ساتھ نہیں۔ بلکہ صرف خدا کے ساتھ ہیں۔ اسلام اس سے بہت ارفع و اعلیٰ ہے کہ اس کے پیروؤں کو اپنی پولٹیکل پالیسی طے کرنے کے لئے ہندوؤں کی پیروی کرنی پڑے مسلمانوں کے لئے اس سے بڑھ کر کوئی شرم انگیز سوال نہیں ہوسکتا کہ وہ دوسروں کی پولٹیکل تعلیموں کے آگے جھک کر اپنا راستہ پیدا کریں ان کو کسی جماعت میں داخل ہونے کی ضرورت نہیں وہ خود دنیا کو اپنی جماعت میں شامل کرنے والے اور اپنی راہ پر چلانے والے ہیں اور صدیوں تک چلا چکے ہیں وہ خدا کے سامنے کھڑے ہو جائیں تو ساری دنیا ان کے آگے کھڑی ہو جائے۔ اُن کا خود اپنا راستہ موجود ہے، وہ راہ کی تلاش میں کیوں دوسروں کے دروازوں پر بھٹکتے پھریں؟ خدا ان کو سربلند کرتا ہے تو وہ کیوں اپنے سروں کو جھکاتے ہیں؟ وہ خدا کی جماعت ہیں اور خدا کی غیرت اس کو کبھی گوارا نہیں کرتی کہ اس کی چوکھٹ پر جھکنے والوں کے سر غیروں کے آگے بھی جھکیں:۔ ان اللّٰہ لا یغفر ان یشرک بہٖ ویغفر ما دون ذٰلک

لِمَنۡ یَّشَآءُ ؀

پس "الہلال" کی تمام چیزوں کی طرح پالٹیکس میں بھی یہی دعوت ہے کہ نہ تو گورنمنٹ پر بیجا اعتماد کیجئے اور نہ ہندوؤں کے حلقۂ درس میں شریک ہوجئے - صرف اس راہ پر چلیے جو اسلام کی بتائی ہوئی صراطِ مستقیم ہے"

اس کے بعد حضرت مولانا آزاد نے چھ نمبروں میں صراطِ مستقیم کے نشانات بتائے ہیں، آخر میں تحریر فرمایا ہے :-

"خدا کے سوا کوئی نہیں جو انسانوں کو محض اپنی رائے اور خواہش سے بنائے ہوئے احکام کی تعمیل پر مجبور کرنے کا حق رکھتا ہو۔

مَا کَانَ لِبَشَرٍ ان یوتیہ اللہ الکتاب وَالحکم وَالنبوۃ ثم یقول للناس کونوا عبادا لی من دون اللہ ؀

یہ حق کسی انسان کا نہیں کہ اللہ تعالیٰ اُسے کتاب اور حکم اور نبوت عطا کرے اور وہ لوگوں سے کہے کہ اللہ کی بندگی چھوڑ کر میری بندگی کرو"

مولانا آزاد نے ہمیں "صراطِ مستقیم" کا سب سے جلی اور غیر مبدل نشان بتا دیا ہے۔ ہمارا فرض ہے کہ اگر حضرت مولانا بھی اس کے سوا کسی اور راہ کو ہمارے سامنے پیش کریں تو ہم اُسے اختیار کرنے سے صاف انکار کردیں، یہی صحیح تر پیروی ہے مولانا آزاد کی، کیونکہ "امامِ مبین" کی بتائی ہوئی یہی راہ ہے -

اِس کے بعد ۲۲ ستمبر ۱۹۱۲ء کے الہلال میں مولانا نے "صبح امید"

کے عنوان سے ایک مضمون شائع فرمایا جس میں بتایا ہے کہ مسلمانانِ ہند کی حیات ملی و اجتماعی کی طرف سے مولانا کو قطعی مایوسی ہو چکی تھی۔ لیکن تقسیم بنگال کی تنسیخ اور مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے معاملات میں مسلمانوں نے جس احساس و شعور کا ثبوت دیا اس نے مولانا کی یاس کو امید سے بدل دیا۔ زیر نظر مضمون میں اس تغیر کو مولانا نے صبح امید سے تعبیر فرمایا ہے۔

اس کے بعد ۹-۱۶-۲۳-اکتوبر اور ۶ نومبر ۱۹۱۲ء کے الہلال میں حضرت مولانا نے ایک سلسلہ مضمون شائع فرمایا۔ اُس کا عنوان ہے "مسلمانوں کی آئندہ شاہراہ مقصود"۔ اس مضمون کے اقتباسات نہایت فکر انگیز اور بصیرت افروز ہیں، ان کو غور و تامل سے ملاحظہ فرمایئے۔

حضرت مولانا نے اپنے مضمون "صبح امید" میں مسلمانوں کی جس حرکت و بیداری کا تذکرہ کیا ہے۔ اس کی طرف اشارہ کرنے کے بعد آپ تحریر فرماتے ہیں:-

جمود و حرکت "حقیقت یہ ہے کہ خیالات کی جنبش اور حرکت فی نفسہ کوئی مفید شئے نہیں ہے جب تک کہ وہ کسی آئندہ صحیح انجاذ دافکار سے متصل نہ ہو جائے اور اگر ایسا نہ ہوا تو حرکت محض بعض حالتوں میں بیکار و لاحاصل اور اکثر حالتوں میں جمود سے زیادہ مہلک اور خطرناک ثابت ہوتی ہے

بالفاظ سادہ تر، اس کو یوں سمجھئے کہ ایک شخص مدتوں سے ایک جگہ بیٹھا ہے۔ بالکل بیٹھا رہنا زندگی کے لئے نہایت

مضر اور اعضاء و جوارح کو معطل کر دینے والا ہے۔ اس لئے آپ چاہتے ہیں کہ وہ حرکت کرے۔ یہ نہایت عمدہ خیال ہے لیکن یہ حرکت اسی وقت مفید ہو گی جب آپ اُسے چلا کر کسی عمدہ باغ کی روش پر لا کھڑا کریں۔ لیکن اگر آپ اس میں حرکت پیدا کر کے سامنے کے گڑھوں سے اُسے نہ بچایا اور وہ غریب اُس میں گر گیا تو اس حرکت سے تو اس کا بیٹھا رہنا ہی بہتر تھا۔

لیڈروں کا طبقہ اپنے گزشتہ عہد کو خواہ جد و جہد کی ایک شاندار تاریخ سمجھے مگر ہمارے نزدیک مسلمانوں کی حرکت کی تاریخ اب شروع ہو گی۔ وہ فی الحقیقت اب تک سو رہے تھے زندگی کی ان میں کوئی حرکت نہ تھی اور نیند نے اُن پر موت کا جمود طاری کر دیا تھا وھو الذی یتوفٰکم باللیل ایک سوئے ہوئے انسان کے لئے اس کی کوئی بحث نہیں ہوتی کہ دوڑنا بہتر ہے یا آہستہ چلنا؟ بلکہ لگا کر بیٹھنا بہتر ہے یا دوزانو ہو کر بیٹھنا۔ کیونکہ یہ حالتیں اسے پیش ہی نہیں آتیں۔ لیکن اب وہ جاگے ہیں۔ ان کو بیٹھنا بھی پڑے گا۔ اٹھنا بھی پڑے گا پس اب ان کی حالت پیشتر کی سی بے خطر نہ ہو گی کیونکہ امن موت میں ہے مگر خطرہ صرف زندگی ہی میں ہوتا ہے جب تک غافل پڑے ہوئے اینٹھ رہے تھے تو نہ اُن کو فرش گل پر چلنا تھا اور نہ جنگل کے خارزار پر لیکن اب دونوں قسم کی زمینوں پر ان کے قدم پڑ سکتے ہیں اس لئے فی الحقیقت سوچنے، غور کرنے، اور حزم و احتیاط کا وقت اب آیا ہے بہت ممکن ہے کہ بیٹھے

کی جگہ اٹھ کھڑے ہوں۔ کچھ بعید نہیں کہ آہستہ چلنے کے بجائے بے اختیار دوڑنے لگیں۔ ٹھوکریں بھی کھا سکتے ہیں اور در و دیوار سے ٹکرا بھی سکتے ہیں۔ کیونکہ اب وہ سوئے ہوئے نہیں ہیں بلکہ زندہ اور متحرک ہیں۔ خطرات سے مقابلہ زندگی اور حرکت میں ہوتا ہے جمود اور سکون میں نہیں ہوتا پس پہلے نہیں تو اب ضرورت ہے کہ ایک ایسی حقیقی رہنمائی کے ہاتھ میں ان کا ہاتھ ہو، جو اُن کو معطل بیٹھنے نہ دے۔ چلاتا رہے۔ لیکن ساتھ ہی نگراں بھی رہے کہ کہیں راہ کے اِدھر اُدھر گڑھوں اور غاروں میں پھسل نہ پڑیں

مرا دو خضر عناں گیر باید از چپ و راست
کہ کج روی نہ کنم ورنہ عزم راہ خطاست

اولین اور بنیادی مسئلہ سب سے پہلے اس امر پر غور کرنا چاہئے کہ ان تغیرات حالات کا منشا کیا ہے اور رخ کس طرف ہونا چاہئے؟ ہم کو نہایت رنج اور قلق کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ اس لحاظ سے موجودہ تغیراتِ خیال کا منظر زیادہ اطمینان بخش نہیں ہے۔ ہم صاف صاف اور بآواز بلند کہہ دیتے ہیں کہ اگر مسلمان اپنی قدیمی پالیسی کو صرف اس لئے چھوڑتے ہیں کہ تنسیخ بنگال اور مسئلہ یونیورسٹی کی وجہ سے وہ گورنمنٹ سے روٹھ گئے ہیں یہ تغیر صرف اس لئے پیدا ہوا ہے کہ آزاد خیال ہندوؤں کی دیکھا دیکھی اب مسلمان بھی پالیٹکس پالیٹکس پکارنے کے لئے مضطرب ہیں۔ تو وہ یاد رکھیں کہ اس نئے تغیر اور انقلاب میں ان کے لئے کوئی برکت نہیں ہے بہتر

یہ ہے کہ وہ اب تک جہاں پڑے ہوئے سسک رہے ہیں وہیں بقیہ ایام ذلت وخواری ہیں اور کاٹ لیں۔ تاریکی ہیں رہنا ہے تو پھر اس سے کیا بحث کہ وہ کوئی گڑھا ہے یا عمدہ بنا ہوا تہہ خانہ آج تک اُن کی تمام ناکامیوں کی علت حقیقی یہ رہی ہے کہ انھوں نے اپنے اعمالِ زندگی کی شاخ کو "سلطان قرآن" کے ماتحت نہیں رکھا۔ اور جب کوئی تحریک شروع کی یا اپنے لئے کسی پالیسی کا پروگرام مرتب کیا تو قرآن کریم کو اس طرح بھولے گویا اس کا نزول تاریخ عالم کا کوئی واقعہ ہی نہیں ہے اور یہ بھی سچ نہیں کہ وہ اس نام کی کسی کتاب کے پیرو ہیں۔ اگر مسلمان اس تغیر کے بعد پھر اسی گمراہی ہیں پڑنا چاہتے ہیں تو۔ یہ ایک دلدل میں سے نکل کر دوسری دلدل میں پھنسنا چاہتے ہیں اور ایک دام سے نجات پاکر دوسرے دام میں گرفتار ہونا چاہتے ہیں۔ پھر اگر ان کو گمراہیوں کے قفس ہی میں ہمیشہ مقید رہنا ہے تو موجودہ قفس ہیں کون سی بُرائی ہے کہ نئے پنجرے کی جستجو کی جائے؟

بیشک تقسیم بنگال کی تنسیخ اور یونیورسٹی کا مسئلہ ہمارے جمود وغفلت کے لئے ایک تازیانہ تنبیہ ضرور ہے اور ہم یقیناً شَرَّ الدَّوَابِّ عِنْدَ اللّٰہِ ہوں گے۔ اگر اس سے عبرت نہ پکڑیں لیکن ہماری آئندہ پالیسی کی بنیاد کوئی وقتی یا فوری واقعہ نہ ہونا چاہئے، بلکہ وہ ایک مستقل اور دائمی اعتقاد ہونا چاہئے جو اپنے قیام کے لئے کسی بیرونی سہارے کا محتاج نہ ہو۔

مان لیجئے کل گورنمنٹ نے بنگال کے دو نہیں بلکہ دس ٹکڑے

کر دیئے اور وزیر ہند نے اعلان کر دیا کہ یونیورسٹی کا نام علیگڑھ نہیں مسلم ہوگا۔ کیونکہ جو گورنمنٹ ایک بار تقسیم کر کے منسوخ کر سکتی ہے وہ اب بھی سب کچھ کر سکتی ہے۔ پھر کیا اس حالت میں مسلمانوں کی پالیسی پر ایک تیسرا انقلاب طاری ہو جائے گا؟ اور پھر تغیر تغیر کی صدا بلند کی جائے گی۔ اس کے تو یہ معنی ہوئے کہ آپ کا کوئی عقیدہ کوئی خیال کوئی نصب العین اور کوئی اصلی پالیسی نہیں۔ آپ صرف گورنمنٹ کے چشم و ابرو کا نام ہیں۔ اور صرف اس کو تکتے رہتے ہیں۔ اگر مصلحتاً لطف و دہد کی علامتیں نمایاں ہوئیں تو "سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا" کہہ کر آپ سربسجود ہو گئے۔ اور اگر مصلحت نے گوشۂ چشم رقیبوں کی طرف پھیر دیا تو لگے منہ بسورنے اور آنسو بہانے۔ سوال یہ ہے کہ خود آپ کے پاس بھی کوئی شئے ہے یا نہیں؟ مولانا آزاد نے جمود و حرکت اور بنیادی مسئلہ کے ماتحت جو کچھ ارشاد فرمایا ہے اس پر غور کرنے کے بعد آپ اس کے سوا کسی اور نتیجے پر نہیں پہنچ سکتے کہ مسلمانوں کو اپنی منزل اور راہ کو سمجھے بغیر نقل و حرکت شروع نہ کر دینی چاہیئے ورنہ ممکن ہے کہ وہ منزلِ مقصود پر پہنچنے کی بجائے غلط راستے پر پڑ کر تباہ ہو جائیں مولانا نے جو سب سے اہم اور بنیادی بات ارشاد فرمائی ہے وہ یہ ہے کہ ہماری آئندہ پالیسی کی بنیاد کوئی وقتی یا فوری واقعہ نہیں ہونا چاہیئے، بلکہ وہ ایک مستقل اور دائمی اعتقاد ہونا چاہیئے جو اپنے قیام کے لئے کسی بیرونی سہارے کا محتاج نہ ہو۔

آپ غور کر لیجئے کہ یہ مستقل اور دائمی اعتقاد اللہ کی حاکمیت

کے عقیدے کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے جس کی قرآنِ مجید تعلیم دیتا ہے اور جیسے لعنوان "مسلمانوں کا نصب العین کیا ہونا چاہیئے" مولانا نے آگے چل کر خود ہی پیش فرمایا ہے۔ اب اس کے بعد کا حصہ ملاحظہ کیجیئے جس میں مولانا نے ہمیں سمجھایا ہے کہ امم عالم میں امت مسلمہ کا خصوص و امتیاز کیا ہے۔

اُمم عالم میں امتِ مسلمہ کا امتیاز

حضرت مولانا فرماتے ہیں "ہمارے نزدیک اسلام کے دامنِ تقدیس پر اس سے بڑھ کر اور کوئی بدنما دھبہ نہیں ہو سکتا کہ انسانی حریت اور ملکی فلاح کا سبق مسلمان دوسری قوموں سے لیں۔ اس بارے میں ہمارے خیالات، الحمدللہ عام خیالات کی سطح سے بہت بلند ہیں اور گو موقع نہیں مگر ضمناً ان کی طرف اشارہ کر دینا ضروری ہے ہمارا عقیدہ ہے کہ جس طرح اسلام کا خدا اپنی ذات وصفات میں لَاشَرِیْکَ لَہٗ ہے کوئی ہستی اور وجود اس میں شریک نہیں اسی طرح اس کا قرآن کریم اپنی جامعیت اور کمال اور کمالِ تعلیم میں "وَحْدَہٗ لَاشَرِیْکَ" اور بالکل اسی طرح اس کا لانے والا رسول کمال انسانیت وتعبد اور قوائے نبوت واصلاح میں "وَحْدَہٗ لَاشَرِیْکَ" ہے ان کی صفات خصائص میں کوئی ان کا شریک نہیں۔

راہ نسبت طلبی ہیں کہ چہ شایاں رفتم

پس ضرور ہے کہ جو اُمت اس خدائے واحد اس قرآنِ واحد اور رسولِ واحد کے دامنِ تعلیم سے وابستہ ہو وہ بھی اپنے اندر

اس شان وحدت ویکتائی کا جلوہ رکھے وہ بھی اپنے اعمال زندگی کی ہر شاخ میں "وَحْدَهٗ لَا شَرِيكَ" ہو۔ اس کے اعمال وخصائص بھی "مَنْ رَآنِي فَقَدْ رَأَى الْحَقَّ" کی صدائے اتحاد سے غلغلہ انداز عالم ہوں۔ تمام دنیا کی قومیں اس کے اعمال کا اتباع کریں زندگی کے ہر حسن وجمال میں اس کے خال و خط مرقع عالم کے لئے نمونہ بنیں "وَكَذَٰلِكَ جَعَلْنَاكُمْ أُمَّةً وَسَطًا" کے یہی معنی ہیں اور اس لئے مسلمانوں سے وعدہ کیا گیا تھا۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِنْ تَتَّقُوا اللَّهَ يَجْعَلْ لَكُمْ فُرْقَانًا۔ (۸-۲۹)

"مسلمانوں اگر تم اللہ کا خوف اپنے اندر پیدا کر کے متقی بن جاؤ گے تو وہ تمہارے لئے تمام دنیا میں ایک خاص امتیاز وخصوصیت پیدا کر دے گا۔"

جس قوم کو اس صدائے الہٰی نے مخاطب بنایا ہو اس کے لئے اس سے بڑھ کر کیا بدبختی ہو سکتی ہے کہ وہ اپنی زندگی کی ہر شاخ میں غیروں کے لئے نمونہ بننے کی جگہ خود دوسروں کو اپنا کعبۂ مقصود اور قبلۂ آمال بنا رہی ہے؟ سیاسی بحث تو ضمنی ہے ہمارا اصلی ماتم صرف اتنے ہی پر موقوف نہیں ہم کو تو یہ نظر آرہا ہے کہ آج مسلمانوں کے لئے تعلیم اخلاق معاشرت سیاست بلکہ مدنی زندگی کی ہر شاخ میں ان کے لیڈر صرف اس کو فرض رہنمائی سمجھتے ہیں کہ ان کے آگے دوسری قوموں کے اعمال پیش کر دیں تہذیب وانسانیت کی ضرورت ہے تو مسلمان یورپ کی شاگردی کریں۔ پولیٹیکل آزادی

کی ضرورت ہے تو اپنی ہمسایہ قوموں سے بھیک مانگیں، پھر ہمیں
بتلایا جائے کہ خود بدبخت مسلمانوں کے پاس بھی کچھ ہے یا
نہیں؟ جو مسلمانوں کے رہنما قوم کے جلب قلوب کے لئے مذہب
کے ذکر کو ناگزیر دیکھ کر اپنے شاندار اسپیچوں پر مذہب! مذہب
اور اسلام، اسلام پکارتے ہیں۔ قطع نظر اسکے کہ خود ان کی زندگی
میں اس اسلام کا اثر کہاں تک موجود ہے ہم پوچھتے ہیں کہ کبھی
انھوں نے قوم کو یہ بھی بتلایا کہ زندگی کی ہر شاخ میں خود اسلام کا
نمونہ کیا ہے؟ اور اگر نہیں بتلایا ہے تو قوم کے لئے ایک مسیحی رہنما
اور ایک مسلمان لیڈر میں کیا فرق ہے؟ سچ یہ ہے کہ وہ غریب
خود جس متاع سے تہی دست ہیں اُسے دوسروں کے آگے کیا
پیش کریں گے؟

خُفتہ را خُفتہ کئے کُند بیدار؟"

مُسلمانوں کا نصب العین کیا ہونا چاہیئے۔

اس دعوت و موعظت کو اسی طرح دور تک جاری رکھنے کے "بعد مسلمانو کا نصب العین کیا ہونا چاہیئے" کی سرخی کے ماتحت حضرت مولانا ابوالکلام آزاد نے جو کچھ ارشاد فرمایا ہے ہدیۂ ناظرین ہے۔

"پالٹیکس جس کی طرف اب مدتوں کی غفلت کے بعد مسلمانوں
نے شیفتگی کی نظر اٹھائی ہے قومی زندگی کے اعمال کا ایک بہت
بڑا شعبہ ہے لیکن ہم اُسے مسلمانوں کے لئے کوئی اصلی مقصود اور بنیادی
شئے نہیں سمجھتے۔ اور قوموں کے لئے اگر سیاست ان کے تمام اعمال

کی بنیاد ہے تو اس لئے ہے کہ زندگی کی حرارت پیدا کرنے کے لئے وہ سیاسی اعمال سے ایک گرم انگیٹھی کا کام لیتے ہیں لیکن جس قوم کے پاس ایک شعلہ فشاں آتش کدہ موجود ہو اسے انگیٹھیوں کی کیا ضرورت ہے؟ جب تنور گرم ہو جاتا ہے تو بہت سی انگیٹھیاں اُس سے گرم کر لی جا سکتی ہیں لیکن انگیٹھی تنور کا کام نہیں دے سکتی اس وقت یہودیوں کے جمود نے کروٹ لی ہے۔ اور گویا انقلاب و تغیر کا اچھا موسم مسلمانوں پر گزر رہا ہے۔ اس وقت جس چیز کی تخم ریزی کر دی جائے گی آگے چل کر اُس کے پھل کو اپنے دامن میں دیکھ سکیں گے۔ پس اس بارے میں میری دعوت کا لب لباب یہ ہے کہ مسلمان محض پالٹیکس ہی کو اپنا مقصود حقیقی نہ بنائیں۔ اور اس وقت ایک عمدہ موسم کو جس میں وہ ایک پورا باغ لگا سکتے ہیں صرف ایک درخت کے بونے میں ضائع نہ کر دیں۔ دوسری قوموں کی نظیر پر نظر رکھنا ان کے لئے کچھ سودمند نہیں ہو سکتا۔ ان کو صرف اپنے اوپر نظر رکھنا چاہیئے۔ کیونکہ ان کے پاس ایک چیز ہے جو اوروں کے پاس نہیں ہے۔ اور جس کو اپنا اصل مقصود بنا کر وہ ان تمام چیزوں کو بھی بوجہ احسن و اکمل لے سکتے ہیں جو اور قومیں حاصل کر رہی ہیں ان کو چاہیئے کہ ہر طرف سے آنکھیں بند کر کے اس شئے کو اپنا اصل مقصود اور نصب العین بنائیں جس کی تلاش میں انھیں گھر سے نکلنے کی ضرورت نہیں بلکہ ہمیشہ سے وہ خود ان کے گھر کے اندر موجود ہے یعنی صرف اتباعِ دینِ مُبین

اور اعتصام بحبل اللہ المتین ان کے لئے ان کے خدا کی طرف سے ایک دائمی مقرر کردہ نصب العین ہے، اگر مسلمانوں نے اپنے لئے ایک نہایت آزادانہ پولٹیکل پالیسی تیار کرلی، کانگریس سے بھی بہتر پروگرام ان کے ہاتھ میں ہوا، آئرلینڈ کے حکومت طلبوں سے بھی بڑھ کر جوش اور سرگرمی پیدا کرلی، پالٹیکس میں وہ ازسرتاپا غرق ہو گئے ان کا ہر فرد "گلیڈسٹون" اور "مارلے" ہوگیا۔ لیکن ساتھ ہی اگر انھوں نے اپنے معتقدات اور اعمال کے اندر اسلام کی عملی روح پیدا نہ کی، اپنے تئیں دین متین کے ماتحت داخل نہ کیا اور خشیت الٰہی اور زاد تقویٰ سے محروم رہے تو میں اس یقین کی لازوال طاقت کے ساتھ جس کے لئے کبھی موت و شکست نہیں، اس بصیرتِ الٰہی کے ساتھ جس میں تزلزل اور تذبذب نہیں ازسرتاپا صدائے ربانی بن کر کہتا ہوں کہ اگر آگ جلاتی ہے اور پانی ڈبا تا ہے، اگر آفتاب مشرق سے طلوع ہوتا ہے اور مغرب کی جانب غروب ہوتا ہے، اگر مچھلی خشکی میں اور پرند دریا میں زندہ نہیں رہ سکتا اگر قوانین فطریہ اور نوامیس طبعیہ میں تبدیلی نہیں ہوسکتی۔ اور اگر یہ سچ ہے کہ دو اور دو پانچ نہیں بلکہ ہمیشہ چار ہوتے ہیں۔ تو یہ بھی کبھی نہ مٹنے والی صداقت اور صفحۂ کائنات پر نقش سنگی ہے کہ مسلمانوں کو یہ تمام نری سیاسی ہنگامہ آرائیاں، تعلیم و تربیت کا غوغائے محشر خیز اور پولٹیکل پالیسی کے تغیر و تبدل کا ہیجان طوفان اور ایک لمحہ، ایک دقیقہ

ایک عشرِ دقیقہ تک کے لئے بھی کچھ نفع نہیں پہنچا سکے گا، ان کی تمام جد وجہد بیکار ہو جائے گی۔ تغیر کا ابر ان پر سے بغیر ایک قطرۂ بارش گزر جائے گا۔ ان کی امیدوں کی خشک سالی بدستور باقی رہے گی۔ وہ جس قدر سعی رہائی کریں گے، اتنا ہی چاروں طرف کی لپٹی ہوئی زنجیروں کی بندش سخت تر ہوتی جائے گی۔ گمراہی وضلالت کا شیطان کبھی ان سے الگ نہ ہوگا۔ ان کے گلوں میں جو طوقِ مذلت اور پاؤں میں جو زنجیر ادبار ونسفل پڑی ہوئی ہے وہ قیامت تک نہ ٹوٹے گی۔

میں نے کہا کہ "اگر آگ جلاتی اور پانی ڈباتا ہے"۔ نہیں بلکہ میں کہتا ہوں کہ یہ تو ممکن ہے کہ آگ نہ جلائے اور پانی نہ ڈبائے مگر یہ تو کسی طرح بھی ممکن نہیں کہ خدا کا وہ قانون شقاوت و ہدایت بدل جائے جس کے لئے ابتدائے خلقت بنی آدم سے آج تک تاریخ میں کوئی مستثنیٰ شہادت موجود نہیں یہ میں لکھ رہا ہوں اور میرے اندر یقین و اعتقاد کی ایک آواز بےچین و مضطرب ہے مگر افسوس کہ اس کی ترجمانی کے لئے مجھے الفاظ نہیں ملتے حیران ہوں کہ کس طرح اپنا دلی یقین آپ کے دلوں میں پیدا کر دوں؟ تاہم میں یہ کہنے سے کبھی نہ تھکوں گا کہ جن احکام اسلام کو آپ نہایت بے پروائی سے مذہبی بندش کہہ کر گزر جاتے ہیں وہ بندش ضرور ہے مگر ایک ایسے قانون کی بندش ہے جس کی سلطنت تمام قوانین مادیہ کے نظام حکومت سے بالاتر اور وراء الوریٰ ہے اور نظم کائنات کے تمام اجزاء اسی بندش سے بندھ کر مرتب

اور منظم ہوتے ہیں یہی بندش ہے کہ لسانِ الٰہی نے اس کو کہیں "حُدُودُ اللّٰہ" کے لفظ سے یاد کیا ہے کہیں "سنۃ اللّٰہ" کے لفظ سے تعبیر کیا ہے۔ کہیں فِطْرَۃَ اللّٰہِ اس کا نام رکھا ہے کبھی "صِرَاطُ الْمُسْتَقِیْم" کہا ہے اور کبھی "دِیْنِ قَیِّم" کے خطاب سے یاد کیا ہے وہ درحقیقت ایک ربانی حکومت کا انتظام ہے اور جب کوئی فرد یا قوم اس کے تحت و تسلط سے نکلنا چاہتی ہے تو گویا وہ خدا کے خلاف اعلان جنگ کر دیتی ہے پھر اس کی زندگی اور زندگی کے تمام اعمال یکسر بغاوت اور سرکشی ہو جاتے ہیں اور وہ رحمانی سلطنت سے نکل کر شیطانی حکومت میں داخل ہو جاتی ہے :۔

یَاۤ اَیُّھَا الْاِنْسَانُ مَا غَرَّكَ بِرَبِّكَ الْكَرِیْمِ

خدا کہتا ہے کہ اے انسانِ حقیر! کس نے تجھ کو آمادہ کیا اس بات پر کہ اپنے رب کریم سے بغاوت کرے"!

قارئینِ کرام! ملاحظہ فرمایا آپ نے؟ حضرت مولانا ابوالکلام آزاد نے آج سے (۳۲) سال بیشتر کس شد و مد سے اور کس ولولہ انگیز اسلوب و انداز میں مسلمانوں کو حکومتِ الٰہیہ کی دعوت دی ہے؟ لیکن اگر آج مولانا کی راہ اور ہے تو یہ ان مسلمانوں کی گمراہی ہے یا ہدایت پسندی جو مولانا سے الگ ہو کر حکومت الٰہیہ کے لئے جد و جہد کر رہے ہیں؟

اُدْخُلُوْا فِی السِّلْمِ كَآفَّةً

عنوان صدر سے مولانا آزاد تحریر فرماتے ہیں۔

"ہم مسلمانوں کو کبھی یہ صلاح نہیں دیں گے کہ وہ صرف پولٹیکل آزادی کے ولولے ہی کو پیدا کر کے اصلاح و تغیر کی طرف سے فارغ البال ہو جائیں۔ کیونکہ ہمارے نزدیک مسلمانوں کے لئے پولٹیکل پالیسی کے تغیر میں کوئی برکت نہیں ہو سکتی اگر ان کے اندر مذہبی تغیر پیدا نہ ہوا۔ بخار کے مریض کے لئے ڈاکٹر کے آگے یہ سوال نہیں ہو سکتا کہ اس کا جسم گرم کیوں ہے؟ اس کی آنکھوں میں سرخی کیوں ہے؟ بلکہ اس پر غور کرتا ہے کہ بخار کی تولید کی اصلی علت کیا ہے۔ اگر آپ صرف مریض کے جسم کی حرارت کے شاکی ہیں۔ تو زیادہ پریشانی کی ضرورت نہیں۔ ایک من برف منگوا کر اس کے ریزوں میں اسے بٹھا دیجئے امید ہے کہ سارا جسم ٹھنڈا ہو جائے گا۔ آپ کہتے ہیں کہ مسجد کا مینار سیدھا نہیں، میں روتا ہوں کہ بنیاد ٹیڑھی ہے۔ آپ صرف پالٹیکس کو کیوں ڈھونڈھتے ہیں۔ جب کہ آپ کو ایک ایسی مضبوط اور لازوال کرسی ملتی ہے جس پر نہ صرف پالٹکس بلکہ قومی زندگی کی عمارت کے تمام ستون کھڑے ہو سکتے ہیں۔ اور ستون کے لئے کرسی ناگزیر ہے۔

مسلمانوں کی فلاح لیگ اور کانگریس میں نہیں۔

پس موجودہ تغیر کے بعد اب مسلمانوں کو سفر اس منزل سے شروع کرنا چاہیئے جو ان کے سفر کا حقیقی مبداء ہے اور جہاں سے ان کو پچھلا سفر شروع کرنا تھا مگر انھوں نے نہیں کیا۔ ان کو نہ تو پولٹیکل پالیسی کی تلاش میں وقت ضائع کرنا چاہیئے اور نہ اعلیٰ تعلیم کے افسانۂ لاتمناہی میں پڑنا چاہیئے

نہ لیگ کے غلامانہ اور موت آور پالٹیکس پر توجہ کرنی چاہیئے۔ اور نہ کانگریس کی رپورٹوں میں اپنے لئے نسخۂ فلاح ڈھونڈھنا چاہیئے ان کو صرف ایک ہی کام کرنا چاہیئے، یعنے بلا سوچے ہوئے کہ ہم کیا کر رہے ہیں اور کہاں جا رہے ہیں اپنا ہاتھ دستِ الٰہی میں دیدینا چاہیئے۔

می برو ہر جا کہ خاطر خواہ اُوست

نہ وہ پالٹیکس کو سوچیں اور نہ تعلیم کو، نہ آزادی کی مدح کریں۔ اور نہ غلامی کا طوق پہنیں۔ یہ باتیں ان کے سوچنے یا فیصلہ کرنے کی نہیں ہیں۔ ان کا فیصلہ خدا کو کرنا تھا، اور اُس نے کرلیا اُن کا کام صرف یہ ہے کہ اتباع کلمات اللہ "ملجاءبہ القرآن" کے لئے تیار ہو جائیں۔ اور اپنے تئیں تمام انسانی تعلیموں اور اقوام کے اتباع و محاکات کے ولولوں سے خالی کر کے صرف اس ایک ہی مُعلم کی تعلیم پر چھوڑ دیں۔ اگر اسلام ان کو پالٹیکس میں بلانا چاہتا ہے تو لبیک کہہ کر دوڑیں۔ اگر وہ اس سے اجتناب کی تعلیم دے تو اشارے کے ساتھ ہی مجتنب ہو جائیں۔ اگر وہ کہے کہ غلامی اور خوشامد دو ہی چیزیں اصلی ذریعہ فوز و فلاح ہیں، تو وہ سر سے پاؤں تک غلامی کی تصویر بن جائیں۔ اگر وہ کہے کہ آزادی اور حقوق طلبی ہی میں قومی زندگی اور عزت ہے تو ان کا وجود یکسر پیکر حریت و جہد حریت ہو جائے۔ اخلاق۔ تعلیم۔ تمدن۔ شائستگی۔ اصلاحِ معاشرت غرض کہ ایک متمدن زندگی کے جتنے اجزاء ہیں ان میں وہ جس طرف بلائے اس طرف جھک جائیں۔ خود ان کی کوئی خواہش کوئی ارادہ کوئی

تعلیم۔ کوئی پالیسی نہ ہو۔ اُن کی خواہش اور پالیسی صرف اتباع قرآن ہو۔ اور وہ اس تنکے کی طرح جس کو کسی بحرِ طوفان خیز میں ڈال دیا گیا ہو اپنے تئیں تعلیم الٰہی کے سمندر میں چھوڑ دیں جس طرف وہ چاہے لے جائے اور جس کنارے وہ چاہے انھیں لگا دے۔ جب خدا ان کے تمام بوجھ اپنے سر لیتا ہے۔ تو وہ اپنے کاندھوں کو کیوں تھکاتے ہیں۔ اگر مسلمانوں نے ایسا کر لیا (اور وعدۂ الٰہی کہ والذین جاھدوا فینا لنھدینھم سبلنا) تو وہ یاد رکھیں کہ آج جن چیزوں کے لئے بھٹک رہے ہیں تو کل خود بخود وہ اُن کے قدموں میں آکر گر جائیں گی۔ ان میں سے ایک ایک کے تلاش و جستجو کی ضرورت نہیں۔ وہ بہت گمراہ ہو چکے جو سر عزت کی سربلندیوں کے لئے بنا تھا بہت ٹھکرایا جا چکا۔ اب بھی سنبھل جائیں کہ خدا کا ہاتھ بیعت لینے کے لئے بڑھا ہوا ہے وہ اسے چھوڑ کر شیطان کے ہاتھ پر بیعت کیوں کرتے ہیں؟ ان کے تمام اعضا مردہ و غیر متحرک ہو رہے ہیں لیکن ان کے لئے سر میں تیل کی مالش یا تلوے کا سہلانا۔ اصلی علاج نہیں۔ ان کو روح کی ضرورت ہے جس دن جس آن جس لمحے۔ اُن میں اسلام کی گم گشتہ حرارتِ غریزی عود کر آئے گی۔ اس وقت پاؤں کے انگوٹھے سے لے کر سر کے بالوں کی جڑ تک ان کا تمام جسم زندہ ہو جائے گا۔ ان کا اخلاق، ان کا تمدن۔ ان کی سوشل حالت۔ ان کی سوسائٹی کا نظام اور سب سے آخر مگر سب سے پہلے یہ کہ ان کی پولٹیکل حالت۔ غرض کہ حیاتِ ملّی کا کوئی شعبہ ایسا نہ ہوگا جو باحسن شکل و باکمل حال اُن کے پاس موجود نہ ہو جائے۔

وَمَن يُسْلِمْ وَجْهَهُ إِلَى اللهِ وَهُوَ مُحْسِنٌ فَقَدِ اسْتَمْسَكَ بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقَىٰ وَإِلَى اللهِ عَاقِبَةُ الْأُمُورِ ۝

اور جو شخص ہر طرف سے منہ موڑ کر صرف اللہ کی طرف متوجہ ہوگیا اور ساتھ ہی اعمالِ حسنہ اختیار کیئے تو بس یقین کرو کہ اس نے مضبوط رسی تھام لی۔ اور انجام کار اللہ ہی کے ہاتھ میں ہے"

مسلمان لیڈروں کی گمراہی حضرت مولانا ابوالکلام آزاد نے اس مسلسل مضمون کے تیسرے نمبر کو اس شعر سے شروع فرمایا ہے۔ ؎

احرام عہد روز ازل کعبہ کوئے دوست
جز راہِ عشق ھر کہ رود بر خطا رود

اس نمبر کے آغاز میں مسلمان لیڈروں کی گمراہیوں پر گفتگو کرتے ہوئے حضرت مولانا فرماتے ہیں۔

"انھوں نے قومی اصلاح و ترقی کی جس قدر تحریکیں شروع کیں ان کو مذہب سے اس طرح الگ رکھا گویا نہ تو پیروانِ اسلام اُن کے مخالف ہیں اور نہ مسلمانوں کی قوم سے خود انھیں کوئی واسطہ ہے ان کی زندگی کے اعمال، افعال و کردار یکسر اسلام سے بیگانہ اور از فرق تا بہ قدم مذہب سے ناآشنا رہے۔

مذہب سے یہ الحاد آمیز بیگانگی یہاں تک بڑھ گئی ہے کہ آج اگر کوئی صدائے قرآنی بلند کی جاتی ہے تو ایک دوسرے کا

منہ تکنے لگتا ہے کہ یہ کیسی آواز ہے؟ بہت سے اس خیال پر متعجب ہیں کہ مسلمانوں کی پولیٹیکل پالیسی بھی تعلیم قرآن پر مبنی ہو "رَاَیت المنافقین یصدّون عنک صدودا"۔ بہتوں کو یہ کہنے سے نفرت اور غصّے کا بخار چڑھ آتا ہے کہ مسلمانوں کے لئے جو کچھ ہے قرآن ہی سے ہے، اور بہت ہیں جو فرعون کے جادوگروں کی طرح خوفزدہ ہو رہے ہیں کہ کہیں مذہب کا عصائے موسوی ثعبان مبین بن کر اُن کو نگل نہ جائے"

انسانی خیالات کے اصنام وطواغیت

آگے چل کر مولانا تحریر فرماتے ہیں "اور باتوں سے قطع نظر کیجئے. ہمارے اعتقاد میں سب سے بڑی یزداں فروشی اور الحاد پرستی تو یہی ہے کہ ایک گروہ مسلمانوں کی اصلاح کا دعوی کرے اور پھر اپنے تمام کاموں کے لئے اسلام اور اس کے خدا کو چھوڑ کر انسانی خیالات کے اصنام وطواغیت کو اپنا حکم بنائے۔

الم تر الی الذین یزعمون انھم امنوا بما اُنزل الیک وما انزل من قبلک یریدون ان یتحاکموا الی الطّاغوتِ وَقدْ اُمرُوا اَنْ یّکفُرُوا بِہٖ وُیُرِیْدُ الشّیطٰنُ اَنْ یُّضِلّھُمْ ضَلٰلًا بَعِیدًا۔ (۶۰:۴)

اے پیغمبر ان لوگوں کو نہیں دیکھتے جو اس زعم باطل میں پڑے ہیں کہ ہم مومن و مسلم ہیں حالانکہ وہ کیونکر مومن و مسلم ہو سکتے ہیں جب کہ ان کا حال یہ ہے کہ خدا کو چھوڑ کر

چاہتے ہیں کہ دوسروں کو حکم بنائیں حالانکہ انھیں حکم
دیا گیا تھا کہ خدا کے سوا دوسروں کی اطاعت سے انکار
کر دیں۔ اصل یہ ہے کہ شیطان چاہتا ہے کہ انھیں سخت درجہ
کی گمراہی میں مبتلا کر دے۔

جن باتوں کو ہمارے لیڈر اسلام سے نا آشنا رہ کر کہتے رہے
اگر چاہتے تو انھیں باتوں کو وہ اسلام کی زبان سے ادا کر سکتے۔
تعلیم اگر ضروری تھی، علوم جدیدہ کی اگر دعوت دینا چاہتے تھے
معاشرت میں ضروری تبدیلی کے خواہاں تھے یا اور جتنی باتیں
قوم کے آگے پیش کرنا چاہتے تھے۔ ان میں کونسی شئے ایسی
ہے جس کے لئے قرآن کریم اور تعلیم الٰہی کو سامنے نہیں رکھ سکتے
تھے؟ پھر کسی دعوت کے لئے یہ طریقہ موثر تھا کہ انسانوں کی نظیر
دی جائے یا یہ کہ خدا کا حکم ہے؟ غور کیجیے کہ میں کیا کہہ رہا ہوں؟
اگر واقعی یہ سچ ہے کہ مسلمانوں کی دین اور دنیا۔ دونوں
ایک ہیں۔ اگر یہ واقعہ ہے کہ وہ قرآن نامی ایک کتاب کے
پیرو ہیں اس میں کوئی دھوکہ نہیں کہ خدا کا ایک برگزیدہ رسول تھا
جس کے پیش کئے ہوئے احکام ان کے لئے ذریعۂ فوز و فلاح ہیں
تو ہمارے لیڈروں کی حالت اس سے بالکل متضاد ہوتی جو آج
ہم بدبختی سے دیکھ رہے ہیں۔ وہ ایک ایسی جماعت ہوتی جس
کے دل اور زبان، دونوں میں اسلام ہوتا جن کا ہاتھ کسی حا
میں قرآن سے خالی نہ ہوتا بلکہ قرآن کی گرفت سے اس طرح
رک جاتا کہ کسی دوسری شئے کو اٹھانے کی مہلت ہی نہ پاتا۔ وہ

از سرتا پا مذہب کی تصویر ہوتے۔ اور یکسر تعلیم الٰہی کا عملی نمونہ۔ ان کی صدا مذہب میں ڈوبی ہوئی ہوتی اور ہر قدم مذہب ہی کی جانب اٹھتا۔ ان کی زبان کھلتی تو مذہب ہی کے لیئے۔ اور قلم حرکت کرتا تو مذہب ہی کے نام پر۔ وہ بہتر سے بہتر خیال اور عمدہ سے عمدہ بات قوم کے آگے پیش کرتے۔ مگر جو کچھ کہتے مذہب کے واسطے۔ اور جو کچھ لکھتے نصیحت کی اسپیا ہی سے"

میں نے کبھی لکھا تھا کہ قومی زندگی کے لئے دنیا میں دو ہی چیزیں ہیں پالٹیکس اور مذہب۔ مگر یہ کہنا باقی ہے کہ اور قوموں کیلئے صرف پالٹیکس حیات بخش ہو تو ہو مگر مسلمانوں کے لئے جن کا سارا کاروبار حیات مذہب ہی کے دم سے ہے یہ روح مذہب کے سوا اور کچھ نہیں ہو سکتی

یا ایھا الذین آمنوا استجیبوا للہ وللرسول
اذا دعاکم لما یحییکم واعلموا ان
اللہ یحول بین المرء وقلبہ وانہ الیہ
تحشرون ہ

مسلمانو اللہ اور اس کے رسول کی پکار سنو وہ تم کو
بلاتا ہے تاکہ تمھارے اندر زندگی کی روح پھونک دے
اور یقین کرو کہ اللہ انسان اور اس کے ارادہ دل میں جب
چاہتا ہے آڑے آجاتا ہے، یہ بھی یاد رکھو کہ بالآخر
ایک دن تم سب اُس کے آگے کھڑے کئے جاؤ گے۔

مسلمانوں کا مرکز قومیت نسل و وطن نہیں اسلام ہے

ہمارے ملکی بھائی اپنے اندر صرف قومیت اور سیاست

کی روح پھونک کے زندگی کی حرارت پیدا کر سکتے ہیں اسی طرح
اور قومیں بھی لیکن مسلمانوں کی کوئی علیحدہ قومیت نہیں جو کسی
خاص نسل و خاندان یا زمین کی جغرافیائی تقسیم سے تعلق رکھتی ہو
ان کی ہر چیز مذہب یا بالفاظ مناسب تر ان کا تمام کاروبار صرف
خدا سے ہے۔ پس جب تک وہ اپنے تمام اعمال کی بنیاد مذہب
کو نہیں قرار دیں گے۔ اس وقت تک نہ ان میں قومیت کی روح
پیدا ہو گی۔ اور نہ وہ اپنے بکھرے ہوئے شیرازے کو جمع کر سکینگے
آج دنیا قوم اور وطن کے نام میں اپنے لئے جو تاثیر رکھتی ہے مسلمانو
کے لئے وہ اثر صرف "اسلام" یا "خدا" کے لفظ میں ہے۔ یورپ
میں نیشن کا لفظ کہ کر ایک شخص ہزاروں ولولوں میں حرکت
پیدا کر سکتا ہے لیکن آپ کے پاس اس کے مقابلے میں اگر
کوئی لفظ ہے تو "خدا" یا "اسلام" ہے"۔

خلاصہ مطالب: اس نمبر کے خاتمے پر خلاصہ مطالب کی سرخی سے حضرت
مولانا نے حسب ذیل جامع نتائج کلام پیش کئے ہیں۔

۱ "موجودہ تغیر خیالات ایک قیمتی فرصت ہے۔ اگر دیوار
ٹیڑھی کھڑی کر دی گئی ہو اور آپ اس کے نقص کو محسوس کرتے بھی
ہیں۔ تاہم کسی بنی ہوئی چیز کا گرانا اور پھر از سر نو بنانا اس درجہ
مشکل کام ہوتا ہے کہ ممکن ہے برسوں تک آپ کو نئی دیوار
کھڑی کرنے کی مہلت نہ ملے۔ لیکن اگر طوفان یا بارش کے
ناگہانی حملے سے خود بخود گر جائے تو پھر آپ کو نئی دیوار بنانی
ہی پڑیگی یہی حال مسلمانوں کی قدیمی پالیسی کا ہے وہ خود بخود

گر چکی ہے نئی پالیسی کی دیوار بنانے کے پہلے۔ اب پچھلی دیوار گرانے کی ضرورت نہیں۔ صرف اس کی ضرورت ہے کہ اب جو بنیاد رکھی جائے وہ درست ہو۔

۲۔ مسلمانوں کے لئے ہر چیز ان کے مذہب میں ہے پس اگر وہ آجکل پولٹیکل زندگی اپنے اندر پیدا کرنا چاہتے ہیں تو اس کی جگہ اس شئے ہی کو کیوں نہ پیدا کریں جو نہ صرف پالٹیکس بلکہ قومی اعمال کی ہر شاخ کو زندہ کرے؟

۳۔ قرآنِ کریم صرف نماز اور وضو کے فرائض بتلانے ہی کے لئے نازل نہیں ہوا بلکہ وہ انسانوں کے لئے ایک کامل و اکمل قانونِ فلاح ہے جس سے انسانی زندگی کی کوئی شئے باہر نہیں پس مسلمانوں کی ہر وہ پالیسی اور ہر وہ عمل جو قرآنی تعلیم پر مبنی نہ ہوگا، ان کے لئے موجب فوز و فلاح نہیں ہوسکتا۔

۴۔ مسلمانوں کا تمام کاروبار خدا سے ہے۔ اور خدا کے سوا جو کچھ ہے۔ وہ ان کے لئے اصنام و طواغیت یعنی بتوں کا حکم رکھتا ہے۔ پس جب تک وہ خدا کے آگے نہیں جھکیں گے۔ دنیا کی کوئی چیز ان کے آگے نہیں جھکے گی۔

۵۔ ان کو اپنا نصب العین صرف "اسلام" بنانا چاہیئے اور ساری طاقت اس میں صرف کرنی چاہیئے کہ وہ ہر طرف سے ہٹ کر صرف احکام اسلام کے مطیع و منقاد ہو جائیں۔ اسلام ہی ان کے لئے پالٹیکس کی راہ کھولے گا۔ تعلیم کا حکم دے گا اخلاق و خصائل میں تبدیلی پیدا کرے گا۔ اور وہ تمام باتیں جن

ترقی یافتہ قوموں میں دیکھ کر وہ للچا رہے ہیں۔ نقصانوں اور مضرتوں سے صاف ہو کر ان میں پیدا ہو جائیں گی۔

"ھٰذِہٖ تَذْکِرَۃٌ فَمَنْ شَاءَ اتَّخَذَ اِلٰی رَبِّہٖ سَبِیْلًا"

اس کے بعد حضرت مولانا نے اس مضمون کا چوتھا نمبر تحریر فرمایا ہے جس پر یہ مضمون ختم ہو گیا ہے، اس نمبر کے بعض گراں القدر اور بصیرت افروز اقتباسات یہ ہیں:۔

اوروں کی دعوت انسانوں کی طرف ہے اور مولانا آزاد کی دعوت خدا کی طرف

" ہماری دعوت اثبات فوائد و نتائج سے مستغنی ہے۔ ہمارا یہ اعتقاد ہے کہ وہ انسانی عمل جو تعلیم الٰہی کی ہدایت بخشی سے خالی ہے کبھی فوز و فلاح نہیں پا سکتا۔ اگر ہم اپنی دعوت کی خوبیاں بیان نہ کر سکیں تو کچھ ہرج نہیں ہے کیونکہ اس شے کے لئے یہی ایک خوبی کافی ہے کہ اوروں کی دعوت انسانوں کی طرف ہے اور اس کی دعوت تعلیم الٰہی کی طرف۔

وَمَنْ اَحْسَنُ قَوْلًا مِّمَّنْ دَعَا اِلَی اللّٰہِ وَ عَمِلَ صَالِحًا وَّ قَالَ اِنَّنِیْ مِنَ الْمُسْلِمِیْنَ ۝

اور اس سے بہتر اور کس کی پکار ہو سکتی ہے جس نے اللہ کی طرف بلایا۔ اعمال نیک انجام دئے۔ اور اپنے تئیں کسی انسانی نسبت کی طرف نہیں بلکہ خدا کی طرف منسوب کر کے کہا کہ میں صرف "مسلم" ہوں "

انسانی اعمال و اقوال دوسرے انسان کے لئے محتاج تصدیق ہیں۔ مگر خدا کی آواز جب انسان کو مخاطب کرتی ہے تو وہ خود

حق اور صداقت ہے اور اپنی تصدیق کے لئے کسی استدلال کی محتاج نہیں۔ اگر سچ کوئی متشکل وجود ہوتا اور بولتا۔ تو کیا اس سے دلیل طلب کی جاتی کہ وہ سچ ہے؟ آفتاب اگر کہے کہ میں روشن ہوں۔ تو آپ اُس کے جواب میں کیا کہیں گے؟"

فطرت انسانی کی پکار

"پس ہر صحیح الفطرت انسان کے لئے یہ دعوت ایک ایسی صداقت ہے جو کسی بحث و استدلال کی محتاج نہیں، یہ اس کے لئے کوئی نئی دعوت نہیں ہے بلکہ اس کے اندر کی اس صدائے فطرت کا اعادہ ہے جو ہر آن اور ہر لمحہ اس کے اعماق قلب سے اُٹھ رہی ہے اور اس نقش خلقت کا عکس ہے۔ جو نقاش فطرت نے اس کے صفحۂ جبلت پر کھینچ دیا ہے، اگر باہر کے غوغائے ضلالت نے اُس کے سامعہ کو مشغول نہ کر دیا ہو۔ تو جب کان لگائے اس آواز کو سن سکتا ہے اور جب آنکھ بند کرے اس نقش کو دیکھ سکتا ہے۔

انّ فی ذٰلک لذکریٰ لمن کان
له قلبٌ او القی السمع وھو شھید ۞

اور اس میں بڑی بصیرت ہے اس کے لئے جو اپنے پہلو میں سوچنے والا دل رکھتا ہو اور جس کے سر میں سننے والا کان موجود ہو۔

البتہ یہ ضرور ہے کہ دسترخوان کے لذائذ کا اعتراف کرنے کے لئے ایک تندرست شخص کی زبان چاہیئے نہ کہ ایک ایسے مریض کی جو رات بھر تپ محرقہ میں مبتلا رہ کر بستر سے اٹھا ہو اگر آپ

منہ کا مزا بگڑا ہوا ہے تو آپ شہد کو حنظل ثابت کرنے سے پہلے بہتر ہے کہ اپنے کام و زبان کے ذوقِ زبونہ کو حاصل کرنے کی کوشش کریں"

مسلمانوں کی بدبختی "تاہم کیا کیجئے گا کہ بدبختی سے وہ زمانہ آگیا ہے جب ایک مسلمان کے آگے اسلام کی خوبیوں کو ثابت کرنا بہ نسبت ایک مسیحی کے زیادہ ضروری ہے۔ عین نصف النہار کی دھوپ میں کھڑا ہو کر ایک حریف آفتاب سے مقابلے کی آنکھیں لڑاتا ہے۔ اور پوچھتا ہے کہ اس کے روشن ہونے کا ثبوت کیا ہے؟ پیاس کسی کو نہیں ہے مگر پانی سے پوچھتے ہیں کہ اسے کیوں تشنگی کے لئے مفید تسلیم کیا جائے؟

حریفِ کاوشِ مژگانِ خوں ریزش نئی زاہد
بدست آور رگِ جانے و نشتر را تماشا کن"

راہِ یقین صرف اسلام کی راہ ہے مولانا آزاد "اتباعِ شک و یقین" کی سرخی کے ماتحت تحریر فرماتے ہیں:

اولین اور بنیادی شئے تو یہ ہے کہ اگر ایک راہ یقین کی دعوت آپ کو پکار رہی ہے تو آپ شک اور ظن کی طرف کیوں دوڑتے ہیں کہ وہ پالیسی جو بعض انسانی اتباع اور نظریہ قائم کی جائے گی شک اور گمان ہوگی کیونکہ انسانی دماغ کا ہر خیال شک ہے خواہ اس کا نام محدود علم ہو یا محصور تجربہ اور یقین کا سرچشمہ اگر کوئی ہے تو وہ اسلام یا مذہب حقیقی ہے۔

یہی وجہ ہے کہ قرآنِ حکیم نے ہر جگہ کفر و ضلالت اور الحاد

دہریت کو شک اور گمان کے لفظ سے تعبیر کیا ہے، کیونکہ انسانی دماغ کی انتہائی سرحدیں بھی اگر ڈھونڈا جائے تو یقین کا پتہ نہیں چل سکتا۔ ایک ملحد فلسفی ہر چیز میں شک کر سکتا ہے کہ یہ کیونکر ہے؟ لیکن اگر اس سے پوچھا جائے کہ نہیں ہے تو نفی کے لئے حکم یقینی کہاں ہے؟ تو اس کے پاس اس کا کچھ جواب نہیں ہے مگر مذہب ایک یقین کی دعوت لے کر آتا ہے۔ وہ حقائق اور وجود میں شک نہیں پیدا کرتا۔ بلکہ حقائق کے لئے ایک یقین اپنے ساتھ رکھتا ہے اور کہتا ہے کہ:-

هذه سبيلي ادعوا الى الله على بصيرة انا و من اتبعني و سبحان الله وما انا من المشركين ۔

یہ ہے میرا طریقہ کہ اللہ کی طرف بلاتا ہوں اس یقین پر جو مجھ کو اور میرے ماننے والوں کو طریق الہی پر ہے۔

اس نے ہر جگہ منکرین تعلیم الہی کو سب سے بڑا الزام یہ دیا ہے:-

ما لهم بذلك من علم ان يتبعون الا الظن و ان الظن لا يغني من الحق شيئاً ۔

ان کے پاس علم و یقین نہیں سوا اسکے کہ شک اور گمان میں گمراہ ہو رہے ہیں حالانکہ شک یقین کے مقابلے میں کہاں ٹھہر سکتا ہے؟

دوسری جگہ کہا۔

هل عندكم من علم فتخرجوه لنا ان تتبعون الا الظن وان انتم الا تخرصون ٥

کیا تمھارے پاس کوئی علم ہے جو ہمارے آگے پیش کر سکو؟ حقیقت یہ ہے کہ کوئی علم نہیں، صرف اپنے وہموں پر چلتے ہو۔

بلکہ اگر قرآن کریم پر تدبر و تفکر کی نظر ڈالی جائے تو ثابت ہوتا ہے کہ کفر اور شک اس کی اصطلاح میں ہم معنی الفاظ ہیں اور وہ کفر کو ہر جگہ شک پرستی سے اور اسلام کو یقین و علم سے تعبیر کرتا ہے۔

غیر متغیر اور مستقل رائے صرف اسلام رکھتا ہے۔

حضرت مولانا "عدم تغیر اور استقلال" کی سرخی سے لکھتے ہیں:۔

"ہم نے کسی گزشتہ نمبر میں لکھا تھا کہ مسلمانوں کو اپنی ایک ایسی پولٹیکل پالیسی تیار کرنی چاہئے جو کبھی متغیر نہ ہو اور جس کی بنیاد ایک محکم عقیدہ ہو نہ کہ بعض خارجی اسباب۔ لیکن مذہب کے سوا اور کونسا اعتقاد ہو سکتا ہے جو تغیر و تبدل سے محفوظ ہو؟ انسانی آرا و قیاس میں تغیر لازمی ہے کیونکہ وہ ظنون و اوہام ہیں۔ اور خارجی اسباب و علل کے تابع لیکن احکام الٰہی کی پہلی پہچان یہ ہے کہ وہ ایسے یقینیات ہوں جن میں کبھی تغیر نہ ہو سکے۔ اگر کوئی مذہبی حکم متغیر ہو سکتا ہے تو وہ اس کا مستحق ہی کب ہے کہ اس کو مذہب کے

نام سے تعبیر کیا جائے ؟ وَلَن تَجِدَ لِسُنَّةِ اللَّهِ تَبْدِيلًا
پس اگر مسلمانوں کی پولٹیکل پالیسی ان کے مذہبی اعتقاد پر
مبنی ہوئی۔ تو جب تک ان کے دلوں میں اسلام کا اعتقاد باقی
ہے اس میں کبھی تبدیلی نہیں ہو سکتی۔ ان کے ہمسایوں کی پالیسی
بدل جائے گی مگر ان کی پالیسی بدل نہ سکے گی۔ کیونکہ جس راہ نما
کے ہاتھ میں ان کا ہاتھ ہوگا اس کی راہ ایک ہی ہے۔ اگر گورنمنٹ
کی پالیسی میں تغیر ہو تو اس کا بھی ان پر کچھ اثر نہیں پڑ سکتا کیونکہ
انسانی حکومتوں کے اصول حکمرانی ہی نہیں بلکہ سرے سے حکومتیں
بدل بھی جائیں تو بھی اسلام نہیں بدل سکتا۔ اور اسلام نہیں بدل
سکتا تو اس سے ماخوذ اور مبنی اعتقاد بھی نہیں بدل سکتا۔"

مسلمانوں کا موقف اتحاد

جب مسلمان اپنے پولٹیکل جد و جہد کو محض سیاسی ولولوں سے نہیں
بلکہ اپنے اعمال دینی کی طرح شروع کریں گے۔ تو ان کی زندگی
اور اعمال، احکام دینی کے تحت میں آکر بالکل محدود و متعین ہو
ہو جائیں گے۔ اختلاف و نزاع تو جب ہو جب انسانی دماغ
کو اس میں دخل ہو۔ مذہبی احکام تعبدیں اختلاف کی کوئی گنجائش
نہیں۔ ان کا پالٹکس مذہب کی حکومت میں آ جائے گا۔ وہ
خود مختار نہ ہوگا کہ اپنے لئے مقاصد اور اس کے حاصل کرنے
کے وسائل ڈھونڈھے۔ بلکہ جو ایک ہی مقصد اور ایک ہی طریق
حصول مقصد اس کو مذہب بتلا دے گا مجبور ہوگا کہ صرف اسی میں
محدود رہے۔ جس طرح ایک مسلمان نماز پڑھتا ہے اور روزہ رکھتا

ہے۔ بالکل اسی طرح ایک سیاسی مقصد کو حکم الٰہی سمجھ کر تلاش کریگا"۔
قارئین کرام! آپ نے حضرت مولانا ابوالکلام آزاد کے مضامین کے اقتباسات پڑھے، ان سے آپ کو معلوم ہو گیا ہوگا کہ اس ہندی رہنمائے اعظم نے اول اول دعوت و تبلیغ کے میدان میں قدم رکھا تو اس کی دعوت کس نصب العین کی جانب تھی؟ اور وہ نصب العین قرآنِ مجید کے پیغام اور حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت سے کس قدر ہم آہنگ ہے! لیکن اگر آج ہماری آنکھیں اپنے محبوب و محترم داعی کو اس شاہراہ سے الگ دیکھ رہی ہیں جہاں کھڑے ہو کر اس نے ہندوستان کے گم کردہ راہ مسلمانوں کو پکارا تھا تو ہمارا فرض کیا ہے؟ اس کی بتائی ہوئی صراط مستقیم اور اس کے پیش کردہ نصب العین کو پشت دے کر ہم اس کے پیچھے ہولیں؟ یا جس شاہراہ پر کھڑے ہو کر جس منزل کی طرف اس نے ہم کو بلایا تھا اور جس کے سوا کوئی راہ اور کوئی منزل حق نہیں اس کی جانب ہم اُسے بھی بلائیں اور جب تک ہماری پکار سن کر وہ اپنی بتائی ہوئی شاہراہ پر ہمارے پاس واپس نہ آجائے ہم اُسے پکارتے ہی رہیں ——؟ پکارتے ہی رہیں ——؟ وہ ہمارا عزیز و محترم رہنما ہے اس نے ہمیں اس وقت راہِ حق دکھائی جب ہر طرف ضلالت کی گھٹا ٹوپ اندھیاری چھائی ہوئی تھی پس ہماری کوشش یہی ہونی چاہئے کہ کہ وہ اپنی بتائی ہوئی شاہراہ کی طرف لوٹ آئے ہمیں راہِ حق دکھا کر اس نے ہم پر جو احسانِ عظیم کیا ہے اس کے بارے ہم اس کے سوا اور کسی صورت سے سبکدوش نہیں ہو سکتے۔

حکومتِ الٰہیّہ کی ایک ولولہ انگیز دعوت

مولانا آزاد کا ایک ایمان افروز مقالہ

حضرت مولانا ابوالکلام آزاد نے جولائی ۱۹۱۴ء میں "اِن الحکم الا للّٰہ" کے عنوان سے ایک مقالہ سپرد قلم فرمایا تھا جو حکومتِ الٰہیہ کی ایک ولولہ انگیز دعوت ہے۔

اس ایمان افروز مقالہ کے اقتباسات ملاحظہ کیجیے

اِنِ الحکم الا لِلّٰہ۔ (۱۳-۴)

الحکم الجاھلیۃ یبغون ومن احسن من اللّٰہ حکما القوم یومنون۔ (۵: ۵۱)

و لہ الحکم والیہ ترجعون (۲۸: ۷۰)

فالحکم للّٰہ العلی الکبیر (۴۰: ۱۲)

وھو خیر الحاکمین (۱۳: ۱۰۹)

الا لہ الحکم وھو اسرع الحاسبین (۶: ۶۲)

" لوگ دنیا میں سینکڑوں قوتوں کے محکوم ہیں۔ دوست و احباب کے محکوم ہیں، استاد و مرشد کے محکوم ہیں، امیروں حاکموں اور بادشاہوں کے محکوم ہیں۔ اگرچہ وہ دنیا میں بغیر کسی زنجیر اور بیڑی کے آئے تھے مگر دنیا نے ان کے پاؤں میں بہت سی بیڑیاں ڈال دی ہیں۔

لیکن مومن و مسلم وہ ہستی ہے جو صرف ایک ہی کی محکوم ہے۔ اس کے گلے میں محکومی کی ایک بوجھل زنجیر ضرور ہے مگر مختلف سمتوں میں کھینچنے والی بہت سی ہلکی زنجیریں نہیں ہیں۔ وہ ماں باپ کی اطاعت اور فرمانبرداری کرتا ہے کیونکہ اس کے ایک ہی حاکم نے ایسا کرنے کا حکم دیا ہے۔ وہ دوستوں سے محبت رکھتا ہے کیوں کہ اسے رفیقوں اور ساتھیوں کے ساتھ سچے برتاؤ کی تلقین کی گئی ہے وہ اپنے سے ہر بزرگ اور ہر بڑے کا ادب ملحوظ رکھتا ہے کیونکہ اس کے ادب آموز حقیقی نے اُسے ایسا ہی بتلایا ہے وہ بادشاہوں اور حاکموں کا حکم بھی مانتا ہے کیوں کہ حاکموں کے ایسے حکموں کو ماننے سے اُسے نہیں روکا گیا ہے جو اس کے حاکم حقیقی کے حکموں کے خلاف نہ ہوں۔ وہ دنیا کے ایسے بادشاہوں کی بھی اطاعت کرتا ہے جو اس کی آسمانی بادشاہت کی اطاعت کرتے ہیں کیونکہ اُسے تعلیم دی گئی ہے کہ وہ ہمیشہ ایسا ہی کرے لیکن یہ سب کچھ جو وہ کرتا ہے اس لئے تو نہیں کرتا کہ ان سب کے اندر کوئی حکم ماننا اور ان کو جھکنے کی جگہ سمجھتا ہے۔ بلکہ صرف اس لئے کہ طاعت صرف ایک ہی کے لئے ہے۔ اور حکم صرف ایک ہی کا ہے۔ جب اس ایک ہی حکم دینے والے نے ان سب باتوں کا حکم دے دیا۔ تو ضرور ہے کہ خدا کے لئے ان سب بندوں کو بھی مانا جائے اور اللہ کی اطاعت کی خاطر وہ اس کے بندوں کا بھی مطیع ہو جائے۔

پس فی الحقیقت دنیا میں ہر انسان کے لئے بے شمار

حاکم اور بہت سی جھکانے والی قوتیں ہیں لیکن مومن کے لئے صرف ایک ہی ہے اس کے سوا کوئی نہیں۔ وہ صرف اسی کے آگے جھکتا ہے اور صرف اسی کو مانتا ہے۔ اس کی اطاعت کا حق ایک ہی کو ہے اس کی پیشانی کے جھکنے کی چوکھٹ ایک ہی ہے اور اس کے دل کی خریداری کے لئے ایک ہی خریدار ہے۔ وہ دنیا میں اگر کسی دوسری ہستی کی اطاعت کرتا بھی ہے تو صرف اسی ایک کے لئے۔ اس لئے اس کی بہت سی اطاعتیں بھی اس ایک ہی اطاعت میں شامل ہو جاتی ہیں۔ ؎

مقصود ما ز دیر و حرم جز حبیب نیست
ہر کجا کنیم سجدہ بداں آستاں رسد

اعلانِ یوسفی حضرت یوسف علیہ السلام نے قید خانے میں اپنے ساتھیوں سے کیا پوچھا تھا؟

ءَ اَرْبَابٌ مُتَفَرِّقُوْنَ خَیْرٌ اَمِ اللّٰہُ الْوَاحِدُ الْقَہَّارُ (۱۲ : ۳۹)

"بہت سے معبود بنا لینا بہتر ہے۔ یا ایک ہی قہار و مقتدر خدا کو پوجنا۔"

یہی وہ خلاصۂ ایمان و اسلام ہے جس کی ہر مومن و مسلم کو قرآن کریم نے تعلیم دی ہے:۔

اِنِ الْحُکْمُ اِلَّا لِلّٰہِ اَمَرَ اَلَّا تَعْبُدُوْا اِلَّا اِیَّاہُ۔

"تمام جہان میں اللہ کے سوا کوئی نہیں جس کی حکومت

ہو اس نے ہمیں حکم دیا ہے کہ اس کے سوا اور کسی کو
نہ پوجیں اور نہ کسی کو اپنا معبود بنائیں۔
یہی "دین قیم" ہے جس کی پیروی کا حکم دیا گیا ہے۔
ذالک الدین القیم ولکن اکثر
الناس لا یعلمون (۱۲ : ۴۰)
حدیث صحیح ہے۔ کہ فرمایا:۔
لا طاعة المخلوق فی معصیة
الخالق (بخاری و مسلم)
"جس بات کے ماننے میں خدا کی نافرمانی ہو
اس میں کسی بندے کی فرمانبرداری نہ کرو"
اسلام نے یہ کہہ کر فی الحقیقت ان تمام ماسوائے اللہ اطاعتوں
اور فرمانبرداریوں کی بندشوں سے مومنوں کو آزاد و حر کامل
کر دیا جن کی بیڑیوں سے تمام انسانوں کے پاؤں بوجھل ہو رہے
تھے۔ اور اس ایک ہی جملہ میں انسانی اطاعت اور پیروی کی
حقیقت اس وسعت اور احاطہ کے ساتھ سمجھا دی کہ اس کے
بعد اور کچھ باقی نہ رہا۔ یہی ہے جو اسلامی زندگی کا دستور العمل ہے
اور یہی ہے جو مومن کے تمام اعمال و اعتقادات کی ایک مکمل تصویر
ہے۔ اس تعلیم الٰہی نے بتلا دیا ہے کہ جتنی اطاعتیں، جتنی فرمانبرداریاں
اور جس قدر بھی تسلیم و اعتراف ہے صرف اسی وقت تک کے
لئے ہے جب تک بندے کی بات ماننے سے خدا کی بات
نہ جاتی ہو۔ اور دنیا والوں کے وفادار بننے سے خدا کی حکومت

کی بغاوت نہ ہوئی ہو۔ لیکن کبھی ایسی صورت پیش آجائے کہ اللہ اور اس کے بندوں کے احکام میں مقابلہ آپڑے تو پھر تمام اطاعتوں کا خاتمہ، تمام عہدوں اور شرطوں کی شکست، تمام رشتوں اور ناطوں کا انقطاع اور تمام دوستیوں اور محبتوں کا اختتام ہے۔ اس وقت نہ تو حاکم حاکم ہے نہ بادشاہ بادشاہ، نہ باپ باپ، نہ بھائی بھائی، سب کے آگے تمرد سب کے ساتھ انکار، سب کے سامنے سرکشی، سب کے ساتھ بغاوت پہلے جس قدر نرمی تھی اتنی ہی اب سختی چاہئے، پہلے جس قدر اعتراف تھا، اتنا ہی اب تمرد چاہیے۔ پہلے جس قدر فرمانبرداری تھی۔ اتنی ہی اب نافرمانی مطلوب ہے۔ پہلے جس قدر جھکاؤ تھا۔ اتنا ہی اب غرور ہو، کیونکہ رشتے کٹ گئے۔ اور عہد توڑ ڈالے گئے۔ رشتہ دراصل ایک ہی تھا۔ اور یہ سب رشتے اسی ایک رشتے کی خاطر تھے حکم ایک ہی کا تھا۔ اور یہ سب اطاعتیں اس ایک کی اطاعت کے لئے تھیں۔ جب ان کے ماننے میں اس سے انکار اور ان کی وفاداری میں اس سے بغاوت ہونے لگی تو جس کے حکم سے رشتہ جوڑا تھا اسی کی تلوار نے کاٹ بھی دیا۔ اور جس کے ہاتھ نے ملایا تھا اسی کے ہاتھ نے الگ بھی کردیا۔ کہ لاطاعۃ المخلوق فی معصیۃ الخالق۔

سرور کائنات اور سید المرسلین (صلعم) سے بڑھ کر مسلمانوں کا کون آقا ہوسکتا ہے لیکن خود اس نے بھی جب عقبہ میں انصار سے بیعت لی تو فرمایا کہ "اطاعت فی معروف" میری اطاعت تم پر

اسی وقت تک واجب ہے۔ جب تک کہ میں تم کو نیکی کا حکم دوں جب اس شہنشاہِ کونین کی اطاعت مسلمانوں پر نیکی اور معروف کے ساتھ مشروط ہے تو پھر دنیا میں کون بادشاہ، کونسی حکومت، کون سے پیشوا، کون سے رہنما اور کونسی قوتیں ایسی ہوسکتی ہیں جن کی اطاعت ظلم و عدوان کے بعد بھی ہمارے لیئے باقی رہے؟

مومن ایک ہی ذات کا محکوم ہے

آدم کی اولاد دو کی محکوم نہیں ہوسکتی۔ وہ ایک سے ملے گی دوسرے کو چھوڑے گی۔ ایک سے جوڑے گی دوسرے سے کٹے گی۔ پھر خدارا مجھے بتاؤ کہ ایک مومن کس کو چھوڑے گا۔ اور کس سے ملے گا؟ ایک ملک کے دو بادشاہ نہیں ہو سکتے۔ ایک باقی رہے گا۔ ایک کو چھوڑنا پڑے گا۔ پھر مجھے بتاؤ۔ کہ مومن کی اقلیم دل کس کی بادشاہت قبول کرے گی؟"........

"دنیا اور اس کی بادشاہیاں فانی ہیں۔ ان کے جبروت و جلال کو ایک دن مٹنا ہے۔ خدائے منتقم و قہار کے بھیجے ہوئے فرشتہ ہائے عذاب انقلاب و تغیرات کے حربے لے کر اترنے والے ہیں۔ ان کے قلعے مسمار ہو جائیں گے۔ ان کی تلواریں کند ہو جائیں گی۔ ان کی فوجیں ہلاک ہوں گی۔ ان کی توپیں ان کو پناہ نہ دیں گی۔ ان کے خزانے ان کے کام نہ آئیں گے۔ ان کی طاقتیں نیست و نابود کر دی جائیں گی۔ ان کا تاجِ غرور ان کے سر سے اتر جائیگا ان کا تختِ جلال و عظمت واژگوں نظر آئے گا۔

وَيَوْمَ تَشَقَّقُ السَّمَاءُ بِالْغَمَامِ وَنُزِّلَ

الملٰئکۃ تنزیلاہ الملک یومئذ الحق
للرحمٰن وکان یوما علی الکافرین عسیرا
(۲۸ : ۴۵)

اور جس دن آسمان ایک بادل کے ٹکڑے پر سے
پھٹ جائے گا اور اس بادل کے اندر سے فرشتے
جوق در جوق اتارے جائیں گے۔ اس دن کسی کی
بادشاہت باقی نہ رہے گی۔ صرف خدائے رحمٰن
ہی کی حکومت ہوگی۔ اور یاد رکھو کہ وہ دن کافروں کے
لئے بہت ہی سخت دن ہوگا۔

پھر اس دن کہ رب الافواج اپنے ہزاروں ہزار قدوسیوں کے ساتھ نمودار
ہوگا۔ اور ملک السمٰوات والارض کا نقیب پکارے گا
لمن الملک الیوم ﷲ الواحد القہار
(۴۰ : ۱۶)

آج کے دن کس کی بادشاہی ہے؟ کسی کی نہیں صرف
خدائے واحد و قہار کی!!

تو اس وقت کیا عالم ہوگا ان انسانوں کا جنھوں نے بادشاہ
ارض و سما کو چھوڑ کر مٹی کے تودوں کو اپنا بادشاہ بنا لیا ہے۔ اور
ان کے حکموں کی اطاعت کو خدا کے حکموں کی اطاعت پر ترجیح
دیتے ہیں؟ آہ اس دن وہ کہاں جائیں گے جنھوں نے انسانوں
سے صلح کرنے کے لئے خدا سے جنگ کی، اور اپنے اس ایک ہی
آقا کو ہمیشہ اپنے رب سے روٹھا ہوا رکھا؟ وہ پکاریں گے پھر

جواب نہ دیا جائے گا۔ وہ فریاد کریں گے۔ پر سنی نہ جائے گی۔ وہ توبہ کریں گے۔ پر قبول نہ ہوگی۔ وہ نادم ہوں گے۔ پر ندامت کام نہ دے گی"۔۔۔۔۔۔۔۔۔

"پس سفر سے پہلے زادِ راہ کی فکر کرلو۔ اور طوفان سے پہلے کشتی بنالو۔ کیونکہ سفر نزدیک ہے اور طوفان کے آثار ظاہر ہوگئے ہیں۔ جن کے پاس زادِ راہ نہ ہوگا وہ بھوکے مریں گے۔ اور جن کے پاس کشتی نہ ہوگی وہ سیلاب میں غرق ہوجائیں گے۔ جب تم دیکھتے ہو کہ مطلع غبار آلود ہوا اور دن کی روشنی بدلیوں میں چھپ گئی تو تم سمجھتے ہو کہ برق و باراں کا وقت آگیا۔ پھر تمھیں کیا ہوگیا ہے کہ دنیا کے امن و امان کا مطلع غبار آلود ہو رہا ہے۔ دین الٰہی کی روشنی ظلمت کفر و طغیان میں چھپ رہی ہے مگر تم یقین نہیں کرتے کہ موسم بدلنے والا ہے۔ اور تیار نہیں ہوتے کہ انسانی بادشاہتوں سے کٹ کر خدا کی بادشاہت کے مطیع ہوجاؤ؟ کیا تم نہیں چاہتے کہ خدا کے تخت جلال کی منادی پھر بلند ہو اور اس کی زمین صرف اسی کے لئے ہوجائے"۔

حتیٰ لا تکون فتنۃ ویکون الدین للہ

(۲ : ۱۸۹)

حکومتِ الٰہی اور انسانی بادشاہتوں میں جنگ

"آج خدا کی حکومت اور انسانی بادشاہتوں میں ایک سخت جنگ بپا ہے۔ شیطان کا تخت زمین کے سب سے

بڑے حصے پر چھا دیا گیا ہے۔ اس کے گھرانے کی وراثت اس کے پوجنے والوں میں تقسیم کر دی گئی ہے۔ اور "دجّال" کی فوج ہر طرف پھیل گئی ہے۔ یہ شیطانی بادشاہتیں چاہتی ہیں کہ خدا کی حکومت کو نیست و نابود کر دیں۔ ان کے دائیں جانب دنیوی لذّتوں اور عزتوں کی ایک ساحرانہ جنّت ہے اور بائیں جانب جسمانی تکلیفوں اور عقوبتوں کی ایک دکھائی دینے والی جہنّم بھڑک رہی ہے۔ جو فرزندِ آدم خدا کی بادشاہت سے انکار کرتا ہے۔ یہ دجّالِ کفر و ظلمت اس پر اپنی جادو کی جنت کا دروازہ کھول دیتے ہیں کہ جو حق پرستوں کی نظر میں فی الحقیقت خدا کی لعنت اور پھٹکار کی جہنم ہے۔ "لابثین فیھا احقابا۔ لا یذوقون فیھا بردًا ولا شرابا۔ (۷۸: ۲۳) اور جو خدا کی بادشاہت کا اقرار کرتے ہیں ان کو ابلیسی عقوبتوں اور جسمانی سزاؤں کی جہنم میں دھکیل دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ "حرقوہ وانصروا آلھتکم (۲۱: ۶۸) مگر فی الحقیقت سچائی کے عاشقوں اور راستبازی کے پرستاروں کے لئے وہ جہنم جہنم نہیں ہے۔ لذتوں اور راحتوں کی ایک جنت النعیم ہے۔ کیوں کہ ان کے لسانِ ایمان و ایقان کی صدا یہ ہے کہ:۔

فاقض ما انت قاض انما تقضی ھٰذہ الحیٰوۃ الدنیا انا اٰمنا بربنا لیغفرلنا خطایانا (۲۰: ۷۵)

اے دنیوی سزاؤں کی طاقت پر مغرور ہونے والے

بادشاہ تو جو کچھ کرنے والا ہے کرگزر۔ تو صرف دنیا کی
اس زندگی اور گوشت اور خون کے جسم ہی پر حکم چلا
سکتا ہے پس چلا دیکھ ہم تو اپنے پروردگار پر ایمان
لا چکے ہیں تاکہ ہماری خطاؤں کو معاف کرے۔ تیری
دنیاوی سزائیں ہمیں اس کی راہ سے باز نہیں رکھ سکتیں

جب کہ یہ سب کچھ ہو رہا ہے اور زمین کے ایک خاص ٹکڑے
ہی میں نہیں بلکہ اس کے ہر گوشے میں آج بھی مقابلہ جاری ہے
تو بتلاؤ پرستارانِ دینِ حنیفی ان دجاجلہ کفر و شیطنت اور اس
حکومت و امر الٰہی میں سے کس کا ساتھ دیں گے؟ کیا ان کو اس
آگ کے شعلوں کا ڈر ہے جو دجال کی حکومت اپنے ساتھ ساتھ سلگاتی
آتی ہے؟ لیکن کیا ان کو معلوم نہیں کہ اُن کا مورثِ اعلیٰ کون تھا؟
دینِ حنیف کے اولین داعی نے بابل کی ایک ایسی ہی سرکش حکومت
کے مقابلے میں خدائی حکومت کو ترجیح دی۔ اور اُسے آگ میں ڈالنے
کے لئے شعلے بھڑکائے گئے۔ مگر اس کی نظر میں ہلاکت کے وہ شعلے
گلزارِ بہشت کے شگفتہ پھول تھے۔ قلنا یا نار کونی بردًا
وسلامًا علیٰ ابراھیم ۝ (۲۱ : ۶۹)

پیروانِ حق کس سوچ میں ہیں

کیا ان کے دل میں دنیوی
لذتوں اور عزتوں کی اس جھوٹی
جنت کی طمع پیدا ہو گئی ہے جس کے فریب باطل سے یہ جنود
شیطانی انسانی روح کو فتنہ میں ڈالنا چاہتی ہے؟ اگر ایسا ہے
تو کیا انھیں خبر نہیں کہ مصر کا بادشاہ حکومتِ الٰہی کا منکر ہو کر اپنی

عظیم الشان گاڑیوں اور بڑے بڑے رتھوں سے اور اس ملک سے جس پر اُسے "رَبِّ اَعلیٰ" ہونے کا گھمنڈ تھا کتنے دن متمتع ہو سکا؟

ان فرعون علا فی الارض وجعل اهلها شیعا یستضعف طائفة منهم یذبح ابناءهم ویستحی نساءهم انه کان من المفسدین ۝ ونرید ان نمن علی الذین استضعفوا فی الارض ونجعلهم ائمة ونجعلهم الوارثین ۝ ونمکن لهم فی الارض ونری فرعون وهامان وجنودهما منهم ما کانوا یحذرون ۝

(۲۸ : ۳)

فرعون ارضِ مصر میں بہت ہی بڑھ چڑھ نکلا تھا۔ اس نے ملک کے باشندوں میں تفریق کر کے الگ الگ گروہ قرار دے رکھے تھے۔ ان میں سے ایک گروہ بنی اسرائیل کو اس قدر کمزور اور بے بس سمجھ رکھا تھا۔ کہ ان کے فرزندوں کو قتل کرتا اور ان کے اعراض و ناموس کو برباد کرتا اس میں شک نہیں کہ وہ زمین کے مفسدوں میں سے بڑا ہی مفسد تھا۔ لیکن بایں ہمہ ہمارا فیصلہ یہ تھا کہ جو قوم اس کے ملک میں سب سے زیادہ کمزور سمجھی گئی تھی اُسی پر احسان کریں اسی قوم کے لوگوں کو وہاں کی سرداری

و ریاست بخشیں انھیں کو وہاں کی سلطنت کا وارث
بنائیں اور انھیں کی حکومت کو تمام ملک میں قائم کریں
اس سے ہمارا مقصد یہ تھا کہ فرعون و ہامان اور اُس کے
لشکر کو جس ضعیف قوم کی طرف سے بغاوت و خروج
کا کھٹکا لگا رہتا تھا اسی کے ہاتھوں ان کے ظلم و
استبداد کا نتیجہ ان کے آگے آئے۔

مُسلمانو! کیا متاعِ آخرت بیچ کر دنیا کے چند خزف ریزوں پر
قناعت کی خواہش ہے؟ کیا اللہ کی حکومت سے باغی رہ کر دنیا
کی حکومتوں سے صلح کرنے کا ارادہ ہے؟ کیا نقدِ حیات ابدی بیچ
کر معیشت چند روزہ کا سامان کر رہے ہو؟ کیا تمھیں یقین نہیں

ما ھٰذہ الحیٰوۃ الدنیا الا لھو و
لعب ، و ان الدار الاٰخرۃ لھی الحیوان
(۲۹ ۶۴)

یہ دنیا کی زندگی (جو تعلقِ الٰہی سے خالی ہے) اس کے
سوا اور کیا ہے کہ فانی خواہشوں کے بہلانے کا ایک
کھیل ہے؟ اصلی زندگی تو آخرت ہی کی زندگی ہے
جس کے لئے اس زندگی کو تیار کرنا چاہیئے۔

اگر تم صرف دنیا ہی کے طالب ہو جب بھی اپنے خدا کو نہ چھوڑو
کیونکہ وہ دنیا و آخرت دونوں بخشنے کے لئے تیار ہے تم کیوں
صرف ایک ہی پر قناعت کرتے ہو؟

و من کان یرید ثواب الدنیا فعند اللہ

ثواب الدنیا والاخرۃ ہ (۴: ۳۳)
اور جو شخص دنیا کی بہتری کا طالب ہے اس سے کہہ دو کہ صرف دنیا ہی کے لئے کیوں ہلاک ہوتا ہے؟ حالانکہ خدا تو دین اور آخرت دونوں کی بہتری دے سکتا ہے، وہ خدا کے پاس آئے اور آخرت کے ساتھ دنیا کو بھی لے۔

مسلمانو! پکارنے والا پکار رہا ہے کہ اب بھی خدائے قدوس کی سرکشی اور نافرمانی سے باز آجاؤ اور باز آجاؤ۔ اور بادشاہِ ارض وسما کو روٹھا ہوا نہ چھوڑو۔ جس کے روٹھنے کے بعد زمین و آسمان کی کوئی ہستی بھی تم سے من نہیں سکتی! اس سے بغاوت نہ کرو بلکہ دنیا کی تمام طاقتوں سے باغی ہو کر صرف اسی کے وفادار ہو جاؤ۔"

یہ ہے مولانا ابوالکلام کی دعوت! یہ دعوت جس طرح جولائی ۱۹۱۴ء میں حق تھی اسی طرح فروری ۱۹۴۵ء میں بھی حق ہے یہ دعوت دینی حقائق پر مبنی ہے اور دینی حقائق غیر مبدل ہوتے ہیں لا مبدل لکلمٰت اللّٰہ ہ

حضرت مولانا آزاد کا ایک تاریخی بیان

"میں نے ہمیشہ خدا کا کام کیا ہمیشہ قرآن کی دعوت دی"

۱۹۱۶ء میں حضرت مولانا ابوالکلام آزاد کا الہلال بند ہو چکا تھا، اور اس کی جگہ مولانا "البلاغ" نکال رہے تھے، اس سال

بنگال کی حکومت نے مولانا کو بنگال سے نکل جانے کا حکم دیا۔ اس موقع پر ۱۷۔۲۴۔۳۱ مارچ ۱۹۱۶ء کے مشترکہ "البلاغ" میں مولانا نے اپنا ایک اہم بیان شائع کیا تھا۔ اس وقت تک مولانا کی دعوت کس چیز کی طرف تھی، یہ مولانا کے اس تاریخی بیان سے ظاہر ہوگا۔

مولانا تحریر فرماتے ہیں۔

"ان لوگوں کے لیئے جن کو اول روز ہی،

یاعبادی الذین آمنوا ان ارضی واسعۃ فایای فاعبدون۔ (۲۹: ۵۶)

اے میرے بندو کہ مجھ پر ایمان رکھتے ہو یقین کرو کہ میری زمین بہت وسیع ہے اور کسی ایک ٹکڑے میں محدود نہیں پس میرے آگے جھکو اور صرف میری ہی بندگی کرو۔

کا حکم مل چکا ہے۔ یہ احکام بالکل بے اثر ہیں اور ترک وطن وذہاب الی اللہ تو وہ منزل محبوب ومطلوب ہے جس کا منزل تبلیغ دعوت کے بعد پیش آنا ہر بقاء وظہور کے لیئے ناگزیر ہے۔ پس اگر یہ منزل پیش آگئی ہے تو خدائے قدوس کی تحمید وتقدیس کرنی چاہیئے۔ کہ انشاء اللہ آخری منزل بھی دور نہیں اعملوا علیٰ مکانتکم انی عامل فسوف تعلمون من تکون لہ عاقبۃ الدار۔

مولانا کا اصول دعوت

حضرت مولانا اپنے اصول دعوت اور مسلمانوں کی فلاح وسعادت کے متعلق تحریر فرماتے ہیں:۔

"جب کہ تمام زمانے کے سامنے انسانوں کے بنائے ہوئے طریقے تھے اور جب کہ سعی و عمل کا ہر ولولہ اس سے زیادہ بلند نہیں ہو سکتا تھا کہ غیر قوموں سے کہ مجلسی و اجتماعی طریقوں کی ادھوری اور ناقص تقلید کر کے امت مرحومہ کو بھی ان کی طرف دعوت دیجائے تو فضل و رحمت الٰہی نے اس عاجز کی رہنمائی کی۔ اور بغیر اس کے کہ کوئی انسانی نمونہ یا مادی تحریک اس کے لئے محرک ہوئی ہو خود بخود اس راہِ عمل کو کھول دیا جس کو بغیر لطف و توفیق الٰہی کے اس دنیا میں کوئی نہیں پا سکتا۔ پس ابتدا ہی سے اس عاجز نے تمام نام نہاد سیاسی و تعلیمی و قومی تحریکوں سے الگ ہو کر صرف دعوت و تبلیغ اسلامی و قرآنی کی صراطِ مستقیم کو اپنا شعار و دستور العمل قرار دیا۔ اور ایک ایسے عہدِ ضلالت میں جو طرح طرح کی انسانی آوازوں سے گونج اٹھا تھا۔ سب سے پہلے اجیبوا داعی اللّٰہ کی صدا بلند کی۔ نیز اس گم شدہ حقیقت کو آشکارا کر دینے کی توفیق پائی کہ مسلمانوں کی نجات و فلاح نہ تو محض دعوتِ تعلیم میں ہے نہ دعوتِ قومیت و سیاست میں۔ نہ انجمنوں کی کثرت میں ہے اور نہ محض مدرسوں اور کالجوں کے قائم کرنے میں بلکہ جب تک حضرات انبیائے کرام کے اسوۂ حسنہ اور داعی اسلام کی سنت مقدسہ سے کوئی دعوت ماخوذ نہ ہو گی اور انسانی طریقوں کی جگہ الٰہی سرچشموں سے فیض یاب ہو کر نشو و نما نہ پائے گی۔ اس وقت تک وہ کامیابی اور فلاح حاصل نہیں ہو سکتی جس کے متعلق کلامِ الٰہی نے فرما دیا ہے کہ صرف متقین و مومنین کے لئے مخصوص ہے۔"

حضرات انبیائے کرام کا اُسوۂ حسنہ ہم کو بتلاتا ہے کہ سب سے پہلی منزل تبلیغ و دعوت کی ہے۔ اور دوسری ذہاب الی اللہ اور ترکِ وطن کی اور پھر تیسری ظہور امر الٰہی کی سأُریکم اٰیاتی فلا تستعجلون۔"

غیر مُبدّل حقیقت

آگے چل کر حضرت مولانا تحریر فرماتے ہیں

"میں نے ابتدائے اشاعت "الہلال" سے لے کر اس وقت تک جو کچھ لکھا اور کہا اس کا حرف حرف زمانہ کے علم و حافظہ میں محفوظ ہے۔ میں نے نہ تو کبھی تعلیم کا ذکر کیا ہے نہ سیاسی اصولوں اور تقلیدوں کی دعوت دی نہ اُن رہنماؤں اور پیشواؤں کی راہ اختیار کی جنہوں نے امت مرحومہ کی تجدید و احیاء کو غیر قوموں کی تقلید و اتباع میں محدود دیکھا ہے اور نہ کبھی انسانوں کے بنائے ہوئے طریقوں اور حکمت عملیوں کو اختیار کیا جو ابنائے زمانہ کی بلند پروازیوں کا ہمیشہ منتہائے خیال رہا ہے۔ برخلاف اس کے میں نے ہمیشہ خدا کا کام کیا، میں نے ہمیشہ قرآن کی دعوت دی۔ میں نے ہمیشہ ایمان۔ یقین۔ اعتقاد اور عمل صالح کا ذکر کیا۔ اور میں نے جب کبھی کوئی بات کہی اس کو وحی الٰہی کی دائمی اور غیر متغیر یقینیات اور حقائق کی بناء پر پیش کیا۔ میں اپنے سامنے ایک یقین رکھتا تھا۔ میری دعوت کی بنیاد انسانی افکار پر نہیں بلکہ ایک دینی اعتقاد پر تھی۔ دنیا کی ہر چیز بدل سکتی ہے مگر الٰہی اعتقاد و یقین نہیں بدل سکتا۔ اسی لئے زمانہ کی کوئی تبدیلی میرے لئے موثر ثابت نہ ہو سکی۔"

چند ضروری سوالات

یہ ہے مولانا ابوالکلام آزاد کی پہلی دعوت اور مولانا کے علم و اعتقاد کے مطابق مسلمانوں کی نجات و فلاح کی راہ مولانا کے ارشاد کی روشنی میں حسب ذیل سوالات پیدا ہوتے ہیں۔

(۱) کیا مولانا کی موجودہ راہِ عمل اس راہ سے مختلف نہیں ہے جس کا اعلان و اظہار مولانا نے اپنے اوپر والے بیان میں فرمایا ہے؟

(۲) کیا مولانا کی موجودہ راہِ عمل غیر قوموں کے مجلسی اجتماعی طریقوں کی ادھوری اور ناقص تقلید نہیں؟

(۳) کیا مولانا کا موجودہ مسلک نام نہاد تعلیمی و سیاسی و قومی تحریکوں سے الگ صرف دعوت و تبلیغ اسلامی اور قرآنی کی صراطِ مستقیم اور شعار و دستور العمل کے مطابق ہے؟

(۴) کیا مولانا کا موجودہ مسلک حضرات انبیائے کرام اور داعیِ اسلام علیہم الصلوٰۃ والسلام کے اسوۂ حسنہ اور سنتِ مقدسہ کی دعوت سے ماخوذ ہے؟

(۵) اگر ان تمام سوالات کا جواب نفی میں ہے اور ظاہر ہے کہ نفی میں ہے تو کیا مسلمان مولانا کے موجودہ مسلک کی پیروی کر کے جو انبیائے کرام اور حضرت داعیِ اسلام علیہ الصلوٰۃ والسلام کے اسوۂ حسنہ و سنت مقدسہ سے ماخوذ نہیں ہے، وہ کامیابی اور فوز و فلاح حاصل کر سکتے ہیں جن کے متعلق خود مولانا کے الفاظ میں کلامِ الٰہی نے فرما دیا ہے کہ وہ صرف متقین اور مومنین ہی کے لئے مخصوص ہے؟

(۶) کیا مولانا کی موجودہ راہ ان پیشواؤں اور رہنماؤں کی راہ نہیں ہے جو امتِ مرحومہ کی تجدید و احیاء کو غیر قوموں کی تقلید و اتباع میں محدود سمجھتے ہیں؟

(۷) کیا مولانا اپنی موجودہ حیثیت سے جو کچھ ارشاد فرماتے ہیں وہ وحی الٰہی کی دائمی اور غیر متغیر یقینیات و حقائق پر مبنی ہے؟ اور کیا مولانا کی موجودہ دعوت کی بنیاد انسانی افکار پر نہیں بلکہ دینی افکار پر ہے۔ ایسے دینی اعتقاد پر جو غیر مُتبدل ہے؟

ان سوالات کے جوابات صاف ہیں حضرت مولانا ابوالکلام کا موجودہ مسلک ان کی اس دعوت سے کوئی تعلق نہیں رکھتا جس کے داعی مولانا جاںا وطنی کے ایام میں تھے۔ مولانا کی موجودہ راہ بالکل وہی ہے جس سے علیحدگی اور بے تعلقی مولانا کی اس زمانے کی دعوت کی امتیازی خصوصیت تھی اور اس زمانے کی دعوت کے بارے میں مولانا کا ارشاد اوپر گزر چکا ہے کہ "میری دعوت کی بنیاد انسانی افکار پر نہیں بلکہ ایک دینی اعتقاد پر تھی۔ دنیا کی ہر چیز بدل سکتی ہے لیکن الٰہی اعتقاد نہیں بدل سکتا۔"

مولانا کے اس ارشاد کے صاف معنی یہ ہیں کہ خود مولانا کے مسلک کی تبدیلی بھی مولانا کی سابق دعوت کی حقیقت کو نہیں بدل سکتی کیونکہ وہ الٰہی اعتقاد پر مبنی ہے۔

ایسی صورت میں ہمارا فرض ہے کہ ہم مولانا کے موجودہ مسلک کی نہیں۔ بلکہ ان کی سابقہ دعوت کی پیروی کریں۔ اور اپنی تمام کوششیں اس بات پر صرف کر دیں کہ مولانا اپنے سابقہ مقام پر واپس آ جائیں

مولانا کی ذات سے سچی عقیدت و ارادت کا تقاضہ یہی ہے۔
اقامتِ دین کی تحریک سے دلچسپی رکھنے والوں میں ایسا کون ہوگا جس کے دل میں اس دعوت کے اولین داعی کی محبت نہ ہوگی اور وہ دوبارہ اس کے ہاتھ میں اس تحریک کا علمِ امارت دیکھنے کا متمنی نہ ہوگا۔ کاش وہ مبارک دن آتا اور جلد آتا۔ جب مولانا ابوالکلام آزاد مولانا ابوالاعلیٰ مودودی اور مولانا حسین احمد اور مولانا مفتی کفایت اللہ صاحب ایک ہی صف میں کھڑے نظر آئیں گے۔

حضرت مولانا عبید اللہ سندھی اور حکومت الٰہیہ

قرآنِ مجید بین الاقوامی پروگرام ہے

حضرت مولانا عبید اللہ سندھی رحمۃ اللہ علیہ ایک غیر مسلم
سکھ خاندان سے نکل کر اسلام کی آغوش میں داخل ہوئے
اور شیخ الہند حضرت مولانا محمود الحسن صاحب قدس سرہ العزیز
کے حلقۂ علم وعمل میں تعلیم وتربیت پاکر امامت وپیشوائی کے
منصب پر فائز ہو گئے ۔

مولانا عبید اللہ سندھی جہاد وایثار کا ایک جلیل القدر
پیکر تھے، انھوں نے دین وملت کی راہ میں جو قربانیاں
کیں اُن کی نظیر اسلامی ہند میں شاذ ونادر ہے کسی مبالغے
کے بغیر کہا جا سکتا ہے کہ ان کی پوری زندگی جہاد فی سبیل اللہ
میں گزری ۔

ربع صدی سے زیادہ کی جلا وطنی اور جہاں گردی کے بعد حضرت مولانا سندھی ہندوستان واپس آئے تو ایک خاص دینی وسیاسی فکر لے کر آئے جس سے اسلامی ہند میں ایک ہلچل سی مچ گئی، جدید تعلیم یافتہ مسلمانوں کے ایک حلقے نے مولانا کے افکار و خیالات کا خیر مقدم کیا لیکن مولانا کے رفقائے قدیم کے نزدیک وہ افکار و خیالات ناقابلِ قبول ثابت ہوئے۔

اس وقت تک حضرت مولانا سندھی کے افکار و خیالات سے متعلق متعدد کتابیں شائع ہو چکی ہیں، اور متعدد حضرات ان پر مخالفانہ جرح و تنقید بھی کر چکے ہیں، خود حضرت مولانا سندھی کے رفقاء یعنے شیخ الہند حضرت مولانا محمود الحسن رحمۃ اللہ علیہ کے متوسلین مولانا کے دینی وسیاسی اصول وافکار سے متفق نہیں ہیں، حقیقت یہ ہے کہ حضرت مولانا سندھی کے اصول وافکار کچھ ہیں بھی ایسے ہی کہ دینی علوم وعقائد کے نمائندوں کا ان سے کلی اتفاق ممکن نہیں۔

یہ ایک سوال ہے کہ جب حضرت مولانا سندھی شیخ الہند مولانا محمود الحسن صاحب کے تربیت یافتہ ہیں، اُن کے رفقائے خاص کی جماعت سے تعلق رکھتے ہیں، حضرت شاہ ولی اللہ، حضرت مولانا محمد قاسمؒ اور دوسرے اکابرِ اسلام کی تصنیفات سے اُنھوں نے استفادہ کیا تو ان کے افکار و خیالات میں اس قدر انتشار و اضطراب کیونکر پیدا ہو گیا؟ اِس سوال

کے جواب میں حضرت مولانا حسین احمد صاحب مدنی کا ایک
طویل بیان میرے پیش نظر ہے۔ اس بیان کا ماحصل یہ
ہے کہ دین وملت کی راہ میں مدت مدید تک حضرت مولانا
سندھی کو جو غیر معمولی اور ناقابل برداشت آلام ومصائب
جھیلنے پڑے انھوں نے مولانا کے دماغی توازن کو
درہم وبرہم کر دیا۔

حضرت مولانا مدنی صاحب اپنے بیان میں تحریر فرماتے ہیں۔
"مولانا مصائب جھیلتے ہوئے جب حجاز میں پہنچے ہیں
اور وہیں ان سے ملاقات کا شرف حاصل ہوا ہے تو
ان کی حالت دیکھ کر ہمارے تعجب وتحیر کی کوئی انتہا
نہیں رہی، ہم نے دیکھا کہ مولانا کی وہ ذہانت وظرافت
وہ حلم اور بردباری وہ سکون اور سکوت جس کو ہم پہلے
مشاہدہ کرتے تھے سب کے سب تقریباً رخصت
ہو چکے، ذرا ذرا سی بات پر خفا ہو جاتے ہیں۔ چیخنے
چلّانے لگتے ہیں غصہ آجاتا ہے۔ باتیں بہت زیادہ
کرنے لگتے ہیں۔ بسا اوقات ایک ہی مجلس میں متضاد
اور متخالف امور فرماتے رہتے ہیں۔ ہندوستان تشریف
لانے کے بعد بھی ان کے احوال متضادیہ میں کمی نہیں ہوئی
بلکہ کچھ اضافہ ہی رہا جس کی بناء پر ہم کو یقین ہو گیا کہ مولانا
کے دماغی توازن پر کاری اثر پڑا ہے اور کیوں نہ ہو جو
ناساز احوال اور گوناگوں صدمات عظیمہ ان کو پیش آئے

تھے۔ ان کا یہ اثر بہت ہی کمترین اثر تھا۔ چنانچہ متعدد مجالس میں خود مولانا بھی اس کے مقر ہوئے۔ ایسے احوال میں یقیناً ہر چیز کا جادۂ اعتدال سے ہٹ جانا اور جماعتوں میں اختلاف پیدا ہو جانا طبعی بات ہے۔ چنانچہ یہ دماغی انقلاب نہ صرف مولانا کی سیاسیات تک ہی محدود رہا۔ بلکہ علمی اور مذہبی تقاریر اور تحریرات تک بھی متجاوز ہوا اور اسی امر نے مولانا کی اعلیٰ قابلیت اور بیش از بیش قربانیوں کے ہوتے ہوئے ہندوستانی پبلک اور سیاسی رہنماؤں میں اس رتبہ اور پوزیشن کو مولانا مرحوم کے لئے حاصل نہ ہونے دیا جس کے وہ یقیناً مستحق تھے"

(روزنامہ ہلال نو بمبئی)

اس کے بعد حضرت مولانا حسین احمد صاحب نے مسلمانوں کو مشورہ دیا ہے کہ حضرت مولانا سندھی کے ان حالات کو پیش نظر رکھتے ہوئے ان کے افکار و خیالات میں جو چیزیں اسلامی عقائد و اعمال کے متعلق ہوں اُن کو لے لیں اور جو چیزیں اسلامی عقائد و اعمال کے خلاف ہوں انھیں چھوڑ دیں۔

حضرت مولانا مدنی کی اس رائے کی اصابت میں کسی کو کلام نہ ہونا چاہئیے، حضرت مولانا مدنی کی اس رائے کو ملحوظ رکھتے ہوئے ہم ذیل میں حضرت مولانا سندھی کے افکار و خیالات پیش کر رہے ہیں:۔

"ہم لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے شخصی اوصاف میں اس قدر انہماک کر چکے ہیں کہ اُن کی پیدا کی ہوئی جماعت کی قدر و قیمت

ہماری نظروں سے خالی رہی۔ مگر قرآن شریف کا ایک اشارہ ہمارے
اس تخیل کو درست کرنے کے لئے کافی ہے"۔

"محمد رسول اللہ" کے ساتھ "وَالَّذِينَ مَعَهُ" ملا کر آپؐ
تمام کامیابی کو جماعتی کام بنا دیا گیا ہے .... قرآن عظیم
نے جو دعا ہمیں عقائد پر مضبوط رہنے کے لئے ہمیں سکھائی ہے۔ وہ
سورۂ فاتحہ میں مذکور ہے وہاں "صِرَاطَ مُسْتَقِيمَ" کی تفسیر
"صِرَاطَ الَّذِينَ أَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ" سے کی گئی ہے۔ اور
"اَلَّذِينَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ" کی تفسیر خود قرآن شریف
میں انبیاء، صدیقین، شہداء اور صالحین سے کی گئی ہے۔ اس
سے فی البدیہہ قرآن شریف کی تعلیم کو اجتماعی سمجھنا ضروری تھا۔ مگر
کس بے التفاتی کا شکار ہو کر ہم انفرادیت کی دلدل میں پھنس
گئے۔ اس کے بعد میرے دماغ پر یہ اثر ہوا کہ قرآن عظیم دنیا کی تمام
اقوام میں انٹرنیشنل انقلاب کا پروگرام ہے۔ اس میں آیت "هُوَ
الَّذِي أَرْسَلَ رَسُولَهُ بِالْهُدَى وَدِينِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهُ
عَلَى الدِّينِ كُلِّهِ وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُونَ" سے
استنباط کیا۔

دین ہر قوم کا علیحدہ علیحدہ رہ چکا ہے اور قومی اذکار و اعمال کا مفید
حصہ اس قوم کا دین کہلاتا ہے جب اس دین حق کو تمام ادیان پر غالب
کرنا منظور ہے تو تمام اقوام میں انقلاب پیدا کرنا ضروری ہوگا۔ انقلاب
مذکور کی دو صورتیں ہیں۔ اول یہ کہ تمام ادیان پر غلبہ فقط تعلیم و تربیت
کے ذریعہ سے ہو۔ اس طرح متحقق ہوتا تو قومیں اپنی خوشی سے اس

دین حق کو قبول کرتیں جب اس کے ساتھ " وَلَوْ کَرِہَ الْمُشْرِکُوْن کا جملہ نازل ہو چکا ہوتا۔ تو اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ ایک مرکزی طاقت کے زور سے اس دین کا غلبہ حاصل کیا جائے۔" انٹرنیشنل انقلاب" کا ترجمہ اس سے زیادہ ہم کچھ نہیں سمجھ سکتے۔"

مولانا سندھی قرآنِ مجید کو" انٹرنیشنل انقلاب" کا پروگرام سمجھتے ہیں۔ اور قرآنِ مجید کے پیش کردہ دینِ حق کو تمام ادیانِ عالم پر غالب کرنے کے لئے بین الاقوامی انقلاب کے ذریعہ ادیانِ عالم پر دینِ حق کو غالب کیا جائے گا، اس نتیجہ کے طور پر جو نظامِ حیات بروئے کار آئے گا وہ الٰہی نظام ہوگا۔ اور جو حکومت کارفرما ہوگی وہ حکومتِ الٰہیہ ہوگی بالفاظِ دیگر وہ نظامِ زندگی نافذ اور عمل پذیر ہوگا جس کا حامل قرآن ہے۔

آگے چل کر مولانا سندھی فرماتے ہیں:۔

" اگر قرآنِ مجید کی تعلیم کو" انٹرنیشنل انقلاب" کا پروگرام مان لیا جائے تو اس کے لئے تین چیزوں کی تعیین ضروری ہے (الف) اس کا آئیڈیا (ب) اس کا پروگرام (ج) اس پروگرام کو چلانے والی سنٹرل کمیٹی۔

کوئی انقلابی تحریک پالٹیکس کے سوا کامیاب نہیں ہوتی اور ہر پالٹیکس میں ان تین چیزوں کی تعیین ضروری ہے۔

(۱) میں نے قرآنِ عظیم میں غور کر کے اس کا آئیڈیا اس آیت کو مقرر کیا هُوَ الَّذِیْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِیْنِ الْحَقِّ لِیُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّیْنِ كُلِّهٖ وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُوْنَ

(۲) پروگرام کے لئے "حزب اللہ" کی تعیین و تحدید ضروری ہے۔ "حزب اللہ" اس پارٹی کا نام ہے جو قرآن عظیم کے انٹرنیشنل انقلاب کو کامیاب بنانا اپنا مقصدِ حیات قرار دیتی ہے۔

حزب اللہ کی ضروریات پر قرآن عظیم کی مختلف سورتوں میں کافی ہدایتیں دی گئی ہیں جہاں جہاں یاایھا الذین آمنوا ...... وغیرہ سے مومنین کو خطاب کیا گیا ہے کہ وہ کفار اور منافقین کے راستہ پر نہ چلیں بلکہ فلاں فلاں حکم کی اس طرح پابندی کریں ان تمام مواقع کو حزب اللہ کا پروگرام سمجھنا چاہیئے۔

"یاایھا الذین آمنوا کے پہلے مخاطب حزب اللہ کے افراد ہوتے ہیں۔ اس میں مرد و عورت اور عرب و عجم سب شامل ہیں اس کا پہلا نمونہ "السابقون الاولون من المھاجرین والانصار" ہیں اور ان کے بعد "اتبعو باحسان" قیامت تک کی جمیع اقوام مسلمہ کو شامل ہے۔ اس طرح قیامت تک جاری رہے گا۔

(۳) اب فقط مرکزی کمیٹی کا سوال باقی رہ جاتا ہے میری سمجھ میں آیت "السابقون الاولون من المھاجرین والانصار" سنٹرل کمیٹی کو معین کر دیتی ہے۔" (امام ولی اللہ کی حکمت کا اجمالی تعارف مطبوعہ ماہنامہ "الفرقان" بریلی ولی اللہ نمبر سے ماخوذ)

از بس کہ حضرت مولانا سندھی کے افکار و خیالات کا یہ ایک مختصر سا اقتباس ہے، لیکن، اس سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ مولانا

کے تمام تر فکر و نظر کا مرکز و محور حکومتِ الٰہیہ کا احیاء و قیام تھا، اس ہندی مجاہد کبیر نے اسی مقصدِ عظیم کے لئے اپنی زندگی وقف کر رکھی تھی اور اس مقصد کے لئے دنیا کے ہر ناگوار کو گوارا کر رکھا تھا مدت العمر جان سے زیادہ عزیز مقصد کے لئے جنگ کرتے ہوئے اگر اس نے کامیابی کی صورت نہ دیکھ کر اپنا دماغی توازن کھو دیا اور جس کے نتیجہ کے طور پر اس کے خیالات و افکار میں تنازع اور تضاد پیدا ہو گیا تو یہ کوئی غیر فطری بات نہیں، آخر دل و دماغ دل و دماغ ہی تو تھے سنگ و خشت تو نہ تھے۔ اب یہ مسلمانوں خصوصاً مولانا کے رفیقوں اور ارادتمندوں کا فرض ہے کہ مولانا نے اوپر حکومتِ الٰہیہ کا جو اجمالی خاکہ پیش کیا ہے اُسے سمجھیں اور اس خاکے میں رنگِ عمل بھرنے کی کوشش کریں۔

واضح رہے کہ حضرت مولانا سندھی نے جس آیۂ کریمہ "هُوَ الَّذِيْ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ" کو قرآنِ مجید کا آئیڈیا قرار دیا ہے۔ وہی آیۂ کریمہ مولانا ابو الاعلیٰ مودودی کی فکر و نظر اور دعوت و پیام کا بھی مطمح و محور ہے۔

افادات حضرت مولانا سید سلیمان ندوی مدظلہ

حضرت مولانا سید سلیمان ندوی علامہ شبلی مرحوم کے شاگرد رشید اور اُن کے جانشین ہیں۔ آپ اُن علمائے ملت میں سے ہیں جن پر اسلامی ہند کو ہمیشہ ناز رہے گا علم و فضل، زہد و تقویٰ، تصنیف و تالیف ہر اعتبار سے مولانا کی ذات قابل احترام ہے۔ "سیرۃ النبیؐ" کے جس سلسلہ کو علامہ شبلی مرحوم نامکمل چھوڑ گئے تھے اس کی تکمیل کی سعادت مولانا سید سلیمان کے حصے میں آئی، اس دینی خدمت نے مولانا کے شرف و امتیاز کو اور بلند کر دیا ہے۔ آپ ہندوستان کے اُن علمائے میں ہیں جن کی شہرت ہندوستانی سرحد کو عبور کر کے اسلامی ممالک تک پہنچ چکی ہے۔

آئیے ہم اُس پکار کو سنیں جو مولانا کے قلب کی انتہائی

گہرائی سے بلند ہو رہی ہے۔

اسلامی حکومت کا قیام مسلمانوں کا فرض ہے

جنوری ۱۹۳۹ء کے معارف میں مولانا سید سلیمان ندوی تحریر فرماتے ہیں۔

"ہمارے سامنے اسلام خود ایک بڑی حقیقت و صداقت ہے، وہ مذہب بھی ہے اور سیاست بھی، اقتصاد بھی ہے اور معاشر بھی، اس کے مذہبی و سیاسی، اقتصادی و اجتماعی پیغاموں کو پھیلانا، مساوات و عدل قائم کرنا۔ اسلامی احکام کی تبلیغ کرنا دنیا سے سود۔ بدکاری۔ شراب خواری، قمار بازی اور ظلم کو جڑ پیڑ سے اکھاڑنا اور ملک میں ایک نیا سیاسی و اقتصادی نظام قائم کرنا اس کے وہ فرائض ہیں جن سے مسلمان غافل ہیں اور غیر مسلم اسی کے لئے آج کٹ مر رہے ہیں۔"

مولانا کے اس فرمودات کی صحت و واقعیت سے کسے انکار ہو سکتا ہے لیکن سوال یہ ہے کہ یہ سب ہوں کیونکر؟ کیا اسلامی حکومت کے بغیر یہ ممکن ہے کہ مسلمان اسلام کے مذہبی، سیاسی، اقتصادی و اجتماعی پیغاموں کو اس طرح پھیلا سکیں جس طرح انکے پھیلانے کا حق ہے؟ کیا اسلامی حکومت کے بغیر عدل و مساوات کا قیام اور اسلامی احکام کی تبلیغ ممکن ہے، کیا اسلامی حکومت کے بغیر سود، بدکاری، شراب خواری، قمار بازی اور ظلم کو بیخ و بُن سے اکھاڑا جا سکتا ہے؟ کیا اسلامی حکومت کے بغیر ایک نئے سیاسی

واقتصادی نظام کا قیام ممکن العمل ہے؟ کیا مسلطہ باطل اقتدار نے مسلمانوں کو ان فرائض کی ادائگی کی اجازت دی ہے؟ سود خواری شراب نوشی، بدکاری اور ظلم وجبر تو باطل حکومتوں کے نظام کے اجزائے ترکیبی ہیں پھر وہ اسے کیسے برداشت کر سکتی ہیں کہ مسلمان ان کے نظام کے ارکان وعمود اکھاڑ کر پھینک دیں؟ مولانا نے اسی پر اکتفا نہیں فرمایا ہے، ایک قدم بڑھ کر وہ بات بھی فرمادی ہے جو ان کے پیغام کی روح ہے، یعنے ایک جدید سیاسی واقتصادی نظام کا قیام، مولانا نے نہ اسلامی حکومت کا لفظ استعمال کیا ہے، اور نہ حکومتِ الٰہیہ کا، لیکن جب مولانا کے نزدیک اسلام مذہب ہی نہیں سیاست واقتصاد بھی ہے تو ظاہر ہے کہ مولانا کے عمقِ قلب سے جو صدا بلند ہو رہی ہے وہ اسلامی حکومت یا حکومتِ الٰہیہ کے سوا کسی اور حکومت کی نہیں ہوسکتی، خصوصاً اس حقیقت کے پیش نظر کہ اسلام کے سوا کوئی دوسرا نظام سیاست واقتصاد ایسا ممکن ہی نہیں جس میں شراب وبدکاری، سود وقماربازی، اور ظلم وعدوان نہ ہو۔

عدم ادائے فرض کی وعید

اسی سلسلے میں آگے چل کر حضرت مولانا نے عبرت میں ڈوبی ہوئی ایک ایک بات ارشاد فرمائی ہے، لکھتے ہیں "اگر آج کلمہ گو مسلمانوں میں اس ادائے فرض کے سپاہی بننے کا ولولہ نہیں تو کیا عجب کہ اللہ تعالیٰ کسی اور قوم کو زندگی کے میدان میں لائے اور اس سے اسلام کا یہ فرض ادا کرائے"

شاید مولانا کے اس ارشاد میں اس آیۂ کریمہ کی طرف اشارہ ہے:-

وان تتولوا یتبدل قوماً غیرکم ثم لایکونوا امثالکم" (س۔ محمد)

اگر تم روگردانی کروگے تو اللہ تمہارے منصب کو کسی دوسری قوم سے بدل دے گا پھر اس قوم کے لوگ تمہارے جیسے نہ ہوں گے۔

اللہ تعالیٰ نے جس وعید کی دھمکی دی ہے اس کی زد میں پوری قوم ہے جس میں ہم اور حضرت مولانا بھی داخل ہیں، قابل غور امر یہ ہے کہ اس وعید الٰہی سے نجات حاصل کرنے کی کیا صورت ہے؟ مسلمانانِ ہند میں مولانا کا جو مقام ہے اس کے اعتبار سے آپ اس فرض کی ادائگی کا سپاہی نہیں سپہ سالار بننے کا حق رکھتے ہیں۔ ایسی حالت میں مولانا سے یہ توقع بے جا نہ ہوگی کہ اگر وہ اس فرض کی ادائیگی کے لئے کوشاں ہوں، اور مسلمانوں کو اس نصب العین کی طرف دعوت دیں اور انھیں اپنے گرد صحیح اسلامی نصب العین کے لئے جمع کریں تو مجھے یقین ہے کہ مسلمان ان کی دعوت پر لبیک کہیں گے۔

اعلاءِ کلمۃ اللہ کے لئے دعوتِ جہاد

جنوری ۱۹۴۱ء میں مولانا نے قیامِ حق کے لئے زیادہ واضح اور صاف لفظوں میں دعوت دی ہے، تحریر فرماتے ہیں:۔

"دنیا میں جو قوم بھی اپنے کو امامت وقیادت کے لئے پیش کرتی ہے وہ جب تک اپنے خون کے سمندر میں خود غوطہ نہیں لگاتی اس منزل کو نہیں پہنچ سکتی۔ اجتماعی ترقی کا ذریعہ صرف ایک ہی ہے اور وہ جہاد ہے یعنے ہر پہلو کا جہاد۔ نفس کا جہاد، علم کا جہاد، مال کا جہاد، عقل کا

جہاد، جسم کا جہاد اور اس راہ میں جان و مال اولاد و عزیز اور ہر محبوب سے محبوب اور عزیز سے عزیز متاع کی قربانی ...."

" یہ تو مطلق جہاد کی راہ ہے۔ لیکن جہاد فی سبیل اللہ یعنے خدا کی راہ میں جہاد کی منزلیں تو اس سے بھی زیادہ کٹھن ہیں ..... جہاں اپنے لئے نہیں بلکہ خدا کے لئے، خدا کے دین کے لئے، خدا کے حکم کے لئے بندے اپنے آپ کو قربان کرتے ہیں کہ اللہ کی بات کا بول بالا ہو لتکون کلمۃ اللہ ھی العلیا اور ویکون الدین کلہ للہ یعنے دین اور اطاعت صرف خدا کی ہو جائے ...."

" آج ضرورت ہے کہ ہم پھر اپنی آواز بلند کریں اور تھکی ماندی دنیا کو بتائیں کہ اس کا امن اور چین قومی و نسلی امتیازات اور تفرقوں میں نہیں بلکہ پیغام حق کے قبول میں ہے۔ پیغامی برادری قائم ہو جس میں اس پیغام کے ہر قبول کرنے والے کو برابری کا درجہ ملے اور اس پیغام کے حقدار قبول اور اس کے لئے جد و جہد کی ذمہ داری کے قبول کو حقوق کی کمی و بیشی کا معیار بنایا جائے ...."

" لیکن یہ پوری طرح یقین کر لینا چاہیئے کہ دنیا میں کسی پیغام یا کسی تحریک و دعوت کی کامیابی اس پیغام و دعوت کی صرف عمدگی سے نہیں ہو سکتی بلکہ اس کے علمبرداروں کی جد و جہد، سعی و محنت، سرگرمی عمل اور ایثار و قربانی سے ہو سکتی ہے۔ دنیا ایک بحر رواں ہے اس بحر رواں میں وہی زندہ رہے گا جو خود بھی رواں ہے "

مولانا سید سلیمان ندوی کی اس دعوت کے حق ہونے میں کسے کلام ہو سکتا ہے؟ البتہ قابلِ غور امر یہ ہے کہ اس دعوت کو عمل میں کیسے لایا

جائے؟ جب نصب العین یہ ہے کہ اللہ کا کلمہ بلند ہو اور پورے کا پورا دین اللہ کے لئے ہو جائے۔ کوئی طاقت اس کے کسی جز کے عملدرآمد میں مانع و مزاحم نہ ہو سکے تو پھر مسلمانوں کے لئے یہ جائز نہ ہو گا کہ وہ اسلام کے بعض اجزاء سے ہمیشہ کے لئے دست کش ہو کر بعض اجزاء پر قانع ہو جائیں یہ صورت تو "یاایھا الذین امنوا ادخلوفی السلم کافۃ" کے منافی اور ایک طرح سے "نومن ببعض ونکفر ببعض" کے مطابق ہو جائے گی۔ صحیح طریقہ کار یہ ہو گا کہ مسلمان پورے اسلام کو غالب اور با اقتدار بنانا اپنا نصب العین قرار دیں، اور اسی نصب العین کی کامیابی کے لئے اپنی ساری کوششیں اور قربانیاں خاص کر دیں، مسلمانوں کے لئے یہ صورت بھی درست نہ ہو گی کہ وہ کسی غیر نظام کے اندر اسلام کے لئے کچھ تحفظات اور کچھ مراعات پا کر سمجھ لیں کہ اسلام کا حق ادا ہو گیا، اور ان کا مقصود حاصل ہو گیا؟ کسی غیر نظام کے اندر اسلام کو کتنا ہی تحفظ اور کتنی ہی رعایت مل جائے لیکن اسلام ہو گا بہرحال اس نظام کے ماتحت، اسلام کو اس نظام پر غلبہ و اقتدار حاصل نہ ہو گا۔ پھر اللہ کا کلمہ کہاں بلند ہوا؟ بلند تو ہوا نظام غیر۔ اس زیر دستی کی حالت میں پورے کا پورا دین اللہ کے لئے کیوں کر ہو سکتا ہے؟

مسلمان اس صورت حال سے رضامند ہو جائیں لیکن اللہ کی غیرت اس سے قطعاً پاک ہے کہ وہ نظامِ باطل کے مقابلے میں اپنے دین کی اس پوزیشن پر رضامند ہو۔

اس مقام پر پہونچ کر کوئی چیز ہمارے اندر سے ایک بار ہمیں

پھر یہ کہنے پر مجبور کر رہی ہے کہ مولانا میدانِ عمل کے جس گوشے میں بیٹھے ہوئے ہیں وہ ان کی جگہ نہیں ہے، اُنھیں اس گوشے سے باہر آنا چاہیئے۔

واقعہ یہ ہے کہ مولانا سید سلیمان ندوی اور ان جیسے دوسرے علمائے اسلام نے اپنی دعوتوں اور پیغاموں سے مسلمانوں کی جماعت کے اسلامی نقطۂ نظر کو اتنا وسیع اور بلند کر دیا ہے کہ اب ان کی روح کسی طرح اس بات کے لئے تیار نہیں ہوتی کہ وہ اسلام کو تنگ اور پست نظر سے دیکھیں۔

اے بادِ صبا ایں ہمہ آوردۂ تست

مولانا سید سلیمان ندوی کا ایک ایمان افروز پیغام

مُسلمان خدا کی شہنشاہی کے نمائندے ہیں اور دُنیا میں اُس کے قوانین جاری کرتے ہیں

فروری ۱۹۴۵ء میں صوبۂ بمبئی کی جمعیت العلماء کا سالانہ اجلاس ہوا تھا اس کی مختلف نشستوں کی مختلف بزرگوں نے صدارت کی تھی حضرت مولانا قاری محمد طیب مہتمم دارالعلوم دیوبند اور حضرت مولانا عبد الشکور صاحب لکھنوی تھے ساتھ ایک نشست کی صدارت حضرت مولانا سید سلیمان ندوی کے حصے میں بھی آئی تھی سورۂ فاتحہ کی تلاوت اور تمہیدی تقریر کے بعد مولانا نے جو خطبہ دیا وہ یہ ہے :-

حضرات! میں نے ابھی جو سورۂ فاتحہ تلاوت کی۔ بہ حقیقت میں مجموعۂ قرآن پاک کا خطبۂ افتتاحیہ ہے، اکابر مفسرین کی تحقیق

وتشریح کے مطابق اس سورہ میں قرآن پاک کے سارے مضامین کا خلاصہ مذکور ہے توحید فی الذات توحید فی الصفات، توحید فی العبادات اتباع آثار انبیاء علیہم السلام جزاء وسزا سب ہی مضامین اس میں موجود ہیں ـــــــــ ۔ ایک اور حیثیت سے دیکھئے کہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی اُس روایت کے مطابق کہ اس سورہ میں حمد وتمجید اور دعا اور سوال کے مضامین یکجا ہیں ۔ ارشاد ہے کہ جب بندہ نماز میں سورۂ فاتحہ تلاوت کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ قسمت الصلوٰۃ بینی وبین عبدی نصفین، نماز یا نماز کی یہ سورۃ پاک میرے اور میرے بندے کے درمیان آدھی آدھی بٹی ہوئی ہے بندہ جب اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ کہتا ہے تو اللہ پاک فرماتا ہے کہ میرے بندہ نے میری حمد کی اور جب الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ مٰلِكِ یَوْمِ الدِّیْنِ کہتا ہے تو ارشاد فرماتا ہے میرے بندے نے میری بزرگی جتلائی اور جب نمازی اِیَّاكَ نَعْبُدُ وَاِیَّاكَ نَسْتَعِیْنُ کہتا ہے تو ارشاد ہوتا ہے کہ یہ میرے اور میرے بندہ کے درمیان ہے اور اس کے بعد اِھْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ کی درخواست پیش ہوتی ہے تو ارشاد ہوتا ہے کہ ولعبدی ماسال میرے بندے کے لئے وہ ہے جس کی اس نے درخواست پیش کی ۔

آج کی مجلس میں مجھے انبیاء اور نیکوکاروں کی راہ صراط مستقیم ہے، درخواست کے اسی

مضمون سے زیادہ تر بحث ہے اس درخواست اور دعا کے الفاظ یہ ہیں جن کو ہر مسلمان نمازی دن رات میں بیسیوں دفعہ دہراتا ہے بلکہ وہ نماز ہی نہیں جس میں .... حقیقتہً یا نیابتہً یہ درخواست اور دعا شامل نہ ہو اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيمَ صِرَاطَ الَّذِينَ أَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ غَيْرِ الْمَغْضُوبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّالِّينَ ۔ اس دعا اور درخواست میں بندہ اللہ تعالیٰ سے اپنی زندگی کے ہر نہج اور اپنے عمل کے ہر پہلو میں سیدھے راستہ پر چلائے جانے کی استدعا بارگاہِ الٰہی میں پیش کرتا ہے۔ اس مطلوبہ راہِ راست اور صراطِ مستقیم کے ساتھ تین قیدیں لگی ہوئی ہیں، اے اللہ تو ہم کو سیدھے راستہ پر چلا۔ ان کا راستہ جن پر تیرا انعام ہوا نہ اُن کا جن پر تیرا غضب ہوا اور نہ اُن کا جو راہِ راست سے بھٹک کر اپنے منزلِ مقصود کا راستہ کھو بیٹھے ہیں۔

اب راہِ راست کی ان تین قیدوں کی تشریح ضروری ہے جن میں پہلی قید تو تخصیصی ہے اور پچھلی قیدیں احترازی ہیں تخصیصی قید یہ ہے کہ سیدھا راستہ جن پر چلائے جانے کی درخواست ہے وہ خاص اُن بزرگوں کا راستہ ہو جن پر انعامِ ربّانی اور فضلِ الٰہی کی بارش ہوتی ہے۔ وہ احترازی قیدیں یہ ہیں کہ اُن کی راہ سے ہم کو بچایا جائے جن پر ان کی نافرمانی کے سبب سے اللہ تعالیٰ کا غضب نازل ہوا۔ اور نہ اُن کا راستہ جو اپنی غلط روی کے باعث منزلِ مقصود سے دُور جا پڑے ہیں۔ قرآنِ پاک میں جا بجا یہ تصریحات ہیں کہ یہ انعام یافتہ گروہ کون ہے اور جن پر غضب ہوا وہ کون ہیں۔

اور جو راہِ راست کو کھو چکے ہیں وہ کون ہیں، قرآنِ پاک کی اصطلاح میں صراطِ مستقیم وہ راہ ہے جس پر انبیاء علیہم السلام چلے اور جن پر چلنے کی اللہ کے بندوں کو دعوت دی۔ ارشاد ہے:۔

اِنَّكَ لَمِنَ الْمُرْسَلِيْنَ عَلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ (یٰس)

اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم تو پیغمبر ہے اور صراطِ مستقیم پر ہے۔

دوسری جگہ ہے:۔

وَاِنَّكَ لَتَهْدِيْۤ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ (شوریٰ)

اور اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم تو لوگوں کو صراطِ مستقیم پر چلنے کی دعوت دیتا ہے۔

فهدى الله الذين آمنوا لما اختلفوا فيه من الحق باذنه والله يهدى من يشاءُ الى صراطٍ مُّستقيم (بقرہ - ۲۶)

یعنے اہلِ کتاب یہود و نصاریٰ نے جو دین کی مختلف راہیں نکال دی ہیں، اللہ تعالیٰ اپنے خاص بندوں کو جو ایمان سے سرفراز ہیں ان سب سے بچا کر نبیوں اور صالحوں کے سیدھے راستہ پر چلاتے ہیں۔

سورۂ انعام کے انیسویں رکوع میں عقائد و عبادات، معاملات اور اخلاق کے اہم احکام کی تفصیل کے بعد ارشاد ہے۔

وان هذا صراطى مستقيماً فاتبعوه ولا تتبعوا السبل فتفرق بكم عن سبيله ذالكم وصّكم به لعلكم تتقون (انعام ۱۹)

اور یہ ہے میری سیدھی راہ سو اس پر چلو اور مت چلو
دوسرے راستوں پر کہ وہ تم کو اللہ کے راستوں سے
ہٹا دیں گے، یہ کہدیا ہے تاکہ تم بچ سکو۔

راہِ فلاح صرف انبیا کی راہ ہے

اِن شواہد سے میرا مُدعا ثابت ہے کہ صراطِ مستقیم انبیاؑ اور صلحا کے راستہ کا نام ہے جس کے انبیاء علیہم السلام رہنما ہیں اور جس کا دوسرا نام شریعت ہے جس کے لفظی معنی بھی راستہ ہی کے ہیں۔ صراطِ مُستقیم کے کہنے ہی سے گو راستہ متعین ہو چکا ہے مگر احتیاط کا تقاضہ اور رحمتِ الٰہی کا مطالبہ یہ تھا کہ اس راستہ کی مزید توضیح ایسی کردی جائے جس سے اس راستہ پر چلنے والے کا انجام بھی نظر کے سامنے آ جائے تو فرمایا " وہ راستہ جس پر وہ گروہ چلا جو اے اللہ تعالیٰ تیرے فضل وکرم اور انعام والطاف سے سرفراز ہوا اور نہ اُن کا راستہ جو مغضوب اور گمراہ گروہوں کا ہے" اس سے معلوم ہوا کہ اس سیدھے راستہ پر چلنے کا انجام انعام واکرام الٰہی ہے اور جس کے چھوڑ دینے کا نتیجہ اللہ تعالیٰ کے غضب کا نزول اور منزلِ مقصود سے بُعد اور دوری ہے۔
اب ہم کو اس انعام یافتہ گروہ کا پتہ چلانا ہے سورۂ نساء رکوع ۹ میں ہے۔

وَلَوْ اَنَّهُمْ فَعَلُوْا مَا يُوْعَظُوْنَ بِهٖ لَكَانَ
خَيْرًا لَّهُمْ وَاَشَدَّ تَثْبِيْتًا وَّاِذًا لَّاٰتَيْنٰهُمْ
مِّنْ لَّدُنَّآ اَجْرًا عَظِيْمًا وَّلَهَدَيْنٰهُمْ صِرَاطًا
مُّسْتَقِيْمًا وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ فَاُولٰٓئِكَ

مع الذین انعم اللہ علیھم من النبیّین
وَالصدیقین وَالشھداء وَالصالحین
وَحسن اولٰئک رفیقاً ذالک الفضل من اللہ
وَکفیٰ باللہ علیماً ہ (نساء - ۹)

"اور اگر وہ بھی کریں جو ان کو کہا جاتا ہے تو ان کے حق
میں بہتر ہو اور زیادہ ثابت ہو' دین میں اور اس وقت
ہم ان کو اپنے پاس سے بڑا ثواب دیں اور ان کو سیدھی
راہ پر چلائیں اور جو لوگ اللہ اور رسول کے حکم پر چلے ہیں
وہ ان کے ساتھ ہیں جن کو اللہ تعالیٰ نے اپنے انعام
سے نوازا ہے۔ نبی اور صدیق اور شہید اور صالح خوب
ہے ان کی رفاقت' یہ ہے۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے فضل
اور اللہ بس ہے خبر رکھنے والا۔"

ان آیتوں میں سیدھے راستہ پر چلنے والے اطاعت گزار گروہوں کے چار نام یا اوصاف بتائے گئے ہیں جو اللہ تعالیٰ کی نوازش اور مقبولیت سے سرفراز ہیں یعنی انبیائے کرام علیہم السّلام جو انسانی جماعتوں میں سب سے اعلیٰ درجہ کے بندوں اور سرفراز افراد کے نام ہیں جن سے بڑھ کر رہنمائی اور انسانیت کے رہبروں کے لئے رہبری اور بشر کی اصلاح اور ہدایت کے لئے اللہ تعالےٰ نے دوسرا نمونہ نہیں بنایا۔ اس کے بعد ان تین گروہوں کے نام ہیں جو ان رہنماؤں اور رہبروں کے راستہ پر چل کر صدیقیت اور شہادت اور صلاح و فلاح کی منزلوں پر پہنچے ہیں۔ اور جنھوں نے اللہ تعالیٰ کے ان بنائے اور

ڈھلے ہوئے نمونوں کو دیکھ کر اپنے کو درست کیا اور دوسرے انسانوں کے لئے نمونہ بنے۔

انبیاء کی راہ چھوڑنے کی سزا

اب ہم کو ان دو احترازی قیدوں کی طرف متوجہ ہونا ہے جن کے راستہ پر چلنے سے اللہ تعالٰے نے ہم کو روکا ہے۔ ان میں سے پہلے گروہ کا نام مغضوب ہے اور جن سے رحمتِ الٰہی مسلوب ہے۔ گو روا بات میں تصریح ہے کہ یہ گروہ یہود ہے مگر قرآنِ پاک میں بھی تصریح ہے کہ اس غضب الٰہی کے مُوردیہود اور یہود کے مُتبع ہیں' بقرہ رکوع ۷ میں ہے۔

ضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ وَالْمَسْكَنَةُ وَبَاءُوْا بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ (بقرہ - ۷)

اور ماری گئی ان پر ذلّت اور بے کسی اور کما لائے وہ اللہ کا غضب اور غصّہ۔

پھر اسی سورہ کے رکوع (۱۱) میں ہے کہ پہلے وہ حضرت عیسٰی علیہ السلام کے انکار پر غضب کے مُورِد بنے اور آخری دفعہ محمد رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے انکار و کفر پر ہمیشہ کے لئے غضب پر غضب کے مستحق ٹھیرے۔

فَبَاءُوْا بِغَضَبٍ عَلٰى غَضَبٍ ۞ (بقرہ - ۱۱)

وہ غضب پر غضب یعنی دوہرے غضب کے مستحق ہوئے۔

اور اب ہمیشہ کے لئے لعنت اور غضب الٰہی کی آگ میں ڈال دیئے گئے، اور ہمیشہ کے لئے اُن پر یہ حکم جاری کیا گیا کہ اب دنیا کا کوئی گوشہ اُن کو اپنے دامن میں پناہ نہیں دے سکتا۔ وہ دولت مندی

مع الذین انعم اللہ علیھم من النبیّین
والصدیقین والشھداء والصالحین
وحسن اولئک رفیقاً ذالک الفضل من اللہ
وکفیٰ باللہ علیماہ (نساء - ۹)

"اور اگر وہ بھی کریں جو ان کو کہا جاتا ہے تو ان کے حق میں بہتر ہو اور زیادہ ثابت ہو، دین میں اور اس وقت ہم ان کو اپنے پاس سے بڑا ثواب دیں اور ان کو سیدھی راہ پر چلائیں اور جو لوگ اللہ اور رسول کے حکم پر چلتے ہیں وہ ان کے ساتھ ہیں جن کو اللہ تعالیٰ نے اپنے انعام سے نوازا ہے۔ نبی اور صدیق اور شہید اور صالح خوب ہے ان کی رفاقت، یہ ہے۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے فضل اور اللہ بس ہے خبر رکھنے والا"

ان آیتوں میں سیدھے راستہ پر چلنے والے اطاعت گزار گروہوں کے چار نام یا اوصاف بتائے گئے ہیں جو اللہ تعالیٰ کی نوازش اور مقبولیت سے سرفراز ہیں یعنی انبیائے کرام علیہم السلام جو انسانی جماعتوں میں سب سے اعلیٰ درجہ کے بندوں اور سرفراز افراد کے نام ہیں جن سے بڑھ کر رہنمائی اور انسانیت کے رہبروں کے لئے رہبری اور بشر کی اصلاح اور ہدایت کے لئے اللہ تعالےٰ نے دوسرا نمونہ نہیں بنایا۔ اس کے بعد ان تین گروہوں کے نام ہیں جو ان رہنماؤں اور رہبروں کے راستہ پر چل کر صدیقیت اور شہادت اور صلاح و فلاح کی منزلوں پر پہنچے ہیں۔ اور جنھوں نے اللہ تعالیٰ کے ان بنائے اور

ڈھلے ہوئے نمونوں کو دیکھ کر اپنے کو درست کیا اور دوسرے انسانوں کے لئے نمونہ بنے۔

انبیاء کی راہ چھوڑنے کی سزا اب ہم کو ان دو احترازی قیدوں کی طرف متوجہ ہونا ہے جن کے راستہ پر چلنے سے اللہ تعالےٰ نے ہم کو روکا ہے۔ ان میں سے پہلے گروہ کا نام مغضوب ہے اور جن سے رحمتِ الٰہی مسلوب ہے۔ گو روا یات میں تصریح ہے کہ یہ گروہ یہود ہے مگر قرآنِ پاک میں بھی تصریح ہے کہ اس غضب الٰہی کے مورد یہود اور یہود کے متبع ہیں، بقرہ رکوع ۷ میں ہے:

ضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ وَالْمَسْكَنَةُ وَبَاءُوْا بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ (بقرہ - ۷)

اور ماری گئی ان پر ذلت اور بے کسی اور کما لائے وہ اللہ کا غضب اور غصّہ۔

پھر اسی سورہ کے رکوع (۱۱) میں ہے کہ پہلے وہ حضرت عیسٰی علیہ السلام کے انکار پر غضب کے مورد بنے اور آخری دفعہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے انکار و کفر پر ہمیشہ کے لئے غضب پر غضب کے مستحق ٹھیرے۔

فَبَاءُوْا بِغَضَبٍ عَلٰى غَضَبٍ ؕ (بقرہ - ۱۱)

وہ غضب پر غضب یعنی دوہرے غضب کے مستحق ہوئے۔

اور اب ہمیشہ کے لئے لعنت اور غضب الٰہی کی آگ میں ڈال دئیے گئے، اور ہمیشہ کے لئے ان پر یہ حکم جاری کیا گیا کہ اب دنیا کا کوئی گوشہ ان کو اپنے دامن میں پناہ نہیں دے سکتا۔ وہ دولت مندی

کے باوجود مفلس اور ذلیل وخوار رہیں گے اور یہ حکم الٰہی ہے کہ کسی نہ کسی دوسری ظالم قوم کے غلام بن کے رہیں گے۔ اگر ان کو ہنگامی پناہ وقتاً فوقتاً ملیگی بھی تو ان کی دولت کے بٹورنے کی خاطر! اری باری سے دولت پرست قومیں اپنی گود میں لیں گی اور ان کی جیبیں خالی کرکے ان کو پھر زمین پر پٹک دیں گی۔ ارشاد ہوا:-

ضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ أَيْنَ مَا ثُقِفُوا إِلَّا بِحَبْلٍ مِّنَ اللَّهِ وَحَبْلٍ مِّنَ النَّاسِ وَبَاءُوا بِغَضَبٍ مِّنَ اللَّهِ وَضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الْمَسْكَنَةُ ۚ ذَٰلِكَ بِأَنَّهُمْ كَانُوا يَكْفُرُونَ بِآيَاتِ اللَّهِ وَيَقْتُلُونَ الْأَنبِيَاءَ بِغَيْرِ حَقٍّ ۚ ذَٰلِكَ بِمَا عَصَوا وَّكَانُوا يَعْتَدُونَ (آل عمران - ۱۲)

ان یہود پر ذلت پھینک ماری گئی جہاں وہ پائے جائیں، لیکن اللہ کی دستاویز اور لوگوں کی دستاویز سے، یہ اس واسطے ہے کہ وہ اللہ کے احکام ماننے سے انکار کرتے رہے اور نبیوں کو ناحق قتل کرتے رہے یہ خصلت اُن میں اس لئے آئی کہ وہ بے حکم اور حد سے بڑھ جانے والے تھے۔

الغرض یہود غضب الٰہی کے نزول اور محکومی کی ذلت اور مسکنت اور قومی خواری کی لعنت میں اس لئے گرفتار کئے گئے کہ خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کے قبول سے منکر ہوئے اور اب اُن کی لعنت اس نبی آخر الزماں علیہ السلام پر ایمان اور اتباع کے سوا کسی اور تدبیر سے دور نہیں ہوسکتی اور یہ بھی معلوم ہوا کہ جو کوئی گروہ بھی انبیاء کی راہ

چھوڑے گا اور ان کی لائی ہوئی اور بتائی ہوئی صراطِ مستقیم سے منہ موڑے گا اس کے لئے یہی جزا ہے۔

وَمَن يُّهِنِ اللّٰهُ فَمَا لَهٗ مِن مُّكْرِمٍ (حج۔۲)

اور جس کو اللہ ذلیل کرے اس کو کوئی عزت دینے والا نہیں۔

عزیزے کہ از درگہش سر بتافت
بہر در کہ شد ہیچ عزت نیافت

یہود کی پوری تاریخ آغاز سے لے کر اس زمانہ تک قرآنِ پاک کی صداقت پر شاہد صادق ہے۔

انبیاء کی راہ سے انحراف ضلالت ہے

حصّہ ۱: اب ہم کو تیسرے گروہ کا پتہ لگانا ہے جو راستہ سے بھٹکا ہے۔ منزل مقصود سے دور چلا گیا ہے۔ اگرچہ روایات سے واضح ہے کہ یہ نصاریٰ کا گروہ ہے لیکن قرآنِ پاک کی آیتیں خود بھی اس گروہ کا صاف صاف پتہ اور نشان بتا رہی ہیں۔ نصاریٰ کے ذکر کے سلسلہ میں ہے اس سے پہلے تثلیث کا ذکر ہے پھر ان کی مجسمہ پرستی کا اس کے بعد یہ آیتیں ہیں:۔

قُلْ يَٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ لَا تَغْلُوْا فِيْ دِيْنِكُمْ غَيْرَ الْحَقِّ وَلَا تَتَّبِعُوْٓا اَهْوَآءَ قَوْمٍ قَدْ ضَلُّوْا مِنْ قَبْلُ وَاَضَلُّوْا كَثِيْرًا وَّضَلُّوْا عَنْ سَوَآءِ السَّبِيْلِ (مائدہ ۔ ۱۰)

اے اہلِ کتاب اپنے دین میں ناحق غلو نہ کرو۔ اور ان لوگوں کے خیال پر نہ چلو جو تم سے پہلے راستے سے بھٹکے تھے اور

بھٹوں کو گمراہ کیا تھا۔ اور سیدھی راہ بھولے تھے۔
اسی غلو دین کی نصرانی حقیقت کا اظہار سورۂ نساء میں کیا گیا ہے۔

يَا أَهْلَ الْكِتَابِ لَا تَغْلُوا فِي دِينِكُمْ وَلَا تَقُولُوا عَلَى اللَّهِ إِلَّا الْحَقَّ ۚ إِنَّمَا الْمَسِيحُ عِيسَى ابْنُ مَرْيَمَ رَسُولُ اللَّهِ وَكَلِمَتُهُ (نساء - ۲۳)

اے اہلِ کتاب نہ زیادتی کرو اپنے دین میں اور نہ کہو اللہ پر مگر حق، بیشک مسیح بن مریم اللہ کے رسول اور اُس کا کلمہ تھے۔

بعض علمائے محققین نے لکھا ہے کہ یہود کا جُرم احکام الٰہی میں تفریط اور کمی ہے اور نصاریٰ کا جُرم افراط یعنے احکامِ الٰہی میں زیادتی ہے جس کو قرآنِ پاک نے غلو کہا ہے۔ تفریط غضبِ الٰہی کے نزول کا اور افراط ضلالت کا موجب ہے۔

اس تفصیل سے یہ بات مُویدا ہے کہ اُمتِ محمدیہ کو ہر نماز کی ہر رکعت میں یہ تاکید ہے کہ یہ دعا مانگو کہ" بارالٰہا ہم کو نبیوں کی راہ پر چلنے کی توفیق عنایت فرما اور یہود و نصاریٰ جو تیرے مغضوب اور تیری راہ سے بھٹکے ہوئے ہیں ان کے راستوں اور طریقوں سے ہم کو بچا"۔ اس موقع پر ہم کو یہ بھی سمجھنا چاہئیے کہ مغضوب اور ضال سے جس طرح اہلِ کتاب میں ہیں اپنی اپنی مزاجی کیفیت کی بناء پر وہی صورتیں ہنتا بعینہٖ شبہہ اہلِ کتاب میں بھی ہیں جن کی دو جماعتوں سے ہم کو قرآن نے واقف کرایا ہے اور وہ مجوس اور صابئین

ہیں جن میں ایرانِ قدیم اور ہندِ قدیم کے باشندے بھی داخل ہیں
اُن کے راستوں اور طریقوں کی پیروی بھی انبیا علیہم السلام کے
راستوں سے دور لے جاتی ہے۔

اس کے بعد مولانا نے یہ بتلایا کہ جتنے فتنے کھڑے کئے گئے خواہ
تاریخ قدیم میں ہو، اسلام میں ہو عیسائیت میں یا موجودہ تاریخ جدید
یورپ میں ہو سب کی تہ میں یہودیوں کا ہاتھ کارفرما رہتا ہے اس
کے بعد ارشاد فرماتے ہیں۔

حکومت کا حق خدا ہی کو ہے

آج ہمارے اسلامی ممالک خواہ
وہ اپنے کو آزاد کہیں یا غلام حاکم
کہیں یا محکوم، کیا انہی دو فتنوں میں سے کسی ایک میں مبتلا نہیں۔
اب یاد کیجئے رب العالمین، مالک یوم الدین نے اول روز سے ہم
کو یہ بتایا تھا کہ تم ہمیشہ ہر ایک حال اور اپنی ہر ایک چال میں
انبیاء علیہم السلام کے راستہ پر قائم رہنا اور مغضوب اور ضال
قوموں کے راستوں سے بچتے رہنا، مگر کیا یہ واقعہ نہیں کہ ہم نے
اُس کا اُلٹا کیا، یعنے انبیاء کے راستہ کو چھوڑ کر مغضوب اور ضال
قوموں کی راہوں کو اختیار کیا، اور آج بھی یہی حال ہے۔ آج
مسلمانوں کی ہر جماعت خواہ وہ کسی قوم میں ہو اپنی ترقی و اصلاح
اور سعادت کے لئے انبیاء علیہم السلام کی طرف نہیں بلکہ انہی
مغضوب اور ضال قوموں کی امامت کی اقتداء کے لئے بیقرار
ہے۔ وضع قطع تراش خراش، صورت و سیرت، تعلیم و تربیت
تہذیب و تمدن، اخلاق و عادات، رفتار و گفتار، تجارت و اقتصا

و معاملات اور حکومت و سلطنت، غرض کہ زندگی کے ہر شعبے میں اس کا رُخ انبیاءِ علیہم السلام کی طرف سے یا مغضوب و ضال قوموں کی طرف ہے؟ ہم زبان سے تو کہتے ہیں کہ منہ میرا طرف کعبہ شریف کے، مگر رفتار کی سمت لندن پیرس، ماسکو، برلن اور نیو یارک ہے زبان سے تو اپنی سعادت اور ہدایت کو انبیاءِ علیہم السلام کی اور خصوصاً سرورِ کائنات احمد مجتبیٰ محمد مصطفیٰ (صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی میں منحصر جانتے ہیں۔ مگر دل میں اپنی ترقی کا راز یورپ اور امریکہ کی پیروی میں منحصر جانتے ہیں۔ ہم میں سے بعضوں نے جو دانشمندی کے مدعی ہیں، دین اور دنیا کے دو حصے کر رکھے ہیں اور دین میں انبیاء کی اور دنیا میں ان مغضوبوں اور گمراہوں کی پیروی کے داعی ہیں۔ لیکن دین و دنیا کی یہ تقسیم کی تاویل بھی انہی گمراہوں کی تعبیل کا اعادہ ہے۔ جنھوں نے اپنے آسمانی صحیفوں میں یہ لکھا پایا ہے کہ جو قیصر کا ہے قیصر کو دو اور جو خدا کا ہے وہ خدا کو دو؟ گویا وہ دو خداؤں کے قائل ہیں۔ قیصر جو دنیا پر حکومت کرتا ہے۔ اور خدا جو آسمان پر فرمانروا ہے۔ لیکن انبیاءِ علیہم السلام کی تعلیم میں وہ واحد ہے۔ وہ قیصر کون ہے جو خدا کے ساتھ برابر کی حکومت کا دعویدار ہے اَللّٰہُ مُلْکُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ (آسمانوں اور زمین کی بادشاہی اللہ ہی کی ہے) ان مغضوب و ضال قوموں کی ایجاد و اختراع، دولت و طاقت، حکومت و سلطنت کی ظاہری چمک دمک نے ہماری آنکھوں کو خیرہ کر دیا ہے، ان کی عریانی و بے پردگی، ان کی نفس پرستی و ہوسناکی و خود پسندی۔ ان کے تکبّر و

استکبار ان کے کفر و عصیان کی ہر تصویر ہمارے دل کو پسند ہے۔ ہمارے بچے، جوان اور بوڑھے، عورت اور مرد ہر ایک اس کوشش میں ہے کہ وہ یہود و نصاریٰ کے اس مشترکہ پیدا کردہ تہذیب و تمدن، طور وطریق، شکل ولباس، تعلیم وتربیت کی راہوں پر اقتدا کی تیز سے تیز دوڑ میں دوسروں سے آگے بڑھ جائے اور ہر اس ناصح کی تکذیب میں مصروف ہے، جو ان کو ان منصوبوں اور گمراہیوں کی پیروی سے باز رکھنے کی کوشش کرے۔ آج مسلمان نوجوان اپنی زندگی کے ہر پہلو میں اپنی ملت کے رہنمائے اقدس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا نمونہ نہیں بلکہ لینن، اسٹالن، مسولینی، چرچل اور روزولیٹ کے نمونوں کی تلاش اور ان کے روپ بھرنے میں ہر طرح کوشاں ہیں اور انہی کی پیروی میں مسلمانوں کی نجات سمجھتے ہیں اِنَّا لِلّٰہِ وَ اِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ ۵

اسلام ایک مستقل نظام حیات ہے مسلمان انبیاء کی بجائے قیصر وکسریٰ کے جانشین بن گئے

اہل سیاست کو موجودہ مغضوب وضال قوموں کے مذموم تمدن، تہذیب مکروہ و بے آئین نظام سلطنت وحکومت، ظالمانہ طریق حکمرانی وفرمانروائی گمراہانہ طریق تعلیم وتربیت، فاسد اخلاق وکردار اور قزاقانہ اقتصاد وحشیانہ طاقت اور مجرمانہ سیاست پر افسوس نہیں۔ بلکہ اس پر حسرت ہے کہ اس مجرم گنہگار، عریاں، خوشنما فاسد الاخلاق قزاق اور وحشی طاقت کے حکمران وفرمانروا اور ظالم نظام اقتصاد اور فاسد اصول فضا

وعدالت کے مالک ہم کیوں نہ ہوئے ان کو یہ افسوس نہیں کہ شیطان کا یہ تخت جبروت کیوں بچھا ہے بلکہ یہ افسوس ہے کہ ہم اس پر کیوں بیٹھے نہیں۔ ان کو شیطان کے تخت الٹنے کی فکر نہیں بلکہ اس پر جلوس فرمانے کی فکر مستولی ہے۔

مسلمان مدت سے اس حالت میں ہیں کہ وہ اپنے کو بھول گئے ہیں اور دوسری قوموں کی نقالی میں مصروف ہیں اسلام ایک مستقل نظامِ حیات، نظامِ اقتصاد، نظامِ سیاست اور نظامِ اخلاق کا نام ہے۔ خود اپنے نظامات سے روگرداں ہوکر یا اُن میں ترمیم وتبدیلی کرکے دنیا کے دوسرے ناقص وفاسد نظامات کو اختیار کرنے میں اپنی زندگی کی نجات جانتے ہیں۔

ٹرکی۔ مصر۔ شام۔ عراق۔ افغانستان۔ شمالی افریقہ ہندوستان غرض وہ جہاں کہیں بھی ہیں خواہ وہ حاکم ہوں یا محکوم یورپ کی نقالی کو اپنی نجات کا واحد ذریعہ سمجھتے ہیں۔ وہ دنیا میں قیصریت اور کسرانیت کے علمبردار اور پیغمبروں کے بجائے ہلاکوؤں اور چنگیزوں کے جانشین بن گئے۔

حکومتِ الٰہیہ کے قیام کی دعوت

آج انقلاب کا عہد ہے مسلمانوں کو چاہیئے کہ وہ پھر سے اپنی رفتار کی سمت اور زندگی کے مقصد کو درست کریں۔ وہ اللہ کے محکوم، اُس کی شریعت کے حامل اور دنیا میں اس کی شہنشاہی کے نمائندے ہیں ان کو پہلے اللہ کے قانون کو خود اپنے اُوپر اور پھر اس کے بعد دوسروں کے اوپر نافذ کرنا چاہیئے۔

مسلمانوں کو ان معنوں میں قوم نہیں کہنا چاہیئے جن معنوں میں رنگ اور نسل و نسب اور وطن کے اجزائے ترکیبی سے دنیا میں قومیں بنائی جاتی ہیں بلکہ انسانی جماعتوں کا وہ ایسا مجموعہ ہیں جن کے ترکیبی اجزاء خاص خیالات، خاص عقائد، خاص اعمال، خاص اخلاق خاص تمدن ۔ خاص اصول سلطنت و حکمرانی ہیں۔ اسی لئے وہ دوسری قوموں کے ساتھ متحد و محکوم ہو کر نہیں بلکہ مصالحانہ و معاہدانہ اصول پر دوست بن کر زندگی بسر کر سکتے ہیں۔ ورنہ اُن کا وجود دوسری قوموں کے ساتھ مخلوط ہو کر پائدار نہ ہوگا ۔ خصوصیت کے ساتھ اس جاحظہ بمبئی میں جہاں مسلمان تعداد میں نسبتاً کم ہیں اور دنیا بھر کی مختلف قوموں، مذہبوں اور فرقوں کے سمندر میں غرق ہیں ۔ ....

اے حضرات! ضرورت ہے ذہنیت کے بدلنے، خیالات کے پلٹنے اور صحیح فکر کو سامنے رکھنے اور صحیح نصب العین کو اپنے دل میں جگہ دینے کی۔ جہاں تک جمعیت العلماء بمبئی کا تعلق ہے اس مقصد کو حسب ذیل طریقوں سے حاصل کیا جا سکتا ہے ۔

(۱) بمبئی میں ایک عظیم الشان مذہبی درسگاہ کا قیام عمل میں آئے جس میں صحیح تعلیم و تربیت کی پوری نگرانی و حفاظت ہو۔

(۲) یہاں کی مسجدوں میں قرآنِ پاک کے عام فہم درس کا انتظام کیا جائے جس سے عام مسلمانوں کو اپنے دین کی صحیح واقفیت ہو۔

(۳) عام ماہانہ مواعظ کے ذریعہ سے اخلاق و عادات فاسدہ اور شادی و غمی کے بے جا مراسم کی اصلاح ہو ۔

مولانا کے خطبے پر ایک نظر

مولانا سید سلیمان ندوی نے اپنے خطبے میں ارشاد فرمایا ہے
کہ "ترکی ۔ مصر ۔ شام ۔ عراق ۔ افغانستان ۔ شمالی افریقہ ۔ ہندوستان
غرض وہ جہاں کہیں بھی ہیں خواہ وہ محکوم ہوں یا حاکم یورپ کی نقالی
کو اپنی نجات کا واحد ذریعہ سمجھتے ہیں وہ دنیا میں قیصریت اور کسرائیت کے
علمبردار اور پیغمبروں کے بجائے ہلاکوؤں اور چنگیزوں کے جانشین
بن گئے " مولانا نے یہ بالکل بجا ارشاد فرمایا ہے ۔ خود مسلمانانِ
ہند کا ماضی بھی اس حقیقت کا آئینہ دار ہے اور ان کا موجودہ مطمح نظر
بھی وہ نہیں ہے جس کے داعی انبیائے کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام
تھے ۔ اور جس کا معلم و داعی قرآنِ کریم اور اسوۂ رسول اکرم صلی اللہ علیہ
وسلم ہے ۔ قوم پرور مسلمان ہندوستان میں جو نظامِ حکومت قائم کرنا
چاہتے ہیں اس کے بارے میں تو اسلام کا نام لینا ہی عبث ہے علمبردارانِ
پاکستان کے افکار ، وخیالات اور اعمال و اخلاق سے بھی اس سے بہتر
حکومت کی توقع نہیں کی جاسکتی جسے مولانا سید سلیمان ندوی قیصریت
وکسرائیت کی جانشینی قرار دیتے ہیں ۔ مسلمانوں کو انبیاء کرام
کی جانشینی کا شرف و امتیاز تو اس صورت میں ہی حاصل ہو سکتا ہے
جب مسلمان اسی پیغام کو اپنا نصب العین بنائیں جسے لے کر انبیاء

کرام مبعوث ہوئے اور انہیں کے طریقۂ کار کو اپنا لائحۂ عمل قرار دیا۔

مولانا نے خطبہ کے آخر میں مسلمانوں کو اللہ کی شہنشاہی کا نمائندہ بننے اور اس کے قانون کو نافذ کرنے کی دعوت دی ہے اور اس دعوت کو کامیاب بنانے کے لئے پانچ طریقے ارشاد فرمائے ہیں، ان طریقوں کے مفید اور کارآمد ہونے سے انکار نہیں کیا جاسکتا لیکن ہم دیکھ رہے ہیں کہ یہ سب کچھ کم وبیش ہورہا ہے، دارالعلوم ندوہ بھی قائم ہے اور دارالعلوم دیوبند بھی، اور بے شمار دینی مدارس بھی وعظ و تذکیر کے بڑے بڑے جلسے بھی ہوتے رہتے ہیں مسجدیں بھی آباد ہیں اور قرآنِ مجید کی تلاوت بھی ہورہی ہے، بایں ہمہ مسلمانوں کا خدا کی شہنشاہی کا نمائندہ بننے کے لئے کوئی صحیح اور مقررہ قدم اٹھانا تو درکنار ابھی مسلمانوں میں اس کے خیال و احساس کا بھی فقدان ہے۔

اس کی ایک خاص وجہ ہے مسلمان یہ سب کچھ صحیح فکر اور صحیح نصب العین کے بغیر کر رہے ہیں یہی وجہ ہے کہ ان کاموں کا وہ نتیجہ برآمد نہیں ہوتا جوان کا مقصد ہے۔ مولانا سید سلیمان ندوی نے بالکل بجا ارشاد فرمایا ہے کہ۔ ضرورت ہے ذہنیت کے بدلنے۔ خیالات کے پلٹنے اور صحیح فکر کو سامنے رکھنے اور صحیح نصب العین کو اپنے دل میں جگہ دینے کی ؎ جب تک مسلمان ایسا نہ کریں گے۔ اُن کی تعلیم گاہوں، مسجدوں، نمازوں، جلسوں، تقریروں غرض کسی چیز سے صحیح اور کامل نتیجہ برآمد نہ ہوگا اور مسلمان خدائی شہنشاہی کا نمائندہ بننے کی بجائے کفر و طاغوت کے ایجنٹ، آلۂ کار اور غلام ہی بنے رہیں گے۔

مقصدِ رسالت

حکومتِ الٰہیّہ کا قیام

اسلام کا دنیا میں ایک مستقل نظام ہے جو حکومت پر موقوف ہے۔
بغیر حکومت کے قرآنِ مجید کا پورا حِصّہ ناقابلِ عمل رہ جاتا ہے

مولانا ابوالحسن علی صاحب دارالعلوم ندوۃ العلماءٔ
لکھنو کے استاذ تفسیر ہیں۔ آپ نے ہندوستان کے
مجاہدِ اعظم حضرت سید احمد بریلوی رحمۃ اللہ علیہ کی ایمان
افروز اور روح پرور سوانح عمری لکھی ہے اس کتاب
پر حضرت مولانا حسین احمد صاحب نے اپنی رائے تحریر
فرمائی ہے، مولانا عبدالماجد دریا بادی نے تعارف
اور علامہ سید سلیمان ندوی نے مقدمہ لکھا ہے
مولانا ابوالحسن صاحب نے سید احمد صاحب کے تفصیلی
حالات شروع کرنے سے پہلے سید صاحب کی سیرت پر

ایک اجمالی تبصرہ کیا ہے۔ اس کا ایک بڑا حصہ یہاں دیا جا رہا ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک غیر فانی معجزہ یہ ہے کہ آپ کے فیض کا چشمہ کبھی خشک ہونے نہیں پاتا آپ کا نمونہ آنکھوں سے کبھی اوجھل نہیں ہوتا۔ آپ کی امت کی ضرورتیں زیادہ دیر تک اٹکی نہیں رہتیں اور وہ اس طرح پر کہ آپ کی مشعل نور سے براہ راست مسلسل طریقہ پر سینکڑوں مشعلیں روشن ہوتی رہتی ہیں اور قیامت تک ہوتی رہیں گی۔

آپ کی کامل پیروی سے ہر زمانہ میں اور تقریباً ہر جگہ کم وبیش ایسے انسان پیدا ہوتے رہے جن سے آپ کی یاد تازہ ہوتی تھی اور انبیاء کی شان نظر آتی تھی جن سے ظاہر ہوتا کہ اللہ کا کام بند نہیں ہوا۔ اللہ کا دین زندہ ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی ہر زمانہ میں ممکن ہے اور انہیں کی وجہ سے خاتم النبیین کے بعد کسی نبی کی عملاً ضرورت نہیں۔

ان بزرگوں کے کئی طبقے ہیں پہلے اور سب سے اونچے طبقہ کو صحابۂ کرام کے نام سے یاد کیا جاتا ہے اور جس طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر نبوت کے کمالات ختم ہو گئے اسی طرح ان حضرات پہ ان کی اتباع کامل ختم ہو گئی۔

ان کے بعد سلف صالحین، اولیاء کاملین، مجاہدین مرشدین، مصلحین، مجددین، مختلف طبقات ہیں۔ اور یہ سب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے تلامذہ و مریدین آپ کے کفش بردار اور آپ کے دین کے خادم ہیں، اور اس سے زیادہ کچھ نہیں۔

ان لوگوں سے اللہ ہمیشہ کام لیتا رہا۔ ان سے ہزاروں کی آنکھیں روشن کیں۔ ہزاروں کے دل کے کنول کھلائے ہزاروں کو جگایا۔ بندوں پر اپنی حجت ختم کی، ان کا ذکر عبادت ہے، ان کی محبت ذخیرۂ آخرت ہے۔ اُن کی سیرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت کا ایک جزء ہی۔

اگرچہ ان میں سے ہر ایک اپنے رنگ میں کامل تھا لیکن ان کاملوں میں بھی کامل وہ ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا نمونۂ کامل ہے جس میں صحابہ کی شان سب سے بڑھ کر تھی جس سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مذہب و مقصد کی زیادہ خدمت و ترقی ہوئی جس کی صحبت و تربیت سے ایسی جماعت تیار ہوئی جس نے خیر القرون کی یاد تازہ کر دی

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت ایک بار ملاحظہ ہو اور آپ کی جامعیت پر نظر کی جائے۔ علم و عمل کے جامع دین و دنیا کے جامع۔ شب بیدار و شہسوار، اللہ کے لئے اگر محبت کرتے تھے تو اللہ ہی کیلئے دشمنی بھی کرتے تھے۔

نفس کے مجاہدہ کے ساتھ کفار سے جہاد بھی کرتے تھے۔
لیکن صحابۂ کرام کو چھوڑ کر ذرا پیچھے ہٹ کر دیکھئے
بہت سے لوگوں کے جسم پر یہ مسلم قبا نظر نہیں آئے گی
اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا نمونہ دیکھنا ہے تو اُن
میں سے ایک کو نہیں دیکھنا چاہیئے، ورنہ آپ کی شان کا
تصور ناقص ہوگا۔ اس لئے کہ یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم
کی تیئس سالہ زندگی کے صرف مخصوص اوقات کا نمونہ ہیں
اگر کامل نمونہ دیکھنا ہے تو سب کو جمع کر کے دیکھنا چاہیئے
لیکن صحابۂ کرام کی صف چھوڑ کر کہ این خانہ تمام آفتاب ست
ہر صف میں چند ایسے لوگ نظر آئیں گے جو رسول اللہ صلی اللہ
علیہ وسلم کی سیرت کا مکمل صحیفہ ہیں جنھوں نے آپ کے کمالات
میں سے انتخاب نہیں کیا بلکہ اُن کو مسلم لیا۔ یہ وہ افراد ہیں
جن میں سے ہر فرد اپنی جامعیت میں ایک پوری امت ہے
آئندہ اوراق سے معلوم ہوگا کہ انھیں افراد امت میں
سے سید احمد شہید بھی ایک فرد ہیں جو زمانہ کے لحاظ سے
پیچھے لیکن مرتبہ کے لحاظ سے بہت آگے ہیں۔
اس کے بعد دوسری حیثیت پر غور کرنا چاہیئے، رسول اللہ
صلی اللہ علیہ وسلم کا دنیا میں ایک بہت بڑا کام اور آپ کی
بعثت کا ایک اہم مقصد حکومت الٰہیہ کا قائم کرنا اور دنیا
میں آسمانی نظام سیاست واخلاق ومعاشرت جاری کرنا
تھا۔ پشاور کے فاتح اور تیرھویں صدی کے امیر المومنین کی

زندگی میں اتباعِ نبوی کی حیثیت بہت نمایاں نظر آئے گی اور اسی چیز نے مشائخِ امت میں اس جوان کا سر اونچا کر دیا ہے۔

مصلحین، علماء اور مشائخ نے بے شبہ اسلام کی گرانقدر خدمات انجام دی ہیں اور دے رہے ہیں، ہزاروں بندگانِ خدا کو اُن سے ہدایت ہوئی۔ ہزاروں کو ان کی وجہ سے کلمہ نصیب ہوا۔ ہزاروں کے خاتمے اچھے ہوئے۔ اور ابھی رسول اللہ کا فیض ان سے جاری ہے۔ لیکن اُن سب کے محدود حلقے اور عمل کے دائرے ہیں سید صاحب رحمتہ اللہ علیہ نے اس نکتہ کو اچھی طرح سمجھا کہ حکومتِ الٰہی اور اسلامی نظام وقوانین وحدود کے اجزاء اور ماحول کی تبدیلی کے بغیر یہ سب کوششیں "کوہ کندن وکاہ برآوردن" ثابت ہونگی صرف چند خاص لوگوں کی اصلاح ہوگی لیکن ضرورت فضاء بدلنے اور جڑ مضبوط کرنے کی ہے آپ اسی نقشہ پر کام کرنا چاہتے تھے جس پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے خلفائے راشدین نے کیا اور تجربہ ہے کہ سب سے زیادہ پائدار کامیابی اسی کو ہوئی اور قیامت تک اسلام کی ترقی کے لئے وہی نظامِ عمل ہے۔

اسلام صرف خواص کا مذہب نہیں۔ اور چند منتخب لوگوں کا اس پر عمل کرنا کافی نہیں۔ اسی طرح اسلام عیسائیت کی طرح چند عقائد ورسوم کا نام نہیں، وہ زندگی کا نظام ہے

وہ زمانہ کی فضا طبیعت بشری کا مذاق اور سواد اعظم کا رنگ بدلنا چاہتا ہے، اور عقائد کے ساتھ، اخلاق، معاشرت زندگی کے مقصد و معیار۔ زاویہ نظر اور انسانی ذہنیت کو بھی اپنے قالب میں ڈھالنا چاہتا ہے۔ یہ اسی وقت ہوسکتا ہے کہ اس کو مادی و سیاسی اقتدار حاصل ہو صرف اسی کو قانون سازی، اور تنقید کا حق ہو، اس کے صحیح نمائندے ہی دنیا کے لئے نمونہ ہوں۔ اسلام کے مادی اقتدار کا لازمی نتیجہ اس کا روحانی اقتدار اور صاحب اقتدار جماعت کے اخلاق و اعمال کی اشاعت ہے۔ اسی حقیقت کو قرآن نے اس طرح بیان کیا ہے:۔

الذین ان مکنّٰھم فی الارض اقاموا الصلوٰۃ وآتوا الزکوٰۃ وامروا بالمعروف ونھوا عن المنکر وللہ عاقبۃ الامور۔

یہ (مظلوم مسلمان) وہ ہیں کہ اگر ہم نے زمین میں انھیں صاحب اقتدار کیا (یعنے ان کا حکم چلنے لگا) تو وہ نماز کو قائم کریں گے زکوٰۃ کی ادائیگی میں سرگرم ہونگے نیکیوں کا حکم دیں گے، برائیاں روکیں گے اور تمام باتوں کا انجام کار اللہ ہی کے ہاتھ ہے۔

دوسری نہایت اہم بات یہ ہے کہ شرعی حکومت کے بغیر شریعت پر پورا عمل بھی نہیں ہوسکتا، اسلام کا دنیا میں ایک مستقل نظام ہے جو حکومت پر موقوف ہے۔ بغیر

حکومت کے قرآنِ مجید کا پورا حصہ ناقابلِ عمل رہ جاتا ہے۔ خود اسلام کی حفاظت بھی بغیر قوت کے ممکن نہیں، مثال کے طور پر اسلام کا پورا نظام مالی و دیوانی و فوجداری معطل ہو جاتا ہے اس لئے قرآن غلبہ وعزت کے حصول پر زور دیتا ہے اور اسی لئے خلافتِ اسلامی بہت اہم اور مقدس چیز سمجھی گئی۔ اور اس کو اکابر صحابہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تجہیز وتکفین پر مقدم رکھا جس کو بہت سے کوتاہ نظر نہیں سمجھتے اور اسی کی حفاظت کے لئے حضرت حسین نے اپنی قربانی پیش کی تاکہ اس کا مقصد ضائع نہ ہو اور نااہل ہاتھوں میں نہ جانے پائے۔

اَمر بالمعروف اور نہی عن المنکر اسلام میں جس قدر اہم فریضہ ہے، وہ اس سے ظاہر ہے کہ امت کی بعثت کا مقصد یہی بتایا گیا ہے۔

کنتم خیر امۃ اخرجت للناس تامرون بالمعروف وتنھون عن المنکر ۝

تم بہترین قوم موجود دنیا میں اس لئے ظاہر کی گئی کہ تم بھلائی کا حکم دیتے ہو اور برائی سے روکتے رہو۔

اور قیامت تک کیلئے مسلمانوں کا یہی فرض قرار دیا گیا ہے۔

ولتکن منکم امۃ یدعون الی الخیر ویامرون بالمعروف وینھون عن المنکر ۝

تم میں ایک جماعت رہنی چاہیئے جو بھلائی کی طرف دعوت

دیتی رہے نیکی کا حکم کرتی رہے اور برائی سے روکتی رہے ۔
لیکن یہ یاد رہے کہ اس کے لئے امر (حکم) اور نہی (ممانعت)
کے الفاظ استعمال کئے گئے ہیں، اہل علم جانتے ہیں کہ امر و نہی
کے لفظ میں اقتدار و تحکم کی شان ہے یہ نہیں فرمایا کہ وہ بھلائی
اختیار کرنے کے لئے درخواست و عرض کریں گے، پس امر و نہی
کے لئے سیاسی اقتدار اور مادی قوت کی ضرورت ہے اور
امت کا فریضہ ہے کہ وہ اس کا انتظام کرے ۔

مولانا ابوالحسن کے خیالات پر اک نظر ۔

مولانا ابوالحسن نے جو کچھ لکھا ہے اُس کا تعلق
حکومت الٰہیہ سے نہیں بلکہ سید احمد صاحب کی سیرت سے ہے
لیکن آپ سید احمد صاحب کے تذکرے کو نکال کر ان کی تحریر کو
پڑھئے تو معلوم ہوگا کہ یہ تحریر حکومت الٰہیہ کی تائید و حمایت
میں سپرد قلم کی گئی ہے ۔ یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ جو شخص بھی
اپنے کسی مفروضہ نصب العین اور اپنے غلط ماحول کو مد نظر رکھ کر
نہیں بلکہ اسلام کو ملحوظ رکھ کر غور کرتا ہے اس کے اندر سے
حکومت الٰہیہ کی تحریک اُبھرتی ہے ۔

مولانا ابوالحسن کی فکر و کاوش کا ماحصل یہ ہے :۔

(۱) حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کا بہت بڑا کام
اور اہم مقصد حکومت الٰہیہ کا قیام تھا ۔

(۲) امت میں سب سے بلند مقام صحابۂ کرام کا ہے، اس لئے کہ
حکومت الٰہیہ کے قیام کے لئے نبئ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے زیر علم

انھوں نے جان و مال سے جہاد کیا اور مقصدِ بعثت کو کامیاب بنایا۔

(۳) اسلام عیسائیت کی طرح چند عقائد و رسوم کا مجموعہ نہیں۔ زندگی کا کامل نظام ہے، اور یہ نظام مادّی قوت و اقتدار کے بغیر نہ قائم ہو سکتا ہے اور نہ باقی رہ سکتا ہے۔

(۴) امر بالمعروف اور نہی عن المنکر مسلمانوں کے لئے ایک ایسا فریضہ ہے جو قیامت تک باقی رہے گا۔ یہ فریضہ بھی حکومت و اقتدار کے بغیر انجام نہیں دیا جا سکتا۔

(۵) مصلحین اور علماء و مشائخ کی خدمات سے بے شمار مسلمانوں کو فائدہ پہنچا مگر حکومت الٰہیہ اور اسلامی قوانین و حدود کے اجراء کے بغیر وہ سب کوششیں "کوہ کندن اور کاہ بر آوردن" کے مطابق تھیں۔

مولانا ابو الحسن کے ان افکار و خیالات کو کون غلط قرار دے سکتا ہے؟ اب یہ مولانا ابو الحسن کا فرض ہے کہ وہ اپنے افکار و خیالات کی روشنی میں اپنی سرگرمیوں اور گرد و پیش کے دوسرے اکابر و اصاغر کی دلچسپیوں کا جائزہ لیں کہ وہ براہِ راست کہاں تک حکومت الٰہیہ کے قیام پر مبذول و منعطف ہیں۔

مولانا اکبر شاہ خاں مرحوم اور حکومت الٰہیہ

یہ مضمون یکم اکتوبر ۱۹۴۴ء کے "کوثر لاہور" میں شائع ہوا ہے شروع میں مولانا نصر اللہ خاں عزیز کا ادارتی تعارف ہے۔

مولوی حامد علی صاحب شاہجہاں پوری نے ہمارے محترم و محبوب مرحوم دوست مولانا اکبر شاہ خاں نجیب آبادی کی مشہور تصنیف فصل الخطاب سے کچھ عبارتیں اخذ کر کے اور اُن کو ایک مضمون کی صورت میں مرتب کر کے اشاعت کے لئے ارسال فرمایا ہے۔ مولانا ئے مرحوم اپنی زندگی میں مورخ اسلام کے قابل فخر نام سے یاد کئے جاتے تھے لیکن اُن کے دوستوں کے علاوہ بہت کم لوگوں کو یہ معلوم تھا کہ بیسویں صدی کا یہ صاحب قلم اپنے جسم کے اندر قرن اول کے اصحاب شمشیر کی روح رکھتا تھا اور پکا موحد، کتاب الٰہی کا ان تھک مبلغ

سنتِ رسول کا با اہتمام متبع اور اسلام کے لیئے ایک نہ ختم ہونے والا جذبۂ محبت رکھنے والا مومن مخلص تھا۔ کوثر کے اڈیٹر کے ساتھ ایسے عزیزانہ اور مخلصانہ تعلقات تھے کہ ان کے دوستوں کو بھی رشک ہوتا تھا اور اسی کی شامتِ اعمال سے مولانا تحریک خاکسار میں شامل بھی ہو گئے تھے لیکن راقم تو تحریک کے عملی نمونے دیکھ کر اس کی ہمدردی سے دستکش ہوا۔ اور مولانا اسلام کے تصورِ امارت کی خاطر جب مشرقی صاحب نے مسلمانوں کے امیر کی وہ تصویر کھینچی جو نازیت فسطائیت اور اشتراکیت کے ڈکٹیٹروں کے مناسب حال ہے تو مولانا کا اسلامی ذوق برہم ہو گیا انھوں نے ایک معرکہ آرا کتاب فصل الخطاب کے نام سے لکھی اور اس میں اس مرکزی نقطے کو قرآن و سنّت سے ثابت کیا کہ انسان کی اطاعت مطلق کے لئے (بجز انبیاء علیہم السلام کی اطاعت کے) اسلام میں قطعاً گنجائش نہیں۔ اسلام میں نہ ملوکیت کے لئے جگہ ہے نہ ڈکٹیٹری کے لئے اور نہ اس ملعون جمہوریت کے لئے جس کے جادو میں مسلمان بھی مبتلا ہیں۔ ہم اس تحریر کو دلی مسرت کے ساتھ شائع کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ مولوی حامد علی صاحب کو جزائے خیر دے اور مولانائے مرحوم کی مغفرت فرمائے کہ اپنی زندگی بھر وہ اللہ، اللہ کے رسول اور کتابِ الٰہی اُسے بے پناہ محبت رکھتے تھے۔ افسوس

آج وہ زندہ نہیں اگر زندہ ہوتے تو تحریک حکومت الہیہ کے ایک پرجوش مبلغ اور مجاہد ہوتے۔

عبادت کا صحیح مفہوم

عبادت کہتے ہیں انتہا درجہ کے تذلل اور انکساری کو اور اس اظہار فرمانبرداری کو جس کے ساتھ اظہار عاجزی بھی ہو ظاہر ہے کہ عاجزانہ فرمانبرداری جس کی کی جائے وہ خدا ہی ہو سکتا ہے دوسرا نہیں ہو سکتا۔ انسان اپنے کمال اور اپنی سعادت کو نہیں پہنچ سکتا جب تک کہ اپنی پوری طاقتوں کو خدائے تعالی ہی کی کامل فرمانبرداری میں نہ لگا دے۔ اس لئے خدائے تعالیٰ نے انسان کی پیدائش کی غرض عبادت بیان فرمائی:-

وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْإِنسَ إِلَّا لِيَعْبُدُونِ

(الزاریات رکوع ۲)

"اور میں نے جنوں اور انسانوں کو پیدا نہیں کیا مگر اس لئے کہ وہ میری عبادت کریں۔"

إِيَّاكَ نَعْبُدُ وَإِيَّاكَ نَسْتَعِينُ (فاتحہ)

ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور تجھ ہی سے مدد مانگتے ہیں۔

لَا إِلَٰهَ إِلَّا هُوَ خَالِقُ كُلِّ شَيْءٍ فَاعْبُدُوهُ

(الانعام رکوع ۱۳)

اس کے سوا کوئی معبود نہیں، ہر چیز کا پیدا کرنے والا ہیں اسی کی عبادت کرو۔

وَلَا يُشْرِكْ بِعِبَادَةِ رَبِّهٖ اَحَدًا ٥

(الکہف ۱۲)

اور چاہیئے کہ اپنے رب کی عبادت میں کسی کو شریک نہ کرے ۔

اِنَّنِیْ اَنَا اللّٰہُ لَآ اِلٰہَ اِلَّآ اَنَا فَاعْبُدْنِیْ وَ اَقِمِ الصَّلٰوۃَ لِذِکْرِیْ طٰہٰ رکوع ۱ ۔

بیشک میں اللہ ہوں میرے سوا کوئی معبود نہیں پس میری عبادت کرو اور میرے ذکر کے لئے نماز قائم کرو۔

وَاعْبُدْ رَبَّکَ حَتّٰی یَاْتِیَکَ الْیَقِیْنُ ٥ (الحجر ۶)

اور اپنے رب کی عبادت کئے جا یہاں تک کہ یقیناً آجانے والی موت تجھ کو آئے ۔

لَآ اِلٰہَ اِلَّآ اَنَا فَاعْبُدُوْنِ ٥

(الانبیاء رکوع ۲)

میرے سوا کوئی معبود نہیں پس میری ہی عبادت کرو۔

اِنِ الْحُکْمُ اِلَّا لِلّٰہِ ؕ اَمَرَ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّآ اِیَّاہُ ؕ ذٰلِکَ الدِّیْنُ الْقَیِّمُ وَلٰکِنَّ اَکْثَرَ النَّاسِ لَا یَعْلَمُوْنَ ٥ (یوسف ۵)

حکم تو بس اللہ ہی کا ہے اُس نے حکم دیا ہے کہ تم سوائے اس کے کسی کی عبادت نہ کرو یہی سیدھا دین ہے مگر اکثر لوگ جانتے نہیں ہیں ۔

وَقَضٰی رَبُّکَ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّآ اِیَّاہُ (بنی اسرائیل ۳)

اور تیرے رب نے فیصلہ کر دیا ہے کہ اس کے سوا کسی کی عبادت نہ کرو۔

خدا کے سوا کسی کی فرمانبرداری نہیں

یہ بتا کر کہ فرمانبرداری کا انتہائی اور اعلیٰ ترین درجہ یعنے عبادت جس طرح خدا کے سوا دوسرے کے لئے نہیں اسی طرح اطاعت (جس کے معنی ہیں برضا و رغبت حکم کی تعمیل کرنا) بھی خدا کے سوا دوسرے کے لئے نہیں (جیسا کہ اوپر قرآنِ مجید ہی سے ثابت کیا جا چکا ہے)..................

غرض جمیع اقسام و انواع اطاعت و فرمانبرداری کو صرف خدا کا حق ٹھہرا کر کسی دوسرے کی فرمانبرداری کو شرک قرار دیا اور انسان کو ڈرایا۔

اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ اَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ وَ يَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَآءُ ۚ وَمَنْ يُّشْرِكْ بِاللّٰهِ فَقَدِ افْتَرٰۤى اِثْمًا عَظِيْمًا ○ نساء

یقیناً اللہ تعالیٰ نہیں بخشتا اس گناہ کو کہ اس کے ساتھ شریک بنایا جائے اور جو اس شرک کے علاوہ ہے وہ جسے چاہے بخشدیتا ہے اور جو شخص اللہ کے ساتھ شریک کرتا ہے وہ ایک بھاری گناہ تراشتا ہے۔

(فصل الخطاب صفحہ ۳۶ تا ۳۹)

جس طرح اکیلے خدا کا پرستار و فرمانبردار بن کر انسان سب کا مخدوم و آقا بن جاتا ہے اسی طرح خدا کے سوا کسی دوسرے کا پرستار و

فرمانبردار بن کر سب سے زیادہ ذلیل و پلید اور سب سے زیادہ ناکارہ و بے توقیر ہو کر اپنے لئے تمام ترقیات اور حصول سعادت کے دروازے بند کر لیتا اور اپنی شرافت کے بلند ترین مقام سے گر کر ذالت کے تحت الثریٰ میں پہنچ جاتا ہے، انسانی آزادی ہی کا نام اطاعتِ الٰہی ہے اور خدائے تعالیٰ نے انسان کو نعمتِ آزادی سے متمتع کرنے کے لئے ہی اپنی طرف سے ہدایت وحی اپنے رسولوں کے ذریعے بھیجی ہے۔

کلام الٰہی نے سب سے زیادہ بلند آہنگی کے ساتھ اس بات کا اعلان کیا ہے کہ انسان خدا کے سوا کسی کے آگے اظہار تذلل نہ کرے، خدا کے سوا کسی کے آگے گردن نہ جھکائے، خدا کے سوا کسی سے حاجات نہ مانگے، خدا کے سوا کسی کو نہ پکارے، خدا کے سوا کسی سے نہ ڈرے، خدا کے سوا کسی کی اطاعت نہ کرے، خدا کی بھیجی ہوئی ہدایت اور خدا کے بھیجے ہوئے ہادی کے سوا کسی کے پیچھے نہ چلے، یہی ایمان باللہ کی حقیقت ہے اور اس میں دینی و دنیاوی کامیابیوں کا راز مضمر ہے۔ اور اس کے ذریعہ دنیا میں طاغوتی طاقتوں کو مٹا کر الٰہی حکومت قائم ہو سکتی اور اس کے ذریعہ ایک انسان دوسرے انسان کا ہمدرد و بہی خواہ بن سکتا اور اس کے ذریعے ہر ایک انسان کی آزادی محفوظ ہو سکتی اور اسی کے ذریعہ نظم اور نظام انسانوں میں قائم ہو سکتا ہے اور نوعِ انسان اس دنیا ہی میں جنتی زندگی کا نمونہ دیکھ سکتی ہے۔

جہاں غیر اللہ کی فرمانبرداری و اطاعت انسان نے اختیار کی

اور نظم و نظام درہم برہم ہوا اور انسان اپنی شرافت انسانی سے جدا ہوا اور اس کی دنیوی و اخروی زندگی رذالتوں اور نجاستوں سے پُر ہوئی ؎

عزیزے کہ از درگہش سر بتافت
بہ ہر در کہ شد ہیچ عزت نیافت

نسلِ انسانی کی تمام بربادیوں، تباہیوں اور گروہ بندیوں کا راز اس میں پنہاں ہے کہ انسان خدائے تعالیٰ کی اطاعت کو خالص نہ رکھ کر دوسروں کی اطاعت کا جُوا اپنی گردن پر رکھتا اور دوسروں کو خدا بناتا رہا ہے۔ خواہ وہ چھوٹے خدا خواہشاتِ نفسانی ہوں یا شیطان و جن ہوں یا چاند سورج اور ستارے ہوں یا پیر و فقیر ہوں یا بادشاہ و امیر ہوں۔

مرکزِ اطاعت خدا کی ذات ہے

اسلام بیشک فرمانبردار بناتا اور گردن جُھکاتا ہے لیکن صرف خدا کا فرمانبردار بناتا اور صرف خدا کے آگے گردن جُھکاتا اور خدا کے سوا ہر ایک کی فرمانبرداری سے روکتا اور خدا کے سوا ہر ایک کے سامنے گردن بلند رکھنے کا حکم فرماتا ہے اور اس کو انسانی شرافت اور نشانِ اسلام قرار دیتا ہے ؎

موحد کہ در پائے ریزی زرش
وگر تیغ ہندی نہی بر سرش
امید و ہراسش نہ باشد زکس
ہمین ست بنیاد توحید و بس

مسلمان مجلس احباب میں اپنے دوستوں کے حکم کو بھی مانتا ہے۔ میدان جنگ میں اپنے سپہ سالار کے احکام کی تعمیل کرتا ہے۔ بیماری کی حالت میں طبیب کے احکام کی تعمیل کرتا ہے شہر میں میونسپل بورڈ اور عامل کے حکموں کی پابندی کرتا ہے اور اس کی تمام زندگی قاعدے اور سلیقے میں ڈھلی ہوتی ہے لیکن یہ سب کچھ نتیجہ اس بات کا ہے کہ وہ خدا کے سوا کسی کا مطیع نہیں وہ خدا کے سوا کسی کو مطلق فرمانروا اور مختار ناطق یقین نہیں کرتا اور خدا ہی کے حکم کی تعمیل میں سب کے احکام کی تعمیل کرتا ہے۔ خدا و رسول نے جس جس کے احکام جہاں تک ماننے کا حکم دیا ہے وہیں تک مانتا ہے اور خدا و رسول کے سوا کسی کو مطاع مطلق اور غیر مشروط طور پر فرمانروا نہیں مانتا اور چنگیزیت و فرعونیت کے آگے کبھی گردن نہیں جھکاتا اور عقل و فہم کے ہوتے ہوئے کبھی لا یعقل چوپایوں کی طرح اپنے آپ کو کسی کے سپرد نہیں کرتا اس لئے کہ وہ تو صرف ایک ہی واحد و لا شریک خدا کا بندہ اور فرمانبردار بن چکا ہے اور صرف خدا ہی کے احکام بلا چون و چرا مانتا ہے لہذا جب خدا و رسول کے احکام کے خلاف اس سے کسی حکم کی تعمیل چاہی جاتی ہے تو وہ فوراً انکار کرتا اور بیوی بچے، دوست احباب، قافلہ سالار، سپہ سالار طبیب اور عامل سب کو پرکاہ کی برابر بھی وقعت نہیں دیتا اس لئے کہ وہ خدا کا فرمانبردار ہے اور خدا اس سے اپنی ہی کامل فرمانبرداری چاہتا ہے، اس طرح نوعِ انسان میں کامل نظم اور پختہ نظام قائم ہو سکتا اور انسانی شرافت باقی رہ سکتی ہے۔ صحابۂ کرامؓ نے

خدائے تعالیٰ کی ایسی ہی کامل فرمانبرداری کی تھی اور اس طرح ماسوا اللہ کی فرمانبرداری سے قطعاً انکار کر دیا تھا اور اسی لئے ان میں کامل ضبط و نظام تھا اور اس لئے وہ دنیا کے فاتح اور سب سے زیادہ بہادر اور جاں فروش و بلند حوصلہ اور ذکی و دانا قوم تھے اور اس لئے ان کو رضی اللہ عنہم و رضوعنہ کا خطاب ملا۔ صہ۴۲ و ۴۳

جس حکومت میں ایک یا چند انسانوں کے لئے انسان ہی مختار ناطق بن جائے اس کو شیطانی حکومت کے سوائے اور کیا کہا جا سکتا ہے اور مومن اس کے قیام کے لئے کہاں ساعی ہو سکتا ہے۔

ایک غیر نبی اور غیر معصوم اولی الامر یا امیر یا امام کی تو حقیقت ہی کیا ہے خود افضل الرسل سید اولاد آدم علیہ الصلوٰۃ والسلام بھی اگر اپنے منصب رسالت و نبوت کے علاوہ محض اپنی بشریت کے بناء پر کوئی بات فرماتے تو اس کی اتباع کو خود ہی امت کے لئے ضروری نہ ٹھیراتے جیسا کہ حدیث تابیر نخل اور بعض دوسری حدیثوں سے ثابت ہے اور حضرت شاہ ولی اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی کتاب حجۃ اللہ البالغہ اور عقد الجید میں اس مضمون کو مفصل اور مدلل طور پر بیان فرمایا ہے۔ خدائے تعالیٰ خود قرآن مجید میں فرماتا ہے کہ۔

مَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّؤْتِيَهُ اللّٰهُ الْكِتٰبَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ ثُمَّ يَقُوْلَ لِلنَّاسِ كُوْنُوْا عِبَادًا لِّيْ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلٰكِنْ كُوْنُوْا رَبّٰنِيّٖنَ بِمَا كُنْتُمْ تُعَلِّمُوْنَ الْكِتٰبَ وَبِمَا كُنْتُمْ

تَدْرُسُوْنَ ہ" (آل عمران-۸)

کسی انسان کا حق یہ نہیں کہ خدا تو اُسے کتابِ حکومت اور نبوت عطا فرمائے اور پھر وہ یہ شیوہ اختیار کرے کہ لوگوں سے کہے کہ خدا کو چھوڑ کر میرے بندے بن جاؤ یعنی خدا کے احکام کی جگہ میرے حکموں کی اطاعت کرو بلکہ تم کو چاہیئے کہ ربانی ہو اس لئے کہ تم کتاب اللہ کی تعلیم دیتے رہتے ہو اور اس لئے کہ اس کے پڑھنے پڑھانے میں مصروف رہتے ہو۔

اس آیت سے معلوم ہوا کہ کسی انسان کے لئے ہرگز یہ جائز نہیں کہ خدائے تعالیٰ کے احکام کو نظر انداز کر کے کسی انسان کے مجوزہ احکام کی اطاعت کرے خدائے تعالیٰ نے رسولوں کو اس لئے مبعوث کیا ہے کہ وہ لوگوں کو احکامِ الٰہی کی دعوت دیں اس لئے نہیں کہ اپنی بندگی کراتے ہیں۔ (صد ۲۰)

قانون سازی خدا ہی کا حق ہے

انبیاء علیہم السلام نے ہمیشہ انسان کو نظامِ امارت کے ان اصول و قواعد پر عامل ہونے کی تعلیم و تاکید فرمائی جو خدائے تعالیٰ کی طرف سے بتائے گئے تھے لیکن شیطان و ترغیبات شیطانی کے قبول کرنے والے شیاطین الانس نے ہمیشہ ان الٰہی قوانین و اصول کی خلاف ورزی پر انسان کو آمادہ اور مبتلائے مصائب رکھنا چاہا۔ یہ حق و باطل کی کشمکش جس طرح انسان کے ہر شعبۂ حیات میں موجود نظر آتی ہے اس طرح نظم و نظامِ امارت کے معاملے میں بھی پورے جوش و خروش کے ساتھ

برپا ہے تعلیمات انبیاء کا منشاء تھا کہ انسانی آزادی محفوظ ہو یعنی انسان صرف خدا کا مطیع ہو اور اس کے خیال وعقیدہ، اعمال و افعال املاک واموال اور اختیار وارادہ پر خدا کے سوا کسی دوسرے انسان یا غیر خدا کا کوئی دباؤ نہ ہو......... چنانچہ نمرود و فرعون اور ان کی مخالفت کرنے والوں میں ابراہیم علیہ السلام وموسیٰ علیہ السلام کی مثالیں اگر توریت و قرآن مجید میں مذکور ہیں تو ہندوستان کے برہمنوں کی قانون سازی اچھوتوں کی بے چارگی، قدیم یونانی اور قدیم رومی سرداروں کے محکوم اقوام پر مظالم، چنگیز و ہلاکو کی خونریزی وغیرہ تاریخوں کے صفحات میں مندرج ہے اور موجودہ سفید فام اقوام کی ستم آرائیاں سیاہ فام لوگوں پر ہماری آنکھوں کے سامنے موجود ہیں۔" ص۴۸ و ۵۵

قرآن مجید کی تعلیمات کا خلاصہ اور لُبِّ لباب توحید الٰہی کو دنیا میں قائم کرنا اور تمام جھوٹے خداؤں کا ملیا میٹ کر دینا ہے۔ اسی کا نام خدائے تعالیٰ کی کامل فرمانبرداری اور کامل فرمانبرداری کے دوسرے تمام خواہشمندوں کو مایوس کر دینا ہے اس میں ہر قسم کی کامرانی و مقصد وری کا راز مضمر ہے اور اس کے ذریعے نسل انسان اپنی شرافت کے صحیح مقام پر فائز ہو سکتی ہے۔" ص۱۰۲ و ۱۰۳

اب اس بات کے تسلیم اور یقین کر لینے میں کیا تامل ہو سکتا ہے کہ معتبر و نا قابل تنسیخ قانون وہی بنا سکتا ہے جو کامل علم رکھتا ہو حقیقی ہمدرد و مہربان ہو اور بے احتیاج ہو۔ ظاہر ہے کہ مخلوق کے متعلق علم تامہ خالق کے سوا کسی دوسرے کو نہیں ہو سکتا، اور

ظاہر ہے کہ الرحمٰن سے زیادہ مہربان دوسرا نہیں ہو سکتا اور ظاہر ہے کہ الصمد سے بڑھ کر بے احتیاج دوسرا نہیں ہو سکتا۔ لہذا خدا تعالیٰ کے سوا کوئی دوسری ہستی ایسی نہیں ہو سکتی جو انسان کے لئے کامل و مکمل اور ناقابلِ ترمیم قانون بنا سکے۔" ص ۱۸

جب کہ انسان جو اپنا مقنن نہیں بن سکتا تھا اور الٰہی ہدایت کا محتاج تھا تو دنیا میں کوئی قوم ایسی نہیں ہونی چاہئے تھی جس کے لئے ہدایتِ الٰہی لانے والا کوئی ہادی مبعوث نہ ہوا ہو چنانچہ خدائے تعالیٰ فرماتا ہے۔

لِكُلِّ قَوْمٍ هَادٍ ۝ (الرعد رکوع ۱)

ہر ایک قوم کے لئے رہنما آتا رہا ہے۔" ص ۲۲

غیر الٰہی حکومت کے متعلق قرآن کا فتویٰ

جب کسی جماعت یا کسی تحریک کے اصولوں میں یہ محسوس ہو کہ حکم اور فیصلہ کا اختیار خدا و رسول یعنی کتاب و سنت سے چھین کر کسی شخص یا اشخاص کو سپرد ہو رہا ہے اور خدا و رسول کی اطاعت مطلق کسی دوسرے کو منتقل ہو رہی ہے تو اس جماعت یا اس تحریک سے پرہیز کرنا فرض ہو جاتا ہے۔

وَمَن يُشَاقِقِ الرَّسُولَ مِن بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُ الْهُدَىٰ وَيَتَّبِعْ غَيْرَ سَبِيلِ الْمُؤْمِنِينَ نُوَلِّهِ مَا تَوَلَّىٰ وَنُصْلِهِ جَهَنَّمَ ۖ وَسَاءَتْ مَصِيرًا ۝ (النسا۔ ۱۷)

اور جو کوئی ہدایت کے ہویدا ہو چکنے کے بعد رسول کی

مخالفت کرے گا اور مومنوں کے طریق کو چھوڑ کر دوسرا طریق اختیار کرے گا تو ہم اس کو اُس رستے پر چلائیں گے اور اس کو دوزخ میں داخل کریں گے اور دوزخ بہت بُرا ٹھکانا ہے۔" (ص ۶۴ و ۶۵)

بات یہ ہے کہ خدائے تعالیٰ نے نوعِ انسان کے لئے جو کامل و مکمل ہدایت نامہ بھیجا ہے اس کے ماتحت جو بادشاہت یعنی الٰہی حکومت قائم ہوگی وہی نوعِ انسان کے درد کا علاج ہو سکتی ہے اور وہی نوعِ انسان کے لئے قیمتی چیز ہو سکتی ہے اور اس کی حالت و نوعیت وہ ہے جو اس فصل میں اوپر بیان ہو چکی ہے اور جس کا نمونہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ اور حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی خلافت و امارت تھی لیکن یہ بادشاہت و حکومت جس کا تصور عام دماغوں میں ہے یہ تو کوئی قابلِ فخر اور قیمتی چیز نہیں ہے بلکہ انسانیت کے چہرہ پر سیاہ دھبہ ہے جس حکومت میں ایک یا چند انسانوں کو خدائی اختیار مل جائیں اور انسانوں کے لئے انسان ہی مختارِ مطلق بن جائے اس کو شیطانی حکومت کے سوا اور کیا کہا جا سکتا ہے اور مومن اس کے قیام کے لئے کہاں ساعی ہو سکتا ہے۔" (ص ۱۰۹)

الٰہی حکومت کے قائم کرنے کے لئے کسی نئے پروگرام اور لائحہ عمل کے بنانے اور انسانی دماغ کی اُپج سے کام لینے کی مطلق ضرورت نہیں ہدایت نامۂ الٰہی یعنے قرآنِ مجید پر عمل کرنے اور قرآنِ مجید کی روشنی میں قدم اٹھانے اور سفر شروع کر دینے سے تھوڑی ہی دور چل کر حکومت و سلطنت کی منزل آ جاتی ہے۔" (ص ۱۰۹)

حضرت مولانا محمد طیبؒ مہتمم دار العلوم دیوبند کے افادات

حکومتِ الٰہیہ کے نصب العین میں دو رائیں نہیں ہو سکتیں منکرِ خدا ہی اس کا منکر ہو سکتا ہے۔

حضرت مولانا محمد طیب صاحب مہتمم دار العلوم دیوبند کے شرف و امتیاز کے لئے اتنا کافی ہے کہ وہ دار العلوم دیوبند کے مہتمم ہیں، لیکن اس کے علاوہ ان کی ذات میں بھی بہت سی امتیازی خوبیاں موجود ہیں وہ علم و فضل اور زہد و ورع میں بزرگانِ دیوبند کے وارث ہیں۔ اچھے صاحبِ قلم، متعدد کتابوں کے مصنف، نہایت خوش گو، اور شگفتہ بیان مقرر ہیں، انھیں مسلمانانِ ہند کے ایک وسیع طبقے میں قدر و منزلت اور ہر دلعزیزی حاصل ہے۔ کانگریس کی ہم نوائی کی وجہ سے

جب کہ جمعیتہ علمائے ہند مسلمانوں میں غیر مقبول ہو رہی ہے دیوبندی حلقوں کے جلسوں میں زیادہ تر مولانا محمد طیب صاحب ہی بلائے جاتے ہیں، صوبہ بمبئی کی جمعیتہ العلماء کے دو سالانہ اجلاسوں کی صدارت مولانا طیب صاحب فرما چکے ہیں صوبہ سندھ کی جمعیتہ العلماء کا سالانہ اجلاس (غالباً ۱۹۴۶ء) میں بمقام حیدر آباد منعقد ہوا تھا اس کی صدارت بھی مولانا ہی نے کی تھی اس اجلاس میں آپ نے جو خطبہ ارشاد فرمایا تھا وہ تمام تر یا بڑے حصے کے اعتبار سے حکومت الٰہیہ کا پیغام تھا ذیل میں روزنامہ "ہلال" بمبئی سے مولانا محمد طیب صاحب کے اس خطبے کا ایک بڑا حصہ دیا جا رہا ہے۔

اسلام میں دین سیاست سے الگ نہیں

ان میں سے دو جزو علم احکام اور حسن اخلاق دیانت کے اساسی شعبے ہیں۔ اور ایک جزو کمال نظم و اجتماعیت سیاست کا شعبہ ہے اور سیاست کو دیانت سے جب بھی علیحدہ کیا جائے گا جب ہی نہ حقیقی سیاست قائم رہے گی نہ حقیقی دیانت، اگر دیانت نہ رہے تو سیاست ایک کٹ کھنا اور جور و استبداد کا ملک ہوگا اور اگر سیاست نہ رہے تو دیانت بے کس بے بس اور مجبور ہو جائے گی قانون محض اور کوئی سیاست سے دنیا کبھی امن و چین کا منہ نہیں دیکھ سکتی۔ اور نہ ہی عالم بشریّہ کی اصلاح و تنظیم ہو سکتی ہے اگر ایسا ہو سکتا تو آج یورپ سب سے زیادہ صالح سب سے زیادہ باہم مربوط اور ساری دنیا سے زیادہ پُر امن ہوتا کیونکہ وہاں قوانین سیاست کی دفعات برساتی کیڑوں کے

تعداد ہیے کسی طرح کم نہیں ہیں۔ کتنی ہی قانون ساز جماعتیں بارہ مہینے وضع قانون میں مصروف ہیں' ہاؤس قانونی بحثوں کے لئے وقف ہیں نئی نئی ضروریات پر روزانہ قانون بنتے اور بگڑتے رہتے ہیں لیکن جس حد تک سیاسی ضوابط بڑھتے جاتے ہیں اسی درجہ روابط باہمی گھٹتے جاتے ہیں۔ رقابتوں اور عداوتوں میں روز افزوں اضافہ ہو رہا ہے انسانوں کی درندگی اور ہوسناکی قانون کے دائرہ میں رہ کر قانونی غارت گریاں اور آئینی ظلم وستم خوب خوب سیکھتے جا رہے ہیں اور یورپ کی ساری دنیا قتل وغارت اور ہوا وہوس کا ایک جہنم زار بنی ہوئی ہے پس اگر سیاست محض اور روکھے قانون سے بشریت کی اصلاح و تنظیم ممکن ہوتی تو یورپ کو یہ روز بد دیکھنا نصیب نہ ہوتا کہ وہاں نہ سیاست کی کمی ہے نہ قوانین کی۔ ہاں اگر کمی ہے تو دیانت کی ہے یعنے وہاں کی سیاست کے پیچھے نہ اخلاق ربانی ہیں نہ مقاصد الٰہیہ کا علم ہے اور نہ ان کا کوئی نمونہ عمل۔ اور جب سیاست کا محور ہی صحیح نہ ہو تو کوری سیاست اور خالی قانونی اوتار چڑھاؤ سے امن نفوس اور سکون عالم کیسے نصیب ہو سکتا ہے پس آج کی یورپین تباہ کاریاں' عالمگیر سر پھٹول اور انسانیت کی یہ تباہی اور ذلت وخواری فقدان سیاست سے نہیں بلکہ فقدان دیانت کے سبب سے ہے جب آدمی ایک بے شعور درندہ بن جائے تو محض سیاست اس کے دل ودماغ کو تبدیل نہیں کر سکتی۔ یہ انقلاب ذہنیت صرف تہذیب اخلاق اور تعلیم کتاب اللہ سے ممکن ہے جو مجموعہ دیانت ہے۔ ہاں مگر اسی طرح دیانت بلا سیاست اور علم واخلاق بلا شوکت بے بس وبیکس

اور عام نگاہوں میں بے وقعت ہو جانے کے سبب قبول عام اختیار نہیں کر سکتے۔ اور نہ صرف یہی بلکہ اس ضعف آور صورت حال کے بڑھ جانے سے ان کی تحقیر و استہزاء اور تمسخر کی داغ بیل پڑتی ہے جس سے شوکت پرست طبقہ میں ان کی حقارت ایک مشن اور مقصد کی حیثیت اختیار کر لیتی ہے۔ فساق و فجار طبیعتیں جو شوکت دین سے دبی رہتی ہیں ان حالات میں کھل کھیلتی ہیں اور اسی استہزاء و تمسخر کی سنت کو اور مضبوط بنا دیتی ہیں ساتھ ہی وہ طبقہ جو گو فسق و فجور کا شکار نہ ہو مگر تقویٰ و تقدس کی طرف بھی کوئی خالص میلان نہ رکھتا ہو وہ بھی فجور کا غلبہ و استیلاء دیکھ کر ادھر ہی مائل ہو جاتا ہے اور اب وہ خالص حقانی طبقہ جو علم و اخلاق کا سرمایہ لئے رہتا ہے بے کس و بے بس ہو جاتا ہے جن میں سے ضعفاء قلوب اس بے کسی کی مصیبت سے تنگ آ کر بالآخر ادھر ہی جا ملتے ہیں اور اس طرح رفتہ رفتہ یہ دیانت بے سیاست اپنا وجود ختم کر دیتی ہے غلامی اور محکومی کے منحوس آثار رفعت و شوکت کے سارے جذبات ختم کر کے خود ہی بلا شرکت غیرے غالب آ جاتے ہیں۔ غلام آباد ہندوستان میں دیانت و راستبازی کی کمی نہیں بلکہ شاید وہ آزاد مسلم ممالک کی نسبت دینی سرمایہ کا زیادہ امین ہے لیکن اس کی دیانت بے یار و مددگار اور زیر تشنیع و ملامت ہے۔ مولوی کا غلط مذہب و نئے ملا ازم تکفیر اہل حق ازالۂ اثر امت علماء کی مساعی اور اس کے بالمقابل الحاد و شرک، بدعات، منکرات و فواحش اور معاصی سے اہل دیانت کی ترغیم صرف انہی کا نتیجہ ہیں کہ دیانت اپنی ہے اور سیاست دوسرے کی یعنی مسجد اپنی ہے اور قفل دوسرے کے ہاتھ

میں ہے جب چاہے جب کھولدے اور جب چاہے جب بند کردے۔
پس اگر مغرب کی سیاست اس کے حق میں اس لئے باعث ہلاکت ہے کہ اس کے ساتھ دیانت شامل نہیں تو مشرق کی دیانت اس لئے ناپائدار اور غیر مستحکم ہے کہ اس کی پشت پر سیاسی طاقت نہیں مگر وہاں فقدان دیانت سے مادی مصائب موت ہلاکت طوفان زلزلوں وغیرہ کا ظہور ہو رہا ہے تو یہاں فقدان سیاست سے روحانی خطرات الحاد، دہریت، بے دینی، شرک و بدعت کا تسلط ہے۔
دنیا کبھی امن وچین کا سانس نہیں لے سکتی اسی لئے اسلام نے دین کی رہبانیت کو ختم کر کے تو اس کے ساتھ سلطنت ملائی اور سلطنت کی ملوکیت کو ختم کر کے اس کو خلافت الہٰی کا جامہ پہنایا جس سے دیانت و سیاست کا ایک ایسا حکیمانہ امتزاج قائم ہوا کہ دیانت کی بے مونسی سیاست سے ختم ہو گئی اور سیاست کا جور و استبداد دیانت سے پامال ہو گیا۔ چنانچہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس جامعیت کی طرف کھلے اشارے فرمائے ایک جگہ ارشاد ہے۔

الملک والدین توأمان۔

ملک اور دین دو جوڑواں بچے ہیں جو ایک دوسرے سے جدا نہیں ہو سکتے

ایک جگہ ارشاد ہے:۔

بعثت مرحمة و ملحمة۔

میں رحمت بنا کر بھی بھیجا گیا ہوں اور جنگ بنا کر بھی۔

ایک جگہ ارشاد ہے۔

أَنَا الضَّحُوكُ والقتال ۔

میں بہت ہنس مکھ بھی ہوں اور جنگ آور بھی ہوں۔

ایک جگہ دوام دیانت کا وعدہ دیا اور ایک جگہ دوام سیاست کا۔

میری امت میں ہمیشہ ایک قوم دین کو برپا کرنے والی رہے گی۔

الجهادُ ماضٍ الی یوم القیمة

جہاد قیامت تک باقی رہے گا۔

قرآن نے نبوۃ کی بھی مدح سرائی کی جو روحانی نعمتوں کا سرچشمہ ہے اور سلطنت کی بھی منقبت نوائی کی جو مادی نعمتوں کا سرچشمہ ہے۔

وَإِذْ قَالَ موسٰی لِقَومِه یٰقوم اذکُروا نعمة الله عَلیکم اذ جَعَل فیکم انبیاء و جعلکم ملوکا و اٰتاکُم ما لم یُؤت احدًا من العٰلمین ۔

اور وہ وقت بھی یاد کرنے کے قابل ہے جب موسیٰ نے اپنی قوم سے فرمایا کہ اے میری قوم تم اللہ تعالیٰ کے انعام کو جو کہ تم پر ہوا ہے یاد کرو جب کہ اللہ تعالیٰ نے تم میں بہت سے پیغمبر بنائے اور تم کو صاحب سلطنت بنایا اور تم کو وہ چیزیں دیں جو دنیا جہاں والوں میں سے کسی کو نہیں دیں۔

دین سیاسی نظام کی حیثیت میں | اسلام نے جیسے دیانت کی بنیاد

پانچ اساسی چیزوں۔ کلمۂ توحید، صلوٰۃ، زکوٰۃ، صیام، حج پر رکھی ہے۔ ایسے ہی سیاسیات کی بنیاد بھی پانچ ہی اصولی چیزوں پر قائم کی ہے۔ جماعت، سمع، طاعت، ہجرت، جہاد، اسلام نے جہاں اخلاقی نظام قائم کیا جس سے انسانی نفوس،
اور قلوب وارواح کی اصلاح ہو اور اس سلسلہ میں عادات وعبادات اخلاقیات اور معاملات وغیرہ کے ابواب قائم کئے وہیں سیاسی نظام بھی قائم کیا جس سے بین الملکی احوال درست ہوں، فتن کا استیصال ہو اور قانون الٰہی کے رواج پذیر ہونے میں کوئی قوی یا ضعیف رکاوٹ پیدا نہ ہو اور اس سلسلہ میں اس نے حدود قصاص تعزیرات وکفارات جہاد اور غزو کے ابواب بھی پیش کئے اسلام نے امیر المومنین کو جہاں سیاسی احکام کا متفقہ نگراں اور امام بنایا وہیں اخلاقی اور دیانتی امور کا بھی محافظ اور امام بنایا ہے۔ چنانچہ عدالت فوجداری، دیوانی، نظام عسکریت اور دفع مظالم کے ساتھ ساتھ امامت صلوٰۃ امامت جنائز، ذاتیاتی احوال کی اصلاح اور اخلاقی تزیبت بھی اس کے متعلق رکھی گئی ہے اس لئے امیر المومنین جہاں مسلمانوں کا بادشاہ ہو۔ وہیں بمنزلہ باپ اور مربی واستاد کے بھی ہوگا تاکہ ان کی دیانت وسیاست دونوں کی نگہداشت کر سکے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن حکیم میں جہاں کوئی سیاسی قانون بیان کیا گیا ہے وہیں کوئی نہ کوئی سیاسی دھمکی اور تادیب دینا وآخرت کی کوئی نہ کوئی وعید بھی سامنے رکھدی گئی ہے تاکہ دیانات کے استغراق میں سیاسیات سے غفلت نہ ہو جائے۔

دین اور سیاست کی علیحدگی

بہر حال اسلام میں مذہب و سیاست الگ الگ نہیں نہ مذہب سے الگ سیاست کوئی چیز ہے اور نہ سیاست سے الگ مذہب کوئی اوپری چیز ہے۔ یہ فرق انہی مذاہب میں نکل سکتا ہے جنہوں نے صرف تعلق مع اللہ کے چند اصول بطور تصوف یا جوگیت تہ نفس کی سعی کی ہے اور انسان کو دنیا کے تعلقات و لذائذ سے الگ کر کے خدا سے ملانے کی صورت رکھی ہے ان میں ترک باایں معنی اصل ہے کہ آدمی دنیا کے تمام معاملات تمام لذتوں ا تمام روابط کو ترک کر کے گھر بار اولاد عزیز و اقارب سے کٹ کر منقطع ہو کر کسی پہاڑ کے گوشے اور دریا کے کنارے بیٹھ یاد الٰہی میں مشغول ہو۔ ظاہر ہے کہ وہاں تعلقات کی کثرت ا ہمہ گیری کب برداشت کی جا سکتی تھی لیکن جس مذہب نے تعلق مع اللہ کے ساتھ تعلق مع الخلق اور تعلق مع النفس کے شعبے اسی تفصیل سے پیش کیے ہوں اس کے یہاں یہ قطع تعلقات ا ترک لذات کی رہبانیت ناتمام انسانیت سمجھی جاتی ہو اور ترک دنیا کا مفہوم گوشہ گیری نہ ہو بلکہ دنیا کے ہجوم میں رہ کر ا[illegible] ہو وہ سیاسی اور معاشرتی تعلقات سے اپنے پیروؤں کو کہ رکھ سکتا تھا اور ایسے رہبانیت کب برداشت ہو سکتی تھی اس کے یہاں جیسے دیانات مذہب کا جزو اعظم ہے ویسے سیاسیات مذہب کا جزو اہم ہیں اور مذہب و سیاست کے الگ الگ کے کوئی معنی نہیں مذہب و سیاست کی یہ تفریق ایسی ہی غا

جیسا کہ آج مذہب اور سائنس کے بارہ میں کہا جاتا ہے کہ سائنس نے مذہبوں کی بنیادوں کو کمزور کر دیا ہے۔ اور یہ دونوں باہم جمع نہیں ہو سکتے حالانکہ سائنس انہی مذاہب کے ساتھ جمع نہیں ہو سکتا جنھوں نے تمدن کو مٹا کر رہبانیت دنیا میں قائم کی لیکن جو مذہب تمدنی حقوق تمدنی ضروریات وقت کے تقاضوں کے مناسب معاشرتی اقتصادی ضروریات کی تکمیل کا حامی ہو اُسے سائنس سے نقصان تو کیا پہنچتا سائنس اس کی ممد و معاون خادم ہے۔ ایسے ہی سیاست بھی دین کی خادم اور اس کا ایک جزو اہم ہے البتہ اس سیاست کے معنی سیاست عصریہ کے نہیں بلکہ سیاست شرعیہ کے ہیں جس کی بنیاد علم و اخلاق تقویٰ و طہارت اور فضائل اعمال پر ہے اور جو رذائل اخلاق و اعمال کو مٹانے کے لئے دنیا میں بھیجی گئی ہے نہ کہ ان کی تقویت کے لئے اور بالفاظ دیگر سیاست نبوت مراد ہے سیاست ملوکیت نہیں یہ سیاست مذہب کا جزو اعظم ہے جس سے کسی حال قطع نظر نہیں کی جا سکتی ہاں مگر اسی کے ساتھ یہ بھی واضح رہے کہ ان دونوں میں دیانت اصل اور مقصود بالذات ہے اور سیاست اس کے بقاء و استحکام کا ذریعہ اور وسیلہ ہے یہی وجہ ہے کہ ہزارہا انبیاء علیہم السلام کے سلسلہ میں دیانات کے ابواب تو سب کو دئے گئے مگر سیاسیات اور جہاد کی مشروعیت بعض کے لئے ہوئی اور بعض کے لئے نہیں۔ اگر ایک ہی درجے کے دونوں مقاصد ہوتے تو یہ تفریق ناممکن تھی۔ اسی طرح جن اقوام کو دیانت اور سیاست دونوں دی گئیں جیسے بنی اسرائیل تو ہاں بھی اتنی تفریق

عموماً دیکھی جاتی ہے کہ انبیاء کا سلسلہ الگ ہے اور سلاطین کا الگ۔ شاذونادر ہی ایک آدھ جگہ جمع ہوا ہے۔ مگر مقصودیت دیانات کی شان وہاں بھی نمایاں رکھی گئی کہ دیانات کا حکم نبی کی طرف سے ہوتا تھا اور اس کی تنفیذ سلاطین اور امراء عدل کے ہاتھ سے۔ ہاں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم میں یہ دونوں شانیں لاکر جمع کر دی گئیں۔ آپ بیک وقت خلیفۃ اللہ فی الارض بھی تھے اور مربی دین عالم بھی تھے۔ مگر اصل دین تھا جو آپ کی سلطنت کا محور و مرکز رہا۔ یعنے آپ کی ساری اسلامی سیاست دین کے محور پر گھومتی تھی اور صرف اس لئے تھی کہ اس کی قوت سے اوامر دین نفاذ پذیر ہوتے رہیں اور اجراء و ترویج دین میں کوئی رکاوٹ نہ ہونے پائے جس سے دیانت کا مقصود بالذات ہونا اور سیاست کا اس کے حق میں وسیلہ ہونا صاف و اضح ہوتا ہے۔ چنانچہ قرآن نے اس کی تصریح کی ہے :-

الذین ان مکنھم فی الارض اقاموا الصلوٰۃ واتوا الزکوٰۃ وامروا بالمعروف ونھوا عن المنکر وللہ عاقبۃ الامور ۝

یہ لوگ ایسے ہیں کہ اگر ہم ان کو دنیا میں حکومت دیدیں تو یہ لوگ نماز کی پابندی کریں اور زکوٰۃ دیں اور نیک کاموں کے کرنے کا آرڈر دیں اور برے کاموں سے منع کریں اور سب کاموں کا انجام تو خدا ہی کے اختیار

میں ہے۔

یہاں تمکین فی الارض یعنے سلطنت کی غرض و غایت دیانات کے شعبوں کو قرار دیا گیا ہے جس سے سلطنت کا ان امور کے حق میں وسیلہ ہونا ظاہر ہوتا ہے جس کا راز یہ ہے کہ انبیاء کا مقصد دنیا میں امانت کا پھیلانا ہے جو ایمان اور امن کی زمین ہے اور جسے انسان کے سوا کائنات ارض و سماء کے کسی بڑے سے بڑے جزو نے بھی قبول کرنے سے کانوں پر ہاتھ دھر لیا تھا اس امانت کی ضد فتنہ ہے جو اس کے حق میں سدراہ ہوتا ہے۔ یہ فتنہ کبھی علم کی راہ سے آتا ہے اور کبھی عمل کی۔ علمی فتنہ کا نام فتنۂ شبہات ہے اور عملی فتنہ کا نام فتنۂ شہوات ہے اور ظاہر ہے کہ فتنۂ شبہات جب کہ علم نافع میں مخل ہے تو وہ جہل کی قسم سے ہوگا۔ اور فتنۂ شہوات جب کہ عمل صالح میں مخل ہے تو وہ از قسم ظلم ہوگا۔ اس لئے فتنہ مجموعۂ ظلم و جہل ہے اور امانت مجموعۂ علم و اخلاق۔ انبیاء کا مقصد چونکہ امانت پھیلانا ہے جس کی راہ میں یہ فتنہ خلل انداز ہوتا تھا تو اس کا دفعیہ ضروری سمجھا گیا۔ اور یہ فتنہ یعنے ظلم و جہل جب کہ انسان میں جبلی تھا تو جبلت کا بدل دینا اور لوگوں کے خلاف شبہات و شہوات سے انھیں نکالنا کوئی آسان کام نہ تھا کہ بغیر طاقت کے محض وعظ و پند سے پورا ہو جا[تا] اس لئے سیاسی قوت کی ضرورت پڑی پس سیاسی طاقت دیانات کے مستحکم کرنے اور ان میں علم و اخلاق بنوت پیدا کرنے کا ایک آلہ اور ذریعہ ہوا تاکہ خلق خدا امن و سکون کے ساتھ اس علم خلق سے اپنے مقاصد زندگی یعنے طاعت و عبادت الٰہی کے فرائض انجام

دبتی رہے۔

اسلامی سیاست اور عصری سیاست کا فرق

اس کا لازمی نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ اسلامی سیاست اور مسلمانوں کی کسی سیاسی جدوجہد کا مقصد وہ نہیں ہوسکتا جو آج کی عصری سیاستوں میں پیش نظر رکھا جاتا ہے جس کا تمام تر خلاصہ صرف تین چیزیں ہوتی ہیں زمین، زر اور ذاتی اقتدار۔ آج کے سیاسی اور جنگی اقدامات کی آخری منزل اور حقوق طلبی کا آخری معیار اس کے سوا کچھ نہیں کہ فلاں فلاں خطہ جغرافیائی حیثیت سے چونکہ فلاں ملک یا قوم کا حق ہے لہذا اُسے ملنا چاہیئے۔ یا فلاں فلاں رقبہ میں فلاں اقوام کا تجارتی نظام قومی یا نسلی یا وطنی حقوق کے ماتحت قائم ہونا چاہیئے۔ یا فلاں ریاست پر فلاں شہنشاہی کا اقتدار یا انتداب قائم ہونا چاہیئے ورنہ پھر جنگ ہے۔ ظاہر ہے کہ پہلی صورت میں زمین دوسری میں زر۔ اور تیسری میں ایک قوم کا ذاتی اقتدار نکلتا ہے جسے جنگ کے لئے وجہ جواز اور کافی حجت سمجھ لیا جاتا ہے آج دنیا کی دو ثلث آبادی انہی تین وجوہ جواز سے کٹ مرنے اور سر پھٹول کے عذاب میں مبتلا ہے۔

اسلامی نظام حکومت اور اسباب جنگ

اسلام کے نقطۂ نظر سے یہ وجوہ جواز جنگ کی نہیں بلکہ حرمت جنگ کی ہیں کہ وہاں جنگ یا آویزش کسی خطۂ زمین کسی تجارتی مفاد یا کسی انسانی اقتدار کے لئے ہو ہی نہیں سکتی یہ اغراض اس کے نزدیک نہایت خسیس اور دنی ہیں اس لئے

نزدیک زمین یا سرمایہ یا انسانی اقتدار کسی قوم اور کسی قبیلہ کا حق نہیں کہ اس پر ہجوم کرنے کا اسے حق ہو۔ زمین کے بارے میں ارشاد ربانی ہے

ان الارض للہ یورثھا من یشاء

بلاشبہ زمین خدا کی ہے جسے چاہے زمین کا وارث بنائے۔

یہاں زمین کی ملکیت اللہ کے لئے ثابت کی ہے انسان کے لئے نہیں وہ صرف بقدر وراثت حصہ پا سکتا ہے۔ ایک جگہ ارشاد ہے

انی جاعل فی الارض خلیفۃ

میں زمین میں اپنا نائب بنانے والا ہوں

یہاں انسان کے لئے خلافت ارضی ثابت کی گئی ہے نہ کہ ملکیت ارضی یعنی مالک الملک خدا ہے اور یہ اس کی طرف سے نائب ہے اس کی طرف سے زمین میں تصرف کر سکتا ہے ذاتی طور پر نہیں۔ مال کے بارے میں فرمایا گیا۔

واتوھم من مال اللہ الذی اتاکم

اور لوگوں کو اللہ کے اس مال میں سے دو جو اس نے تم کو دیا ہے۔

یہاں سارے مال کو خدا کی ملک بتلایا گیا ہے جس کے حق میں انسان امین اور وکیل ہے اور اس کی اجازت اور اباحت سے اپنے اور اپنے متعلقین پر خرچ کر سکتا ہے۔ ذاتی جہات سے نہیں ایک جگہ فرمایا

وانفقوا مما رزقناکم

اور خرچ کرو اس مال میں سے جو ہم نے تم کو دیا ہے۔
یہاں رازقیت اللہ کے لئے ثابت کی گئی ہے جو اس کی مالکیت کی دلیل ہے اور انسان منفق اور محض خرچ کنندہ کہا گیا ہے جو اس کے صرف خزانچی ہونے کی دلیل ہے۔

حکومت الٰہی اسی طرح حکومت و اقتدار اور انتداب کے بارہ میں فرمایا گیا کہ :۔

ان الحکم الا للہ ہ

حکم کا منصب سوائے خدا کے کسی کو نہیں۔
اس سے ایک خدا کی حاکمیت ثابت ہو کر ہر غیر اللہ کی حکمرانی منفی ہو جاتی ہے۔

وما کان لمومن ولا مومنة اذا قضی اللہ ورسولہ امرا ان یکون لھم الخیرة من امرھم ومن یعص اللہ ورسولہ فقد ضل ضلالا مبینا ہ

اور کسی ایمان دار مرد اور کسی ایماندار عورت کو گنجائش نہیں جبکہ اللہ اور اس کا رسول کسی کام کا حکم دیدیں کہ ان کو اس کام میں کوئی اختیار رہے اور جو شخص اللہ اور اس کے رسول کا کہنا نہ مانے گا وہ صریح گمراہی میں پڑا۔

اس میں آمریت صرف اللہ کے لئے مخصوص کر کے انسان سے نہ صرف آمریت کی نفی ہی کر دی گئی ہے بلکہ او امر الٰہی کے بعد بندہ

کے چون وچرا اور کم وکیف کی گنجائش بھی سلب کر لی گئی ہے۔ یعنے امر الٰہی کا ماننا تو بجائے خود ہے اس میں تامل کرنا بھی عصیان اور کھلی گمراہی بتایا گیا ہے۔ قرآن کے ان تینوں مقامات سے واضح ہے کہ مالکیت آمریت اور اقتدار اور حکومت صرف خدا کے لئے ہے ساری زمین اور سرمایہ صرف اسی کے حیطۂ ملکیت میں آیا ہوا ہے۔ اس تعلیم کے بعد کسی مسلم قوم کو جو اس فطری تعلیم سے آشنا ہو ان اغراض کے لئے کسی سیاسی جد وجہد یا کسی جنگی اقدام کا حق نہیں پہنچتا ہاں وہ اگر کسی زمین کا قصد کریں گے یا کسی قوم پر ہجوم کرینگے تو اپنے لئے نہیں بلکہ خدا کے لئے۔

الحکومت والجہاد

چنانچہ قرون اُولیٰ کے جنگی اقدامات کی وجہ جوازیہ یاد داشتیں نہ تھیں کہ فلاں خطہ جغرافیائی حیثیت سے عرب میں شامل ہونا چاہئے یا عرب ابتداً کسی رقبہ پر ضروری ہے یا عرب تجارت کے لئے فلاں دریا کا کنارا اس کے لئے مخصوص ہونا چاہیئے ورنہ اعلان جنگ ہے بلکہ کسی رقبہ زمین پر وجہ جواز جنگ کے لئے تین چیزیں پیش کی جاتی تھیں یا خدا کا دین قبول کر لو یعنے اسلام میں داخل ہو جاؤ جو مجموعۂ دیانت وسیاست اور چشمۂ علم واخلاق ہے۔ یہ نہیں تو خدا کے دین کی شوکت قبول کر لو اور اپنے مذہب پر قائم رہتے ہوئے قانون الٰہی کے اقتدار کے نیچے آجاؤ۔ اور یہ اقوام پر اس لئے شاق بھی نہیں ہو سکتا تھا کہ غیر اسلام میں کہیں مذہب وسلطنت ایک چیز نہیں۔ یہ بھی نہ ہو تو خدائی اصول پر کوئی شریفانہ معاہدہ کر لو اور اپنے ملک میں آباد رہو ان میں سے

کوئی بات بھی قبول نہ ہو تو یہ ادا امر الٰہی سے کھلی بغاوت اور اعلان جنگ ہے اور خدا کے باغی کے لئے نا تبان خداوندی کے پاس کوئی رعایت یا جان و مال کی حفاظت کی کوئی ادائی ضمانت نہیں

اسلامی جہاد کی غرض و غایت

پس اسلامی جہاد اور اسلامی سیاست یا اس کے کسی سیاسی اقدام کی غرض و غایت زمین و سرمایہ یا اقتصادی نظام وغیرہ تو کیا ہونا دو مسلمانوں کی اپنی حکومت قائم کرنا بھی نہیں ہو سکتا۔ بلکہ اشاعت دین اور محض خدا کی حکمرانی دنیا سے منوا تا اس کے کلمہ کو اونچا کرنا اور صرف اسی کے مستند قانون کو دنیا میں پھیلانا اور اقوام کی صفوف میں نظام ملت کی شوکت قائم رکھنا ہے۔

لتكون كلمة الله العلياء

آپ اندازہ کریں کہ ان مقدس اور ہمہ گیر مقاصد اشاعت دین الٰہی۔ اقامت حکومت الٰہی حفاظت نظام الٰہی سے دنیا کی کونسی دانشمند قوم اعراض کر سکتی ہے؟ کہ اس میں کسی قوم کے اپنے اقتدار یا مفاد کا سوال ہی نہیں بلکہ صرف اقتدار خداوندی اساس مقاصد ہے گریز اگر ہو سکتا ہے تو کسی قوم کو کسی قوم کے ذاتی اقتدار کے تحت میں آنے سے ہو سکتا ہے۔

اور ہونا چاہیئے جبکہ انسان انسان اقوام اقوام سب برابر ہیں تو کوئی وجہ نہیں کہ ایک قوم دوسری قوم پر خواہ مخواہ اپنا اقتدار قائم کرنے۔ یا اسے غلام بنانے کے منصوبے گانٹھے لیکن ایک قوم اپنے اقتدار کا نہیں بلکہ انکسار کا اعلان کر کے یہ واضح کرے

کہ وہ ذاتی اغراض یا مفاد کی خاطر مصروف جنگ ہونا نہیں چاہتی
بلکہ صرف اس لیئے کہ خدا کا صحیح اور مستند علم اور خدا کے پاکیزہ
اخلاق سے دنیا آشنا ہو اسے ملک گیری اور طمع جاہ و مال سے
کوئی علاقہ نہیں بلکہ وہ ہزار ملک فتح کر کے بھی اپنی ذوات کے حق میں
درویش اور سادہ حال رہنا چاہتی ہے۔ اس کا جنگی مقصد ہوس زر
وجواہر نہیں بلکہ زہد وقناعت سے دنیا کو ہم کنار کرنا ہے۔ اس کا
مقصد خود وہ نہیں بلکہ اس کا خدا ہے تو یہاں کسی کے ذاتی یا قومی
اقتدار کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ کسی قوم کو اس جنگی اقدام کے
حق بجانب سمجھنے میں ذرا سا بھی شبہ دامن گیر ہو۔ پس بندوں کی حکومت
بندوں پر تو موجب نزاع وفساد بن سکتی ہے لیکن خدا کی حکومت
بندوں پر تو جب ہی وجہ نزاع بن سکتی ہے جب خدا ہی کے ماننے سے
انکار کر دیا جائے۔

ایک لمحۂ غور و فکر

اس لیئے آج بھی اگر مسلمان اپنی قومی حکومت
قومی اقتدار یا کسی خاص خطۂ زمین پر مخصوص
انتداب یا سرمایہ اور اقتصادی نظام یا کسی خاص وطن کا جغرافیائی
سوال لے کر کھڑے ہوں گے تو قطع نظر اس سے کہ یہ مقاصد اسلامی
مقاصد نہ ہوں گے وہ کسی معقول طریقہ پر ان سوالات کو کسی سے
منوا بھی نہیں سکتے اور نہ کسی وجدان صحیح کی روشنی میں خود ہی اپنا اطمینان
حاصل کر سکتے ہیں بہر حال کامیابی اور ناکامی تو خدا کے ہاتھ میں ہے
لیکن نصب العین اور نظریہ اگر صحیح اور موجب اطمینان وتسلی ہو تو ہر
اقدام پُر کیف اور پُر سکون ہو جاتا ہے اور خود مطمئن ہو کر آدمی دوسروں

کو بھی مطمئن کر سکتا ہے۔ اس لئے اگر ہم اپنا نصب العین وہی قائم کر کے جو قرونِ اول کا تھا یعنے قانون الٰہی کی ترویج اور اقتدار حق کی اشاعت اعزاز نظام دین جن کا خلاصہ وہی تین امور نکلتے ہیں تعلیم احکام تہذیب اخلاق اور تنظیم اعمال یعنے اتباع اسوۂ حسنہ تو ہمارے ہر دعوے میں معنی پیدا ہو جائیں گے اور ہمارا ہر اقدام ذاتی مفاد کی تہمت سے پاک ہو کر دنیا کے نزدیک قابلِ قبول بھی ہو جائے گا۔ نیز کامیابی کی منزل بھی قریب تر آ جائے گی۔

خلافتِ راشدہ کے بعد

میں جہاں تک سمجھتا ہوں قرونِ خیر کے بعد اسلام کی بارہ سو سالہ عمر میں جس قدر بھی قومی انحطاط و تنزل یا اقدامات میں جس قدر بھی ناکامی کے آثار کبھی نمایاں ہوئے ہیں ان کا بنیادی سبب اکثر و بیشتر انہی تین اساسی چیزوں کی قلت یا قوم کے مزاج کا ان تینوں عنصروں کی آمیزش سے خالی رہ جانا یعنے فقدان جامعیت ہوا ہے یعنی ناکامی یا علم کی قلت سے یا اخلاق کی کمزوری سے یا نظام کی ابتری سے پیدا ہوئی ہے۔

چنانچہ خلافت راشدہ اور اس کے تتمہ یعنے عمر بن عبد العزیزؒ کے بعد (جو ان تینوں عناصر کی جامعیت کا مکمل نقشہ اور طوفانی فتوحات کا حقیقی دور تھا) مسلمانوں کے تنزل کے سلسلہ میں اول فتوحات رکیں پھر ملک ہاتھ سے نکلنے شروع ہوئے پھر اندرونی کمزوریاں ابھر کر نظم میں ابتری پھیلی اور پھر انجام کار پستی اور زبردستی کے ایام آنے لگے یہ محض اسی لئے کہ مسلمانوں کے سامنے منزل مقصود نہ رہی یا رہی تو راہِ مقصود نامعلوم رہی یا راہ بھی معلوم رہی تو اس پر چلنے

کی اخلاقی طاقت باقی نہ رہی اور یا وہ کبھی رہی تو کوئی چلانے والا مرکز اور امام نہ ہوا جو اپنے علم و خلق سے اسی مقررہ نظام پر انہیں لے چلے اور اگر کوئی ایسا فرد بھی ہوا تو گروہی تعصب نے اس کی پیروی کی اجازت نہ دی۔ غرض اِن تینوں عنصروں علمی قوت اخلاقی قوت اور انتظامی قوت کا زوال ان نتائج بد کا موجب بنتا رہا ہے۔

اقامت حکومت الٰہی ظاہر ہے کہ ہر ایک نصب العین میں رائیں دو ہو سکتی ہیں لیکن اس نصب العین میں ایک کے سوا دوسری رائے کی گنجائش نہیں کہ ہم سب کا حاکم و بادشاہ خدا ہے پس نظریہ سے اختلاف وہی کرسکتا ہے جو سرے سے خدا کے وجود ہی کا منکر ہو اس لیئے قومی اتحاد کے پروگرام کا جامع نقطہ اس کے سوا دوسرا نہیں ہو سکتا۔ یہی وجہ تھی کہ اسلام نے سب سے پہلے اللہ کی ذات واحد کو بطور مرکز قلوب پیش کیا تاکہ تمام قلوب سب سے کٹ کر اس ایک مرکز پر جمع ہو جائیں کہ توحید سب سے بڑا مرکز اتحاد ہے۔ آج کے اختلافات درحقیقت توحید اعتقادی یا توحید عملی ہی کی کمزوری سے پیدا ہوئے ہیں۔ اگر ہر عمل میں انسان سب سے بیگانہ بن کر صرف ایک خدا کے لیئے اپنا مرنا اور جینا متعین کرلے تو وہ سب سے متحد ہو جائے گا اور سب اس سے متحد بن جائیں گے۔ ورنہ جس حد تک شرک آتا جائے گا اسی حد تک انسانوں میں پراگندگی بڑھتی رہیگی کیونکہ مرکز قلوب واحد نہ رہے گا اس لیئے اسی کی واحد ذات اسی

کے واحد کلام اسی کے واحد کعبہ اسی کے واحد رسول کی طرف تمام امت کو علمی اعتقادی اور عملی دعوت دی گئی ہے تاکہ دلوں پر اور پھر دلوں سے باہر پورے عالم بشریہ پر ایک اللہ کی حکومت قائم ہو جائے پس پورے دل و دماغ سے ذات الٰہی پر جماؤ حکومت الٰہی کا پہلا قدم ہوگا کہ جس کے بغیر اقامت حکومت الٰہی کا دعویٰ محض زبانی دعویٰ ہوگا جس کی کوئی اصلیت نہ ہوگی۔ پھر قانون الٰہی (کتاب اللہ) کی پیروی اور اخلاق الٰہی سے متعلق ہو کر اس قانون پر چلنا اور اسے چلانا حکومت الٰہی کا دوسرا قدم ہے کیونکہ جب تک بادشاہ کے اقتدار اور قانون کا علم نہ ہو اس کی حکومت پوری طرح دلوں پر متسلط نہیں ہو سکتی اور نہ ہر شعبۂ زندگی میں وہ مشعل راہ ہی بنایا جا سکتا ہے اسی کے ساتھ پھر اپنی خصومات اور منازعات میں اسی کو حکم بنانا حکومت الٰہی کا تیسرا قدم ہے جس کی شکل یہ ہے کہ ہر محلہ میں غیر رسمی طور پر اسلامی عدالت قائم ہو ایک مستند عالم جو فقہ اسلامی کا ماہر ہو ہمارے روزمرہ کے نزاعات میں فیصلہ کرے۔ اس تحکیم سے جب کہ ہم نے مالک الملک کو حکم بنا دیا ہو آپ اندازہ کریں کہ فیصلہ کس قدر اطمینان بخش اور کتنا سہل اور مالی مصارف اور کچہریوں کی یاد وڑی سے کس درجہ پاک ہوگا؟ اہم مسائل کے لئے جو قوت کے بغیر طے نہ ہو سکیں گورنمنٹ سے محکمہ قضا کا مطالبہ کیا جا سکتا ہے جس کے لئے متحدہ سعی کی ضرورت ہے یہ حکومت الٰہی کا چوتھا قدم ہے۔

حکومت الٰہی اور قانون الٰہی | کیا یہ ہمارا فرض نہیں ہے" جبکہ

ہم حکومتِ الٰہی کے مدعی ہوں کہ ہم قانونِ الٰہی کو جو حکومتِ الٰہی کا مظہر اتم ہے نماز روزے سے زیادہ نکاح و طلاق تک محدود نہ رکھیں بلکہ اپنے گھر بار جائداد و املاک اور عام معاشرتی و اخلاقی معاملوں میں بھی اسی مقدس قانون کو مشعل راہ بنائیں۔ اور اس کے بالمقابل رواج کی جہالتوں میں نہ پھنسے رہیں۔ اگر حکومت الٰہی کے ادعا کے بعد بھی ہم اپنی طرف سے طوع و رغبت رواج پسندی اور شرعی قانو سے لاپروائی قائم رکھیں تو کوئی وجہ نہیں کہ اس کا نام قانونِ الٰہی سے بغاوت نہ رکھا جائے؟ پس ایسی صورت میں جبکہ ایک قوم خود اپنے بادشاہ کے قانون سے منحرف اور بغاوت میں ملوث ہو وہ حکومت الٰہی کے عنوان کی دعوے دار کس منہ سے ہوسکتی ہے۔

حکومت الٰہی کے سلسلہ میں یہ چار ابتدائی قدم ہیں ان کے ذریعہ عمل کا نقش قدم قائم ہوکر آئندہ دوسرے قدم بھی اس سلسلہ میں اٹھائے جاسکتے ہیں جس سے شعائر اللہ کی عظمت کا دنیا میں سکہ رواں ہو۔ مگر ہر سخن نکتہ و ہر نکتہ مکانے دارد۔

ہندوستان میں اسلامی حکومت کا زوال۔

تفصیلات کا موقع نہیں لیکن اصولی طور پر اب اس کے ماننے میں کوئی تامل نہ ہونا چاہیے کہ ہندوستان کی باگ ڈور بھی مسلمانوں کے ہاتھ سے انہی تین عناصر کے زوال سے نکلنی شروع ہوئی۔ عالمگیری دور اور فتویٰ عالمگیری کے فقہی نظام کے بعد بتدریج ان تین بنیادوں میں نقصان آیا تو رفتہ رفتہ اس ملک پر مسلمانوں کی گرفت ڈھیلی ہونی شروع ہوئی اور

اٹھارہویں صدی عیسوی میں ملک کی جہالت ناتربیتی اور بدنظمی کے سبب بالآخر یہ ملک کلیۃً ہاتھ سے نکل گیا۔

۱۸۳۱ء ۱۲۴۶ھ میں اللہ کے چند مخلص بندے حضرت سید صاحب شہیدؒ بریلوی اور حضرت مولانا محمد اسمٰعیل صاحب شہید رحمۃ اللہ کی قیادت میں اٹھے، بڑھے اور شہید بھی ہو گئے۔ مگر تمام قوم کی لاعلمی اور ناتربیتی ناکامی کا باعث ہوئی اور اپنے ہی اجزاء ذریعۂ شکست بن گئے۔

۱۸۵۷ء میں پھر ایک جد و جہد ہوئی حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی رحمۃ اللہ بانی دارالعلوم دیوبند حضرت مولانا گنگوہیؒ اپنے شیخ حضرت اقدس حاجی امداد اللہ صاحبؒ کی قیادت میں اٹھے اور فتوحات کی لائن پر بڑھے بھی گئے۔ مگر وہی قوم کی بے بصیرتی ناتجربہ کاری اور ناتیاری سامنے آئی۔ ملک تعلیم و تربیت سے بیگانہ ہو چکا تھا۔ اس لئے نتیجہ صفر کے درجہ میں رہا۔

۱۹۳۹ھ میں حضرت اقدس مولانا شیخ الہندؒ کھلکر میدان تحریکات میں آئے قوم کی طرف سے جوش بلا استقبال ہوا عظمت رفتہ کی بازیافت کے لیئے تبعیتی تڑپ کے ساتھ قوم اُٹھ کھڑی ہوئی مگر تعلیم و تہذیب اخلاق کی قلت نے نتیجہ پھر پردۂ عدم ہی میں مستور رکھا اور فتن و مصائب بڑھتے ہی گئے اور آج جبکہ قدرتی انقلابات ماتحت اقوام کی قسمتوں کے فیصلے ہو رہے ہیں کوئی قوم اُبھر رہی ہے اور کوئی گر رہی ہے مسلمانوں کی اکثریت علم و اخلاق اور نظم سے اتنی ہی دور ہے جس قدر کہ سو برس پہلے تھی۔

اس سے انکار نہیں کہ جذبات و عواطف اور میلانات میں

تغیر ضرور ہو رہا ہے رفتار زمانہ نے انھیں جھنجھوڑ کر کچھ بیدار بھی کر دیا ہے اور خواب غفلت چھوڑ کر بیداری کی طرف آ بھی رہے ہیں لیکن محض نیند سے جاگ اٹھنا تو کافی نہیں ہو سکتا جب تک کہ اٹھ کر منزل مقصود کا راستہ نہ پکڑا جائے اور گامزنی نہ شروع کر دی جائے۔ اس لئے ضرورت ہے کہ تعمیری رنگ میں انھیں عرض کردہ تین بنیادوں کو جو قرن اول کا اصلاحی پروگرام ہے مضبوطی سے پھر سنبھالا جائے یعنے تعلیم کتاب، تہذیب اخلاق، تعمیل اسوۂ حسنہ جس کو ذرا اور عام عنوانات سے یوں بھی ادا کیا جاسکتا ہے، اشاعت دین الٰہی، اقامت حکومت الٰہی، تنظیم حیات انسانی۔

مولانا محمد طیب صاحب کے خطبے پر اک نظر

مولانا نے اپنے خطبے کے ایک حصے میں دیانت وسیاست سے گفتگو کی ہے اور فرمایا ہے کہ "ہزارہا انبیاء علیہم السلام کے سلسلے میں دیانات کے ابواب تو سب کو دئے گئے مگر سیاست اور جہاد کی مشروعیت بعض کے لئے ہوئی اور بعض کے لئے نہیں"

مولانا کے ان الفاظ سے اس بارے میں کوئی شبہ نہ ہونا چاہیے کہ تمام انبیائے کرام کا مقصد بعثت دنیا میں خدائی قوانین حیات کا اجراء و نفاذ تھا۔ جو انبیاء سیاسی طاقت نہ رکھتے تھے ان کے بارے میں مولانا خود فرماتے ہیں کہ دیانات کا حکم نبی کی طرف سے ہوتا تھا اور اس کی تنفیذ سلاطین اور امراء عدل کے ہاتھ

ہے، ہاں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم میں یہ دونوں شانیں لاکر جمع کر دی گئیں۔ آپ بہ یک وقت خلیفۃ اللہ فی الارض بھی تھے اور مربیِ دینِ عالم بھی مگر اصل دین تھا جو آپ کی سلطنت کا محور و مرکز رہا۔

عالمِ اسلام پر مدتِ مدید سے جو حالت طاری ہے اور مسلمان جس طرح کی زندگی گزار رہے ہیں اس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ دین و سیاست کی تفریق کچھ اس طرح جزو فکر و نظر ہو گئی ہے کہ وہ دور کرنے پر بھی دور نہیں ہوتی اور اس کا نتیجہ یہ ہے کہ بات کے سلجھانے اور مسئلے کو روشن کرنے کی سعی بھی بات کے الجھانے اور مسئلے کے دھندلا کرنے کا سبب بن جاتی ہے۔ مولانا کے خطبے کا یہ حصہ بھی مجھے کچھ ایسا ہی معلوم ہوتا ہے، اچھا اللہ کی خلافتِ ارضی اور دینِ عالم کی مربیت الگ الگ دو چیزیں سہی، اور دونوں میں فرقِ مراتب سہی، لیکن حضرت رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ اقدس دونوں کی جامع تھی اور امتِ مسلمہ حضور کی اتباع پر مامور ہے لہٰذا اسے بھی ان دو چیزوں کا جامع ہونا چاہئے، آپ پوری انسانی زندگی کو دین کہئے یا اس کے حصّے بخرے کیجئے نتیجہ ایک ہی برآمد ہوگا، اللہ کی پوری کتاب اور اللہ کے رسول کی پوری سنت دین ہے اور حضور نے دین کو غالب کیا تھا مسلمانوں پر بھی دین کا غالب کرنا واجب ہے۔

میں درخواست کروں گا کہ انبیائے کرام کا پیغام کیا تھا اور ان کی بعثت کی غایت کیا تھی، اس کو ایک بار پھر

حضرت مولانا حمید الدین فراہی رحمتہ اللہ علیہ کے افادات میں ملاحظہ کریجئے ۔

ایک مقام پر مولانا طیب صاحب نے حکومتِ الٰہیہ کے قیام کی جانب اقدام کی منزلیں بتاتے ہوئے چوتھا قدم اُسے قرار دیا ہے کہ گورنمنٹ سے محکمۂ قضاء کا مطالبہ کیا جائے ۔

یہ مولانا کی ذاتی رائے ہے، اللہ و رسول کا حکم نہیں ۔ مولانا کی اس رائے کے ساتھ اللہ و رسول کی کوئی سند نہیں ہے

علاوہ ازیں مولانا کے نزدیک بھی یہ آخری قدم نہیں اُنھوں نے فرمایا ہے کہ "حکومتِ الٰہیہ کے سلسلے میں یہ چار ابتدائی قدم ہیں ان کے ذریعے عمل کا نقش قدم قائم ہو کر آئندہ دوسرے قدم بھی اس سلسلے میں اٹھائے جا سکتے ہیں جس سے شعائر اللہ کی عظمت کا دنیا میں سکہ رواں ہو ۔ ہر سخنے نکتہ و ہر نکتہ مکانے دارد" ۔ خلاصہ یہ کہ مولانا نے حکومتِ الٰہیۃ کے نصب العین کے متعلق اللہ و رسول کی سند سے جو کچھ فرمایا ہے وہ مسلمانوں کے لئے بے چون و چرا قابلِ تسلیم ہے اور جہاں تک ان کی ذاتی رائے ہے اس کی حقیقت مولانا کے اس فقرے میں پوشیدہ ہے ۔

"مگر ہر سخن نکتہ و ہر نکتہ مکانے دارد"

آسمانی حکومت کی تصویر

حکومتِ الٰہی

عالَمِ انسانی میں فرمان فرمائی کا حق خالق اور پروردگار کے سوائے
کسی کو نہیں دیا جاسکتا

(از حضرت علّامہ غازی ابوالحامد محمد بن عبداللہ انصاری مدظلّہٗ مقیم کابل جلا وطن
از ہندوستان)

یہ مضمون اسی عنوان اور اسی نام سے ماہنامہ "قائد"
مراد آباد کے محرم شریف ۱۳۵۸ھ کے پرچے میں شائع ہوا ہے
"قائد" کے معاونین میں حضرت مولانا حسین احمدؒ حضرت
مولانا ابوالمحاسن محمد سجاد صاحب، حضرت مولانا معین الدین
اجمیری اور دوسرے اکابر جمعیۃ علمائے ہند اور بزرگان دار العلوم

دیو بند کے نام درج ہیں، اور رسالہ کا پورا ادارہ مرکزی اور یو پی کی جمعیتہ العلما سے تعلق رکھتا ہے "

"قائد" کے نصب العین اور حضرت علامہ محمد بن عبداللہ انصاری کی شخصیت کے متعلق "قائد" کے اس شمارے کے شذرات میں تحریر ہے۔

"ہندوستان میں محکمۂ قضاء کے قیام کے متعلق خیالات کو ہموار کرنا رسالہ کا سب سے پہلا مقصد تھا جو کسی وجہ سے ابتداءً شائع نہیں کیا گیا، مگر حضرت علامہ غازی مولانا محمد بن عبداللہ عرف منصور انصاری مدظلہم العالی (جو سیدنا شیخ الہند اولیٰ مولانا محمود الحسن صاحب قدس سرہٗ العزیز کی تحریک کے رکن رکین اور حضرت مولانا عبیداللہ صاحب سندھی کے دست راست تھے، جس کی پاداش میں وہ پچیس برس سے جلا وطن اہل و عیال سے دور کابل میں مہاجرانہ زندگی بسر کر رہے ہیں) کی مخصوص توجہات نے نظریہ میں بلندی پیدا کر دی۔ اور اب حکومت الٰہی یا آسمانی حکومت کی تبلیغ واشاعت رسالہ کا اہم مقصود ہو گیا "

اس مضمون یعنی آسمانی حکومت کی تصویر یا حکومت الٰہی کے متعلق ایڈیٹر نے یہ نوٹ لکھا ہے۔

"اصل کتاب فارسی میں ہے۔ خاکسار نے اصلاحی الفاظ اور کتاب کے مفہوم کو بجنسہ باقی رکھتے ہوئے سہولت کے لئے کسی فقرہ کے معنی میں ترتیب بدل دی ہے اور کہیں توضیح کے لئے

کوئی لفظ زیادہ کر دیا ہے ...."

اب علامہ غازی محمد بن عبداللہ صاحب انصاری کا مضمون ملاحظہ کیجئے۔

پہلا باب — قانون اور قانون سازی

تمہید (ا) قانون شریعت

تعریف افراد انسانی کے اختیارات کی حدبندی، ان کی جانوں اور ان کے مالوں میں حقوق کا مقرر کر دینا اور ان کے لئے فرمانبرداری اور اطاعت شعاری کے طریقے اور رسومات بنا دینا۔

(ب) حکومت، بادشاہی فرمان فرمائی۔
کسی قوم یا کسی ملک کے لئے ایسا قانون بنا دینا جس کی اطاعت لامحالہ کرنی پڑے۔

(ج) فرمانبرداری محکومی۔ تابعداری۔ یعنے (عبدیت) قوانین کو جاری ہونے دینا اُن کی پابندی کرنا۔

جو حکومتیں دنیا میں قائم ہیں ان کے اصلی اور فطری، یا جعلی اور غیر فطری ہونے کی پہچان یہ ہے کہ دیکھا جائے کہ جامعہ بشریت پر کسی انسان کو قابو یافتہ اور مطلق العنان غلبہ دیا جا رہا ہے یا نہیں۔ جو نظام حکومت کسی انسان یا انسانوں کی کسی جماعت کو انسانیت اور جامعہ بشریت پر تشریعی یعنے دستور سازی اور اصولی قانون بنانے کا حق دے وہ جعلی اور غیر فطری ہے

کیونکہ اصولی قانون بنانے کا حق اتنا بلند اقتدار ہے اور ایسا

اونچا تصرف ہے کہ مالک کے سوا کسی کے لئے بھی اس کا استعمال جائز نہیں، اب غور کرو کہ جامعہ بشریت کا مالک کون ہے تاکہ قانون سازی کا حق اس کے سپرد کر کے عالم انسانی کو زحمت سے نجات دلادیں۔

(د) جامعہ بشریت کا مالک، (دلیل عقلی)

انسان ایک حباب ہے نہ اس کا وجود اصلی نہ اس کا کوئی وصف اصلی، وہ دونوں میں کسی کا محتاج ہے۔

نور آفتاب کا زمین پر آنا جانا مثال ہے ہمارے وجود اور صفات کے آنے اور جانے کی، آفتاب کی طرح ہمارے وجود اور صفات کا مرکز کون ہے؟ وہی جس کو ہم خدا کہتے ہیں، یقیناً وہی مالک حقیقی ہے جامعہ بشریت کا۔ اور ہماری ملکیت ایک عرضی اور طفیلی ہے جو مالک اصلی کے مرکز ملک سے ہم تک پہنچی ہے، اسی طرح ہماری تمام صفتیں عقل، علم وغیرہ وغیرہ طفیلی ہیں۔

(کس قدر فریب خوردہ ہوگا ذرۂ بے مقدار اگر وہ اپنے وجود یا اپنی چمک دمک کو اصلی اور حقیقی کہنے لگے یہی مثال ہماری بھی ہے)

اب ہمارے سلسلۂ ملک میں حسب ذیل تقسیم آگئی۔

مالکیت اصلی، مالکیت عرضی، مالک اصلی، مالکِ عرضی، مملوک خاص، مملوک عام۔

اصلی مالکیت:۔ خدا، بالا و برتر کی مخصوص صفت ہے، کائنات کا مالک اصلی صرف وہی ہے۔

مالکیت عرضی:۔ انسان کی صفت ہے۔ اور انسان مالکِ عرضی یا مالکِ ظلی ہے۔

مملوک خاص :- وہ ہے جو صرف خداوند عز اسمہٗ کی اصلی مالکیت کے ماتحت ہو۔ اور صرف خدا ہی کی مملوک ہو۔ مملوک خاص صرف بشریت اور انسانیت ہے

جامعہ بشریت صرف خدا ہی کی ملک ہے کوئی اس کا ساجھی نہیں اور یہ بھی نہیں کہ انسان کی طفیلی اور عارضی ملک انسان کے سر پہ آپڑے اور انسان کو انسان کا مملوک کر دے۔ بشریت فطری طور پر انسان کی ملکیت سے آزاد ہے۔

مملوک عام :- وہ ہے کہ حقیقی مالک کی حقیقی ملکیت کے ساتھ عارضی مالک کا عارضی مملوک بھی ہو جائے۔ (گویا نور آفتاب کے سامنے ایک آئینہ ہو گیا) مملوک عام وہ تمام کائنات ہے جو انسان سے کم درجہ رکھتی ہو۔ مثلاً تمام جاندار، سارے نباتات، جمادات، معدنیات، عنصریات برق، دخان، اسٹیم وغیرہ وغیرہ ان تمام چیزوں پر حضرت حق جل مجدہ کی حقیقی ملکیت، کا نور پرتو فگن ہے۔ لہٰذا وہ خدائے بالا و برتر کی مملوک حقیقی ہیں مگر چونکہ اس نور ملکیت کے درمیان انسانی ملکیت کا عکسی آئینہ آگیا لہٰذا مجازی اور عارضی طور پر ان تمام چیزوں کو انسان کی ملک بھی کہا جاتا ہے اور اسی بنا پر اس کو "مملوک عام" کا لقب دیا گیا۔

مذکورہ بالا تقسیمات و تصریحات سے ثابت ہو گیا کہ جامعہ بشریت کے حقیقی اور اصلی مالک صرف حضرت حق جل مجدہٗ ہیں، جو خالق اور رب العالمین ہیں لہٰذا عالم انسانی میں فرمان فرمائی کا حق خالق اور پروردگار کے سوا کسی کو نہیں دیا جا سکتا

فلا تجعلوا للہ انداداً و انتم تعلمون (قرآن کریم)

جان بوجھ کر (نادان مت بنو) کہ خدا کے شریک
بنانے لگو۔

دلیل اجتماعی حریت مساوات۔ عدالت، یوروپین اقوام کے نزدیک آئینی دستور اور اجتماعی قوانین کے اصول ہیں۔ ان اصول کے پیش نظر بھی یہ دلیل واضح ہے۔

عالم انسانیت کا قانون ساز ایک کو قرار دے کر اس کے احکام کو انسانیت کے لئے قیود اور بندش قرار دیا جائے تو مساوات انسانی کا دعویٰ کافور ہو گیا۔ اگر کسی ایک منتخب یا غیر منتخب جماعت کو عالم بشری کا عام متصرف قرار دیا جائے۔ تب بھی

(خود کوزہ و خود کوزہ گر و خود گل کوزہ)

کیونکہ اپنے ہی جیسے انسانوں کی ایک جماعت کو اکثریت پر مالک بنا دینا۔ خواہ ان کے ووٹ اور ان کے انتخاب ہی سے ہو بہرحال حریت شکن ہے اور مساوات کو پامال کرنے والی، اور عدل و انصاف پر کاری ضرب لگانے والی۔

چنانچہ موجودہ حکومتوں کے نظام میں اقلیتوں کی مظلومیت اور اکثریت کی زیادتیوں سے اس نظام حکومت کا ظلم اور زیادتی ہونا۔ کسی دلیل کا محتاج نہیں۔ لہذا وظیفہ عقل اور فریضہ اجتماع ہے کہ قانون سازی یعنے عالم انسانیت پر مالکانہ تصرفات کے لئے کوئی مافوق الطبیعۃ ہستی تلاش کریں تاکہ اس کی فطری حکمرانی سے حکم اور بادشاہی کا عقد و حل اور تمام موجودات سے اعلیٰ اور فائق، تمام انسانوں کے خالق اور تمام کائنات کے مالک کی فرماں فرمائی کی برکت سے

عالمِ انسانی غیر فطری حکومتوں کے عذاب سے نجات پا کر دنیاوی فلاح اور اُخروی سعادت سے آشنا اور ہم کنار ہو۔

چونکہ ربُّ العٰلمین کی حاکمانہ برتری اور نوع بنی آدم میں اس کے مساوات پرور احکام کی برکت سے اجتماعی فسادات (یعنی ظلم عدمِ مساوات اور غیر انسانی قیود) نہیں پیدا ہوتے، بلکہ اس کی ربوبیت عامہ اور رحمانیت مطلقہ کے اصولی قوانین نیز مذکورہ بالا فسادات سے اس کی بے نیازی مذکورہ فسادات کو جڑ سے اکھاڑ پھینکتی ہے لہٰذا ہم خالقِ حقیقی کی بادشاہی کو اصلی بادشاہی کہتے ہیں اور اس کے ماسوا جمہوریت، پارلیمنٹری، یا شخصی قسم کی تمام حکومتوں کو غیر فطری اور جعلی حکومتیں قرار دیتے ہیں۔

سلطنتِ الٰہیہ

بادشاہ قانون صدرِ اعظم حدودِ سلطنت

حکم اور قانون سازی ایک ایسا مرتبہ ہے جو امامت سے بالا ہے اور خداوندِ عالم کا مخصوص حق ہے اور امامت امت کا وظیفہ ہے۔ ہمیں اسی سے بحث کرنی ہے مگر چونکہ امامت کی بحث اس وقت تک سمجھ میں نہیں آسکتی جب تک قانون سازی کا ایک نقشہ پیش کر دیا جائے لہٰذا پہلے ہم قانون سازی کے متعلق ایک مختصر نقشہ پیش کرتے ہیں اس کے بعد امامت کی تصویر پیش کریں گے

بادشاہ

مادہ (۱) بادشاہی (یعنی انسانی تصرفات کی حد بندی۔ عالمِ بشری کے ذمہ حقوق کا مقرر کرنا اور تابعداری کے مراسم اور طریقے

تجویز کرنا جن کو عبادت کہا جاتا ہے) اعلیٰ حضرت خالق عالم کا مخصوص حق ہے

مَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ ۚ محمد صرف پہنچانے والے ہیں۔

تَبَارَكَ الَّذِىْ نَزَّلَ الْفُرْقَانَ عَلٰى عَبْدِهٖ

"بابرکت ہے وہ ذات جس نے فرقان (یعنے ایسا قانون) اپنے فرمانبردار بندے پر نازل فرمایا (جو صاف صاف حق اور ناحق کا فیصلہ کرتا ہے)"

اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ ۔ حکم (قانون) صرف اللہ کا ہے۔

مَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَا اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ ۝

"جو خدا کے نازل کئے ہوئے قانون پر فیصلہ نہ دے وہ ظالم ہے"

مادہ (۲) صرف ذات خالق قدوس ہی اپنے تصرفات میں غیر مسئول ہے اور کسی کی یہ شان نہیں ہو سکتی۔

لَا يُسْئَلُ عَمَّا يَفْعَلُ وَهُمْ يُسْئَلُوْنَ

اس سے بازپرس نہیں کی جا سکتی ان سب (انسانوں) سے بازپرس کی جائے گی۔

قانون

مادہ (۳) ان احکام کے مجموعہ کو قانون کہا جاتا ہے جو خاتم الانبیا صلی اللہ علیہ وسلم نے پہنچائے۔

مَا اٰتٰكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ ۝

جو کچھ رسول تمھارے سامنے لائے ہیں اس کو لے لو۔
مادہ (۴) قانون کی زبان عربی ہے۔

انا انزلناہ حکما عربیا۔

ہم نے ایسا قانون نازل کیا جس کی زبان عربی ہے
قرآناً عربیاً۔ ایسا قرآن جس کی زبان عربی ہے

صدرِ اعظم

مادہ (۵) حضرت محمد مصطفی صلی اللہ علیہ وسلم قانون الٰہی کو پہنچانے اور اس کو جاری کرنے کے لئے خدا کی طرف سے منتخب اور مامور کئے گئے۔

انا ارسلناک شاھدا و مبشرا و نذیرا و داعیا الی اللہ۔

ہم نے آپ کو شاہد، مبشر، نذیر اور داعی بنا کر بھیجا ہے۔

بلغ ما انزل الیک۔

جو تم پر نازل ہوا اس کی تبلیغ کرتے رہو۔

یا ایھا النبی جاھد الکفار والمنافقین

اے نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) کفار اور منافقین سے جہاد کرو۔

بہر حال حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو داعی مبشر مبلغ قرار دیا گیا اور احکام الٰہی کو دنیا میں نافذ کرنے کے لئے کفار اور منافقین سے جہاد کا حکم ہوا۔ یہی شان ہوتی ہے صدرِ اعظم کی۔

حدودِ سلطنت

مادہ (۶) حقوق کے لحاظ سے سلطنت الٰہی کی حد بندی حدِ امکان سے خارج ہے کیونکہ وہ ہر چیز کا خالق ہے۔

خَالق کُلّ شیٔ ٥ وہ ہر چیز کا خالق ہے۔

رَبّ العالمین ٥ تمام جہانوں کا پیدا کرنیوالا ہے۔

لہ ملک السمٰوٰت والارض ٥

آسمانوں اور زمین کا ملک اسی کا ہے۔

باب التنفیذ ——— اجراء قانون

توضیح پہلے عرض کیا گیا کہ بادشاہ اسلام مَافَوقُ الطّبیعتہ ہستی ہے جو خالق کائنات ہے (تعالیٰ شانہٗ) اسکے فرامین قانون ہیں اور اس قانون کے جاری کرنے کی خدمت رسالت مآب رحمتہ اللعٰلمین صلی اللہ علیہ وسلم کے سپرد ہوئی تھی۔

امامت امت ختمی مآب رسالت پناہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی وفات کے وقت اجراء قانون کا فریضہ امت اسلامیہ کے سپرد کر دیا گیا (چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی شخص کو نامزد نہیں فرمایا)

امت مرحومہ اپنے میں سے اہل حل وعقد کو منتخب کر کے یہ خدمت ان کے سپرد کر دیتی ہے (چنانچہ سقیفہ بنو ساعدہ میں صحابہ کرام کا اجتماع ہوتا ہے) اہل حل وعقد اور مدبرین امت اپنے افراد میں سے جس کو سب سے بہتر پاتے ہیں آزادانہ انتخاب کے ذریعہ سے اپنی رہنمائی کے لئے منتخب کر لیتے ہیں اہل حل وعقد کو "شوریٰ" کہا گیا ان کے انتخاب کردہ رہنما کو "امام"۔ اور پھر "امام مع شوریٰ" (موجودہ

اصطلاح میں " امام با جلاس شوریٰ" کا نام " امارت المومنین " خلافتِ رسول رب العالمین " " امامتِ امت " اور قرآنی زبان میں " اولوالامر " کہا جاتا ہے۔

امام کی حیثیت خالق عالم (حضرت حق جل مجدہ) کی بادشاہی کا خادم اور زیر دست حضرت حق جل مجدہ کے صدر اعظم کا وکیل اور قوانین الٰہی کے اجراء کا ذمہ دار ہے یعنے (امت کا قائم مقام اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا خلیفہ)

چنانچہ امام کا ہاتھ قانون سازی اور حکمرانی کے دامن تک نہیں پہنچ سکتا۔ اس کے اقتدار کا آغاز صرف اسی سے ہے کہ اعلیٰ حضرت باری تعالیٰ عز اسمہ کے قوانین کو نافذ کرتا رہے۔ کون نہیں جانتا کہ اجراء احکام، ایک فرمانبردارانہ حرکت ہے۔

غور فرمائیے ہیئتِ اجرائیہ، یعنے مجلس وزراء ہمیشہ قانون ساز قوت کے زیر فرمان رہ کر اپنا فرض ادا کرتی رہتی ہے۔ اس بناء پر ہم امارت کو خالص خدمت گاری اور فرمانبرداری (عبدیت) سمجھ کر اس کے وجود کا فرض صرف یہی جانتے ہیں کہ۔

(۱) قانون ساز قوت (یعنے اعلیٰ حضرت باری تعالیٰ شانہ) کی مرضیات اور اس کے احکام کے نشاء کو بے چون وچرا تسلیم کر کے اولاً خود اس کی پابندی کرے۔

(۲) پھر کسی رد و بدل اور ترمیم و تنسیخ کے بغیر ممالک محروسہ میں ان کو جاری کرے۔

(۳) حکومتِ الٰہی کی مملکت میں کسی غیر کا کوئی قانون کوئی اقتدار

ہرگز ہرگز تسلیم نہ کرے۔

إِيَّاكَ نَعْبُدُ وَإِيَّاكَ نَسْتَعِينُ

اس توضیح کے بعد ہم امامت کے دستور اساسی کو پیش کرکے عالم اسلام کے مفکرین سے استفتا کرتے ہیں۔

امامتِ اُمت

امت وسط۔ اولوالامر۔ امام۔ دارالاسلام۔ دارالسلام۔ لسانِ رسمی (سرکاری زبان) بیت المال۔

امتِ وسط | وہ منتظم جماعت جو قانونِ الٰہی کے اجراء اور تعمیل کی ذمہ دار ہو امت وسط ہے

کذلک جعلنٰکم امۃ وسطا لتکونوا شھداء علی الناس ○

اولوالامر | وہ منتظم جماعت جو دائرہ امت میں نیابتہً قانون کو جاری کرتی ہے (یعنے اہلِ حل و عقد) اولوالامر امارت المومنین یا امامتِ اُمت کہلاتی ہے۔ اولوالامر منکم۔ امرھم شوریٰ بینھم

امام | امامت کے امیر یعنے رہنما یا صدر (ناظمِ اعلیٰ) کو امام خلیفہ الرسول اللہ علیہ السلام یا امیرالمومنین کہا جاتا ہے

الامام جُنّہ (حدیث شریف) خلیفۃ رسول اللہ ابوبکر۔

ارکانِ شوریٰ ایک شخص کو اوصاف اجتماعی میں سب سے بہتر جان کر اپنی آزادانہ رائے سے امام منتخب کر لیتے ہیں۔

اَوصَافِ اجتماعی بلوغ۔ ذکوریت۔ اسلام عقل۔ علمِ قانون (مسائلِ شرعیہ سے پوری واقفیت اور ان میں بصیرت) قوت ارادی۔ شجاعت۔ عدالت۔ پابندیٔ قانون (تقویٰ) حسب۔ ضرورت ایسے قبیلہ کا فرد ہونا جو امت میں سب سے زیادہ با اثر ہو۔ خلیفہ سابق کی اولاد میں سے نہ ہو۔

ولی عہد اوصافِ اجتماعی اور منافع امت کا لحاظ کرتے ہوئے کوئی حضرت صدیق رضی اللہ عنہ جیسا صادق مخلص، اور متقی خلیفہ اگر کسی کو نامزد کر دے تو اولوالامر یعنے ارکان شوریٰ ارباب حل وعقد کے قبول کرنے پر امام ہو جاتا ہے (بشرطیکہ ارکانِ شوریٰ نے صداقت اور حق پرستی کے ساتھ اسے قبول کیا ہو)۔

امام کا فرضِ منصبی اجراء قانون (جو فریضۂ امت تھا) کی رہنمائی کرنا۔

امام باجلاس شوریٰ۔ قوانین الٰہی کی تبلیغ ان کے اجراء اور دارالسلام کی ترقی اور حفاظت کے متعلق امت کا وکیل عام ہے۔ اور امت کے سامنے جوابدہ ہے۔

صحیح طور پر جو امام منتخب کیا گیا ہو وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا قائم مقام ہے اور امام کی حیثیت بادشاہِ حقیقی کے دربار میں جوابدہ کی ہے۔

خلیفہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہونے کی حیثیت سے امام کا یہ بھی فرض ہے کہ قانون کے نفاذ واجراء، دارالاسلام کی ترقی اور حفاظت کے متعلق امت کی حسیات اور اس کے احساسات کا لحاظ رکھے یعنی امت کے وکلاء سے مشورہ کرتا رہے وَشَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ

امام باشوریٰ کا فیصلہ ایک جائز اور مباح کو (یعنے جس کے نہ کرنے میں کوئی گناہ نہ ثواب) واجب کر دیتا ہے۔

امت کے تمام فیصلوں کے (مثلاً اجرائے قانون کے ضابطے معاہدے صلح جنگ وغیرہ وغیرہ) اعلان کے لئے امت کی زبان ہی۔

شخصی یا اجتماعی مصالح کی بناء پر اگر امام استعفا پیش کرنا چاہے تو اس کو اولوالامر (ارکانِ شوریٰ) کے سامنے پیش کرے گا۔

ناقابل ضعیف خائن ظالم بے عمل اور منافق امام کو امت معزول کر سکتی ہے۔

دارالاسلام	محروسہ امامت یعنے امام باشوریٰ جہاں جہاں قانون نافذ کرے گا وہ دارالاسلام کہلائے گا۔
دارالسلام	(جو شہر) دارالاسلام میں اجراءِ قانون کا مرکز (یعنے دارالخلافہ) ہو وہ دارالسلام کہلاتا ہے۔
سرکاری زبان	عربی
بیت المال	امت کے خزانہ کا نام بیت المال ہے۔

امام بیت المال کا صرف محافظ ہے۔

قانونی رعایتوں کے ساتھ بیت المال کا صرف کرنا بھی صرف امت کی رضامندی کے بعد ہو سکتا ہے۔

امامت اور بیت المال کی آمد و صرف پر امت کا ہر رکن آزادانہ نکتہ چینی کر سکتا ہے

باب الحقوق

حقوق عامہ۔ حقِ مسلمین۔ حقِ غیر مسلمین روابط اجنبی (بیرونی

تعلقات) معاہدات۔

حقوق عامہ | بے مثل مساوات شخصی رائے علم، فن، (صنعت)
تجارت کی عام انسانی آزادی۔ ملکیت مجازی
یعنی انسانی ملکیت کے حقوق کا کامل احترام۔ ناموس آبرو تعلقات
زوجیت کا کامل احترام، فرض شناسی۔ نوع انسان کی خدمت
حُسنِ معاملہ، نظافت و شرافت اخلاق کی قدر افزائی۔ یتامیٰ بیوگاں
کم زور، محتاج، ضرورتمند، تمام ذی روح تمام کائنات پر خاص رحم
لطف وکرم وغیرہ۔ یہ ہیں امت کے اصول اور ناقابلِ تغیر نظریئے۔

حق مسلمین | امت کے تمام افراد ایک دوسرے کے بھائی
اور امت کے مساوی ارکان ہیں۔ المومنون
اِخوۃ۔ اراکین امت پر سود لینا دینا شراب وغیرہ ہمیشہ ہمیشہ
کے لئے حرام ہیں۔

مسلمان مرد اور عورت پیدائشی طور پر انسان کی دو نوع ہیں
جن کے حقوق مختلف ہیں مگر ایک دوسرے کے لئے لازم وملزوم
ہیں خلق الذکر والانثیٰ۔ الرّجال قوامون
علی النّساء۔

صاحب دولت اہلِ اسلام کی آمدنی میں عام فقراء مسکین۔
قرضدار وغیرہ کا حق ہے۔

حق غیر مسلمین | غیر مسلم اقوام۔ پنچایتی نظام قائم رکھنے کے مجاز
ہوں گے۔ مگر اپنا مستقل امیر آزاد مطلق ڈکٹیٹر
یا مطلق العنان، جمہوریہ قائم نہیں کرسکتے لیکن خود مختار کی حیثیت سے

امامت کے تابع ہوکر (باصطلاح موجودہ تاج اسلام کے فرمانبردار رہتے ہوئے) اراکین امت کے ساتھ حقوق مساوی ہونگے اور مذہب میں کامل آزاد (اگر پنچایتی نظام نہ بنا سکیں تو ان کے افراد کو بھی مذہباً کامل آزادی ہوگی اور شہری حقوق میں مساوات رہے گی)۔

غیر مسلم رعایا (ذمّی) کے جان مال ناموس اور وطن کی حفاظت امامت کے ذمہ ہے۔

اجراء قانون کی خدمت سے ذمّی (غیر مسلم رعایا) آزاد ہیں۔ امت کی سیاست کا لحاظ کرتے ہوئے غیر مسلم اقوام کے افراد اور دوسری حکومتوں کی رعایا دارالاسلام میں مامون کی زندگی بسر کر سکتے ہیں۔

غیر مسلم اقوام اور حکومتوں کے ساتھ سفیروں کا تبادلہ قونصلوں کا تقرر اور ان کے پاس وفود بھیجنا جائز ہے۔ غیر اقوام اور حکومتوں کے نمائندوں کا احترام اور ان کی حفاظت فرض ہے۔

معاہدات منافع امت کے پیش نظر ہر قسم کے معاہدے کئے جاتے ہیں عہد کی پابندی بہت زیادہ لازم ہے اوفوا بالعهد ان العهد كان مسئولا۔ دوسری حکومتیں جو مسلمانوں کو مذہبی آزادی نہیں دیتیں حتی الامکان ان کے ساتھ تعلقات قائم نہیں کئے جائیں گے۔

جو مسلمان کہ کسی دوسری حکومت سے معاہدہ کر کے اس کی رعیت بن گئے ہوں امام کے معاہدین کے مقابلہ پر مستحق امداد نہیں سمجھے جاتے فعليكم النصر الا على قوم۔

مولانا سید محمد میاں صاحب اور حکومتِ الٰہیہ

مجلہ "قائد" مراد آباد کا سالنامہ محرم الحرام ۱۳۸۵ھ پیش نظر ہے اس مجلہ کے اربابِ حل وعقد دارالعلوم دیوبند اور جمعیتہ العلمائے ہند سے خصوصی تعلق رکھتے ہیں سالنامہ قائد کے شذرات میں بتایا گیا ہے کہ قائد کا مقصد ماحول کو محکمۂ قضا کے قیام کے لئے سازگار بنانا تھا مگر شیخ الہند مولانا محمود الحسن صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی جماعت کے رکن خاص اور حضرت مولانا عبید اللہ سندھی کے دستِ راست حضرت مولانا غازی محمد بن عبد اللہ انصاری مہاجر کابل کی تحریک و توجہ نے اُسے حکومتِ الٰہیہ کا مبلغ اور داعی بنا دیا حضرت مولانا محمد بن عبد اللہ انصاری کا مرتب کیا ہوا دستور حکومت الٰہیہ بھی آپ اس کتاب میں کہیں ملاحظہ

فرمائینگے ان باتوں سے ثابت ہے کہ حضرت مولانا محمود الحسن قدس سرہ العزیز کے متبعین کا ایک حلقہ بھی اس نصب العین حکومت الہیہ کا مبلغ اور حامی ہے"

ایسی حالت میں حضرت مولانا حسین احمد صاحب؟

کے رفقاء و معتقدین کو حضرت مولانا حسین احمد صاحب کے مسلک و طرز عمل پر غور کرنا چاہیئے قائد رہیں؟

میں مولانا سید محمد میاں صاحب مراد آبادی "قائد التحریر" قائد کی ایک کتاب کا جس کا نام "مسلم سوشلسٹ" یا اسلامی سوشلزم ہے ایک طویل حصہ شائع ہوا ہے اس کتاب کا تعارف ان الفاظ میں کرایا گیا ہے۔

"اسلامی سوشلزم

مسلم سوشلسٹ کے اصولی عقائد

سارے جہان کا پیدا کرنے والا ایک ہے۔

وہ احکم الحاکمین ہے۔ رب العالمین ہے۔ ارحم الراحمین ہے۔

وہ رب الناس ہے۔ ملک الناس۔ الہ الناس ہے۔

سب سے پہلے اور سب سے آخری نبی رحمۃ للعالمین ہیں (صلی اللہ علیہ وسلم۔)

آپ اس لئے بھیجے گئے ہیں کہ سارے جہانوں پر رحم کیا جائے۔

اسلام قانونی ہدایت ہے۔ قرآن بشارت ہے۔ دستور احسن ہے۔

روئے زمین پر بسنے والے آدمی ایک ماں اور ایک باپ کی اولاد ہیں۔ کالے گورے کی تفریق نہیں، بجز ور کی تقسیم نہیں" مولانا محمد میاں صاحب کی" اسلامی سوشلزم "کے پانچویں باب کے اقتباسات

درج ذیل ہیں۔

"عقیدۂ توحید کی تشریح

جامعہ بشریت کا حقیقی مربی ـــــ نظام عالم کا مقننِ اعظم

راحت۔ امن خوش حالی۔ آشتی۔ رحم۔ انصاف۔ کیسے پیارے الفاظ ہیں۔ انسان ان کا کیسا دلدادہ ہے وہ ہمیشہ انھیں پکارتا رہا۔ اور ان کے نعرے لگاتا رہا مگر افسوس کامیابی بہت کم نصیب ہوئی۔ وجہ یہ ہے کہ ان چیزوں کا ضرورت مند انسان کا کمزور طبقہ ہوتا رہا بلا شبہ اس کو خوش گوار الفاظ کی حقیقت کا سچا اشتیاق رہا اور اس کے لئے وہ ہمیشہ ہر ایک قربانی پر آمادہ رہا۔ مگر بدقسمتی سے اکثر یہی ہوا ہے کہ مکار اور خود غرض آگے آگئے انھوں نے قیادت کا علم ہاتھ میں لیا اور بھولے بھالے انسانوں کی ٹولیوں کو اپنے ساتھ ملا کر انقلاب پیدا کر دیا

اور جب وہ خود اقتدار کے مالک ہو گئے۔ دولت ان کے قدموں میں آگری۔ تو کمزور انسانوں کی ٹولیوں نے دیکھا کہ ان کی مصیبت میں ایک رتی بھر بھی کمی نہیں ہوئی فرق صرف یہ ہوا کہ آقا بدل گئے غریب انسان پہلے کی طرح بدستور غلام و مجبور باقی رہے۔"

عالم انسانی نے جب اس قسم کے جھوٹے مدعیوں کا تجربہ کر لیا تو اب وہ دوسرے نظامِ حکومت کی طرف متوجہ ہوئے کہ نظام حکومت

جمہوری ہو۔ انتخابات کے ذریعے مجلس قانون ساز مقرر ہو اور جملہ ارکانِ حکومت اس کے ماتحت ہوں۔ ملوکیت کا خاتمہ کر دیا جائے کسی کو بادشاہ اس لئے نہ بنایا جائے کہ اس کا باپ بادشاہ تھا بلکہ حاکمِ اعلیٰ کا انتخاب بھی رائے عامہ ہی سے ہو۔

غلطی یہ تھی کہ جزوی اور کلی قانون کا اختیار اسی مجلس کو دیدیا اور اپنے جیسے انسانوں سے رحم اور انصاف کا طالب ہو گیا۔ حالانکہ ناممکن ہے کہ کبھی کوئی جمہوریہ دنیا کے اندر مساوی طور پر تمام انسانوں کے ساتھ عدل و انصاف کا برتاؤ برت سکے۔ فریب خوردہ بھولے انسان نے جمہوریہ سے عدل و انصاف کی توقع اس لئے کی تھی کہ اراکین حکومت انتخاب کے وقت اس کی رائے کے محتاج ہوں گے بیشک یہ حالت ضرور پیش آئی لیکن مصیبت یہ ہوئی کہ نظام حکومت اکثریت کے ہاتھ میں پہنچ گیا۔

تجویز یہ پاس کی گئی کہ ہر ایک بالغ ووٹ دے مگر اکثریت کے غلبہ سے اب بھی نجات نہ نصیب ہوئی۔

(۲) بایں ہمہ یہ نظامِ حکومت اکثریت کے عوام کے لئے بھی عدل و انصاف کا حامل نہ ہو سکا کیونکہ قانون دراصل عوام نے نہیں بنایا۔ بلکہ ان چند نمائندوں نے بنایا جو کروڑوں میں سے منتخب کئے گئے تھے لیکن کیا ان نمائندوں میں سے ہر شخص اعلیٰ اخلاق کا مالک تھا؟ وہ انصاف اور عدل۔ رحم اور کرم کا متوالا تھا؟ اور کیا اس کو عوام کے ساتھ اتنی ہی محبت تھی جتنی اپنی ذات کے ساتھ یا اپنے گھرانے اور برادری کے ساتھ تھی؟

اور ہر نمائندہ کو عوام کے جذبات کا صحیح علم تھا ان کی ضرورتوں کا صحیح احساس تھا؟ ہرگز نہیں۔

حالت یہ ہے کہ امیر کو غریب کے دکھ درد کی خبر نہیں اور غریب امیر کے لذت پسند جذبات سے واقف نہیں شہری اور دیہاتی کی ضرورتوں اور ان ضرورتوں کے بموجب جذبات میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔

تاجر دستکار کی پریشانی سے بے خبر۔ اور دستکار تاجر کی ضرورتوں سے قطعاً بے پروا۔ ایک مرد اور ایک عورت ساری زندگی ساتھ گزار دیتے ہیں مگر کیا مرد کو نسوانی جذبات کی واقفیت ہوتی ہے؟ اور اس کے دل میں وہی چیزیں امنگ پیدا کرتی ہیں جو عورتوں کے دلوں کو لبھاتی اور فریفتہ کرتی ہیں؟

ہاں بیشک غیر ملکی نظام حکومت کے مقابلے پر اہل ملک کی مشترک اور عام ضرورتوں کے لئے یہ نظام مفید ہو سکتا ہے لیکن عدل و انصاف کا مکمل نقشہ ناممکن ہے کہ اس سے ظہور پذیر ہو۔

(۳) اور پھر وہ انسان جو ایک جمہوریہ کی حدود حکومت سے باہر ہوں وہ اگر کسی وجہ سے کسی توجہ کے مستحق ہو بھی جائیں تو ان ناانصافیوں سے محروم نہیں رہ سکتے جو جغرافیائی یا نسلی تقسیم کے تقاضے پر ان کے ساتھ برتی جائیں اور خصوصاً ایسے موقع پر جہاں ہر ایک کے مفاد کا دوسرے سے تصادم ہو۔

(۴) وضع قانون کے بعد اجراء قانون کا نمبر آتا ہے جو تنخواہ دار نوکروں کے سپرد کیا جائے جو مکر و فریب شہوت پرستی اور خود غرضی

ہیں کسی سے کم نہیں ہوتے یہاں رشوت کی گرم بازاری ہوتی ہے کبھی تعصب کے شعلے بھڑکتے ہیں کبھی شہوت پرستی کے جذبات بروئے کار آتے ہیں۔ ہزاروں بے ایمانیاں ہزاروں مکاریاں ان خود غرض حاکموں اور چاکروں کے دامن میں پناہ لیتی ہیں۔ کیا یہ نوع انسانی کے لئے رحمت بن سکتے ہیں؟۔

ان مقدس انسانوں (انبیاء کرام علیہ الصلوٰۃ والسلام) نے بار بار اعلان کیا کہ انسان کے لئے فلاح و بہبودی کی بہترین اور کامیاب شکل صرف یہی ہو سکتی ہے کہ وہ خود کو اس کائنات کے ہمہ گیر نظام کا ایک جز سمجھے اور وہ جس طرح پیدائش، زندگی موت اور ان کے تمام متعلقات میں نظام قدرت کے سامنے لازمی اور فطری طور پر گردن جھکائے ہوئے ہے وہ اپنی اجتماعی ضرورتوں اور مابعد الموت کی فلاح کے لئے بھی اسی قدرت کے سامنے سر تسلیم خم کر دے وہ اس حماقت میں تو ہرگز مبتلا نہ ہو کہ یہ تمام قدرت قادر کے بغیر ہے. قانونِ فطرت اگرچہ نہایت مضبوط ہے مگر اس کا بنانے والا کوئی نہیں۔

ہاں یہ غور کرے اور یہی غور اُس کا عاقلانہ اور منصفانہ غور ہوگا اور یہی غور اس کو شک و شبہ کی تمام تاریکیوں سے نجات دلا کر اطمینان اور یقین کا نور بخشے گا کہ اس بے پناہ قدرت کا جو مالک ہے وہ کیسا قادر کیسا خالق کیسا جلیل القدر کتنا عظیم الشان کیسا مالک ہے نظامِ عالم کے قانون کا جو مقنن ہے وہ کیسا حکیم

کیسا دانا اور کیسا بصیر ہے۔ اس کی قدرت بے انتہا اس کی دانائی اور حکمت لامحدود۔ اس کا علم اس کا ارادہ سارے عالم کو محیط ہے اس کے رحم و کرم اس کی داد و دہش ایسی عام ہے کہ کائنات کی ہر چیز اس کی وظیفہ خوار اس کی بخشش سے حصہ یاب۔ خود انسان اپنی زندگی میں جو اس کی سب سے بڑی دولت ہے اچھی طرح غور کرے تو یہ بھی یقین کرلے کہ تمام ضروریات زندگی میں اس کے لطف و کرم سے حصہ پانے والا ہے۔

تمھیں اسی (خدا) سے اپنی فلاح اور اجتماعی نظام کے لئے دستور مانگنا چاہیئے۔ اسی سے قانون کی درخواست کرو۔ اس کا خوف دل میں بٹھاؤ اور یہ یقین کرو کہ ہم اس کے سامنے جوابدہ ہیں۔ ہمارے تمام اعمال کا وہ محاسبہ کرے گا ہمیں اسی کے قانون کو لے کر انسانیت کی خدمت کرنی ہے اسی کا قانون مکمل قانون ہوسکتا ہے کیونکہ وہی مساوی طور پر تمام انسانوں کا پیدا کرنے والا ہے ان کی ضرورتوں کو جاننے والا ہے۔ ان کے جذبات سے واقف ہے کیونکہ وہی خالق ہے۔ واقف اور علیم ہے جب تک بادشاہ اور حاکم۔ ارائین حکومت اور ممبران جمہوریہ رب ذوالجلال کے یقین کے ساتھ اس کے عدل و انصاف کے قانون کو مضبوطی سے پکڑ کر اور اس کی بارگاہ میں اپنی مسئولیت اور جوابدہی کے صحیح احساس کے ساتھ مخلوق خدا کی خدمت نہ کریں تو وہ جھوٹے ہیں کذاب ہیں۔ دجال ہیں مکار ہیں فریبی ہیں ہرگز انصاف قائم نہیں کرسکتے۔

اور کسی طرح انسانیت عظمیٰ کے خادم نہیں بن سکتے۔

ساتویں باب کے اقتباسات ذیل بھی قابل ملاحظہ ہیں۔

عقیدۂ توحید اور رحمۃ للعالمین کا اثر سیاسیاتِ عالم پر۔

رحمۃ للعلمین کے آنے کے بعد صرف ایک تقسیم لازمی رہی جس سے کوئی مساوات کوئی قانون بھی مستثنیٰ نہیں یعنے ماننے والے اور نہ ماننے والے۔ صرف یہی وہ تقسیم ہے جس کو اسلام اور کفر سے تعبیر کیا جاتا ہے مگر کیا دنیا کی کوئی مساوات دنیا کا کوئی سوشلزم کمیونزم اس تقسیم سے مستثنیٰ ہوسکتا ہے؟

ہزاروں دھکے کھانے کے بعد آج دنیا ملوکیت پر لعنت بھیج رہی ہے مگر رحمۃ للعلمین صلی اللہ علیہ وسلم نے پونے چودہ سو سال پیشتر ارشاد فرمایا تھا۔

اخنع اسم الی اللہ یوم القیٰمۃ رجل تسمی ملک الاملاک لامالک الا اللہ

قال ابوسفیان شاھنشاہ

شیخین۔ ابوداؤد۔ ترمذی)

لعنتی نام خدا کے نزدیک قیامت کے دن یہ ہے کوئی انسان اپنا نام ملک الاملاک تجویز کرلے یعنے "شاہنشاہ" ملک صرف اللہ کا ہے۔

حضرت حق نے ارشاد فرمایا ان الحکم الا للہ

(حکم صرف خدا کا ہے)۔
آج دنیا سرمایہ داری پر لعنت بھیج رہی ہے مگر قرآن پاک کا ازلی اعلان ہے۔

والذین یکنزون الذھب والفضۃ ولا ینفقونھا فی سبیل اللہ فبشرھم بعذاب الیم ۝

جو لوگ سونا اور چاندی جوڑ کر (کنز بنا کر) رکھتے ہیں اور ان کو اللہ کی راہ میں خرچ نہیں کرتے ان کو دردناک عذاب کی خبر سنا دو۔

یوم یحمیٰ علیھا فی نار جھنم فتکوی بھا جباھھم وجنوبھم وظھورھم ھذا ما کنزتم لانفسکم فذوقوا ما کنتم تکنزون ۝

اس روز کہ دوزخ کی آگ میں سونے چاندی سے ان کی پیشانیاں ان کے پہلو ان کی کمریں داغی جائیں گی کہ یہ ہے وہ جو تم نے اپنے لئے جوڑ رکھا تھا چکھو اس کو جو جوڑ رکھا تھا۔

بیشک اسلام نے ملکیت تسلیم کی ہے کیونکہ اسلام کی تعلیم فطرت کے مخالف نہیں۔ نیز دولت کا چالیسواں حصہ سالانہ نکالنے سے کنز کی نحوست باقی نہیں رہتی مگر رحمت وعافیت کا صحیح پھیلاؤ یہ ہے کہ دولت مندیا غنی کا معیار اتنا گھٹا دیا کہ جو شخص ضروریات

سے فاضل باون تولہ چاندی کا سال بھر مالک ہے اس پر چالیسواں حصہ خرچ کرنا فرض ہے۔

اور پھر رحمت عامہ کا دوسرا حصہ ملاحظہ ہو کہ ارشاد ہے۔

امّا السّائل فلا تنھر (سورۂ ضحیٰ)

سائل کو مت ڈانٹو۔

وفی اموالھم حق للسائل والمحروم

ان کے مالوں میں حق ہے سائل اور محروم (مفلس) کا۔

اصول حکومت قرآن پاک کی ایک چھوٹی سی آیت غور وخوض کے لئے نقل کی جاتی ہے جس کی ترتیب پر بے اختیار قربان ہونے کو جی چاہتا ہے۔

رب الناس - ملک الناس - الٰہ الناس

یعنے چونکہ وہ تمام انسانوں کا پیدا کرنے والا اور پالنے والا ہے (لہذا) انسانوں کا بادشاہ ہے (اور اسی لئے وہ) تمام انسانوں کا خدا ہے:

وضع قانون (الف) اصول قانون اور اساسی دستور بنانے کا حق صرف اسی کو ہو گا جو ہر ایک انسان کی فطرت اس کے جذبات رحجانات اور اس کی ضرورتوں سے واقف ہو۔ لہذا

ان الحکم الا للّٰہ۔

حکم قانون صرف اللہ کا ہے۔

کیونکہ وہ ربّ العالمین ہے
تمام جہانوں کا پالنے والا اور پیدا کرنے والا ہے۔
وہ ارحم الرّحمین ہے۔
تمام مہربانوں میں سب سے زیادہ سب سے بڑا
مہربان
لہٰذا وہ اَحْکَمُ الحَاکِمِین ہے۔
یعنے تمام حکومت کے دعویداروں میں سب سے
بڑا حاکم۔
چونکہ اس کے ماسوا نہ کوئی پروردگار ہے نہ ارحم الرّاحمین لہٰذا۔

من لم یحکم بما انزل اللّٰہ فاولٰئک
ھم الظّٰلمون ——— ھم الفاسقون

جو خداوند عالم کے نازل کردہ قانون کے بموجب
فیصلہ نہ دے وہ ظالم ہے ——— وہ فاسق ہے۔

(ب) انسان محض فرمانبردار نائب کی حیثیت سے اس قانون کو نافذ کرے اسی لئے انسان کو پیدا کیا گیا ہے۔

اِنّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَہ یعنے آدم علیہ السلام کی پیدائش کے وقت ارشاد ہوا تھا کہ میں زمین پر خلیفہ بناتا ہوں۔

چنانچہ اسلامی جمہوریہ کے ناظم اعلیٰ کو یہی خطاب دیا گیا یعنی خلیفہ خدا کا نائب تاکہ اس کا قانون نافذ کرے اور تمام اہل ملک کا نائب تاکہ ان کے باہمی نظام کو برقرار رکھے ہر ایک کا ملکی

شہری۔ اقتصادی اور انسانی حق ادا کرتا ہے۔ غور کرو ارشادِ ربانی ہے۔

انّ اللّٰہ یامرکم ان تودوا الاما
نات الیٰ اھلھا واذا حکمتم بین الناس
ان تحکموا بالعدل انّ اللّٰہ نعمّا
یعظکم بہ انّ اللّٰہ کان سمیعا بصیراہ

اللہ تعالیٰ کا حکم ہے کہ امانتیں ان کو ادا کردو
جن کی وہ ہیں اور جب تم انسانوں کے درمیان فیصلہ
کرنے لگو تو انصاف کے ساتھ فیصلہ کرو۔ بلاشبہ
خداوندِ عالم جس چیز کی نصیحت کر رہا ہے وہ بہت ہی
بہتر ہے (لہٰذا تم یقین رکھو کہ خدائے برتر کے سامنے
جوابدہ ہوگے)

مولانا عبد الماجد اور حکومت الٰہیہ

مولانا عبد الماجد دریا بادی انگریزی کے بی۔ اے اور ایک ادیب و فلسفی کی حیثیت سے روشناس عوام ہوئے، لیکن محاسن اسلام کی جاذبیت و دلفریبی نے انھیں جلد ہی اپنا گرویدہ بنا لیا۔ اس کا اثر یہ ہوا کہ مولانا نے اپنے دماغ اور قلم کی پوری طاقت مغربی تہذیب و معاشرت کی تنقید اور اسلامی اصول و اخلاق کی تبلیغ کے لئے وقف کر دی، مولانا کا ایک امتیازی طرز نگارش ہے جو اپنے اندر خاص دلکشی رکھتا ہے، اس کے ذریعہ تعلیم یافتہ نوجوانوں کو مغربی تہذیب و اخلاق سے ہٹا کر اسلامی اصول و اعمال کی جانب متوجہ کر کے مولانا نے اسلام کی قابلِ قدر خدمت انجام دی ہے۔

افسوس کہ ہمیں اپنی کتاب کے لئے مولانا عبدالماجد کے
افکار و خیالات کا معتد بہ حصہ نہ مل سکا، تاہم ذیل میں
جریدۂ "صدق" کے ذریعہ مولانا کے جو خیالات پیش
کیئے جا رہے ہیں وہ اس حقیقت کے اظہار کے لئے کافی
ہیں کہ ان کی دعوت و تبلیغ کا ذکر و محور بھی حکومتِ الٰہیہ
ہی کا نصب العین ہے، خواہ وہ اس نصب العین کے نام
سے دعوت نہ دیں اور اس نصب العین کے لئے جد و جہد
نہ کریں۔

حکومتِ الٰہیہ کی عالمگیری کی دعوت مولانا عبدالماجد "صدق" دسمبر سنہ ۱۹۴۰ء میں آیۂ کریمہ "فلا تطع الکافرین وجاھدھم بہ جھادا کبیرا" کے تحت فرماتے ہیں۔

"یعنے قرآن کے ذریعہ جہاد کرو مقصود اور مطمع نظر قرآن ہی کے
قانون کو رکھو قرآن ہی کو ہاتھ میں لے کر اٹھو قرآن ہی کی راہ کا سب کو
بلاوا دو۔ اور قرآن ہی کی منزل کی طرف سب کو بلاؤ اس راہ پر لانے
اور اس طرف بلانے میں جد و جہد یقیناً بہت سخت کرنی پڑے گی
جان کھپانی پڑے گی۔ لیکن راہ ہے یہی حکم ہے اسی کا.......
"اس مضمون کو مختلف پیرایوں میں اور مختلف عنوانات سے
ادا کرنے والی آیتیں دو چار نہیں پچاسوں بلکہ سینکڑوں ہیں یہ حکم
اگر عارضی اور پہلی صدی ہجری یا چھٹی صدی عیسوی کے ساتھ مخصوص
تھا۔ جب تو خیر لیکن اگر آپ کے عقیدہ میں ہر ملک ہر قوم ہر زمانہ
کے لئے ہے تو آج آپ کیوں قرآنی حکومت کی توسیع و ترویج کیلئے

مضطرب نظر نہیں آتے۔ آپ کو یہ کیا ہو گیا ہے جو آج آپ کے دل میں تڑپ قرآنی حکومت کی عالمگیری کی نہیں؟........"

۷ اپریل ۱۹۴۱ء کے "صدق" میں مولانا عبدالماجد نے پھر اس دعوت کی جانب توجہ فرمائی ہے، مسلمانوں کو واضح لفظوں میں بتایا ہے کہ ان کا نصب العین صرف اعلاءِ کلمۃ اللہ اور عالمگیر الٰہی حکومت کا قیام ہونا چاہیئے فرماتے ہیں:-

"مسلمانوں کا سیاسی آئیڈیل (مطمح نظر) ہونا کیا چاہیئے؟ جواب جامع اور دو لفظی صرف ایک ہے یعنی اسلام کی حکومت، قرآن کی بادشاہت بس اس کے سوا کوئی اور نصب العین ناممکن ہے نہ اب تک پیش ہوا........ اس حقیقت کے ذہن نشین ہو جانے کے بعد اس طبقہ کی غلطی اور غلط روی از خود واضح ہو جاتی ہے جس نے اس سے کمتر نصب العین پر قناعت کر لی ہے یا کسی غیر اسلامی حکومت کو تسلیم کر کے اس کے اندر مسلمان نامی ایک قوم کی محض دنیوی سربلندی و خوش حالی کو اپنا مقصود بنا رکھا ہے۔

سارا خلط مبحث آزادی سے پیدا ہوا ہے۔ غیر مسلم ہندوستانیوں کے نزدیک اس کے معنی ہیں غیر ملکی حکومت پر دیسی حکومت کے قانون سے مخلصی "مسلم" ہندوستانی کے نزدیک، وہی ہو سکتے ہیں جو مسلم عرب، مسلم ترک، مسلم مصری، مسلم جاپانی، مسلم انگریز کے ذہن میں ہوں گے یعنی غیر اسلامی نظامِ حکومت سے رہائی، خواہ یہ غیر اسلامی حکومت کسی کی بھی ہو، عیسائی کی ہو، یہودی کی ہو، ہندو کی ہو، مجوسی کی ہو، ملحد کی ہو، مشرک کی ہو، یا محض نام کے مسلمان کی

ہو یا ان میں سے دو یا تین کی مشترک ہو۔ مسلمانوں کو جو کچھ بیزاری ہے کفر سے ہے۔ انگریز بیزاری، ہندو بیزاری ہرگز اس کا دین نہیں ..... تو خلاصہ یہ ہے کہ مسلمانان کے لیے اپنی ایک مرکزی انجمن پر اتحاد لازمی ہے خود اس انجمن کی تشکیل صحیح اسلامی طور پر ہونی چاہیے مقصود اصلی بہرحال میں اعلاء کلمتہ اللہ اور حکومت الٰہی کی عالمگیری ہے۔"

مولانا عبدالماجد کا فرض

مولانا عبدالماجد نے اوپر مسلمانوں کو یہ بتا کر کہ ان کا سیاسی نصب العین قرآنی بادشاہت بالفاظ دیگر حکومت الٰہیہ کے قیام کے سوا اور کچھ نہیں ہو سکتا یہ دعوت دی ہے کہ صحیح اسلامی اصول پر ایک مرکزی مجلس بنا کر مسلمانوں کو اس میں شامل ہو جانا چاہیے، مولانا عبدالماجد صاحب کی دعوت کی صحت سے کیسے انکار ہو سکتا ہے؟ لیکن مولانا کی دعوت پر اسلامی ہند کے کسی گوشے سے صدائے لبیک بلند نہیں ہوئی جس زمانے میں مولانا عبدالماجد نے یہ دعوت دی، مسلم لیگ بھی موجود تھی جمعیتہ العلماء بھی مجلس احرار بھی اور دوسری اسلامی انجمنیں بھی۔ ان کی موجودگی میں مولانا کا ایک مرکزی انجمن کی تشکیل کا مشورہ دینا ظاہر کرتا ہے کہ موجودہ انجمنوں میں مولانا کے نزدیک کوئی انجمن اس مقصد کے مطابق نہ تھی، اور یہ حقیقت بھی ہے۔ پھر مولانا نے کیوں اپنی ایک جماعت نہیں بنائی جو اس نصب العین پر عمل کرتی؟

خدا کی زمین پر خدا کی بادشاہت

از مولانا سید صبغۃ اللہ صاحب بختیاری صوبہ مدراس

ایک مسلمان کا نصب العین کیا ہونا چاہیئے۔ اسلامی حکومت اور غیر اسلامی حکومت میں کیا فرق ہے اور جماعت اسلامی کی حقیقت کیا ہے؟ یہ چند باتیں ہیں جن کے متعلق میں کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں۔

نصب العین کے معنی ہیں وہ چیز جس کی طرف انسان متوجہ ہو کر ٹکٹکی باندھے اور اپنی نظر اس طرح جمائے کہ کوئی دوسری شئے خواہ وہ کیسی ہی عجیب و غریب، نظر فریب اور نگاہ سوز ہو اس کو اپنی طرف نہ پھیر سکے ایک مسلمان کا نصب العین کیا ہونا چاہیئے؟ اس کا جواب قرآن مجید میں یہ ہے۔

هو الذی ارسل رسوله بالهدی و دین الحق لیظهره علی الدین کله ولو

وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُونَ ؏
وہی اللہ ہے جس نے اپنے رسول کو ہدایت اور
دین حق کے ساتھ بھیجا۔ تاکہ اس کو جنس دین پر غالب
کر دے اگرچہ مشرکین اس کو ناپسند کریں۔

دینِ حق کے معنی ہیں زندگی بسر کرنے کا طریقہ جو سراسر حقیقت اور صداقت پر مبنی ہے اور جس کے علاوہ کوئی طریقہ صحیح اور سچا نہیں ہو سکتا۔

دینِ حق کو غالب کر دو

معلوم ہوا کہ مسلمان کا نصب العین دین حق کو غالب کرنا ہے لہذا مسلمان حقیقت میں نام ہے اس انسان کا جو اپنے جی کی مرضی کو چھوڑ کر اللہ اور اس کے رسول کے تابع ہو جاتا ہے اپنی زندگی کو اس کے بتائے ہوئے طریقے کے مطابق بسر کرتا ہے مسلمان وہ ہے جو اپنے عقل و جدان اور علم تمام قوتوں سے ہٹ کر اللہ کی وحی کے ساتھ اپنا رشتہ جوڑ دیتا ہے۔ دنیا میں بعض انسان وہ ہیں جو اپنے تجربے سے کسی چیز کو اچھا سمجھ کر اس پر چلتے ہیں بعض وہ ہیں جن کی زندگی ان کی عقل کے مطابق ہوتی ہے بعض وہ ہیں جن کے پاس اچھائی اور برائی کا معیار ان کا اپنا نفس ہوتا ہے لیکن مسلمان کی شان یہ ہے کہ وہ اپنی ساری قوتوں اور طاقتوں کو نبی کے پیچھے لگا دیتا ہے۔ ان میں سے اتنا ہی حصہ خرچ کرتا ہے۔ جتنا نبی بتاتا ہے اور وہیں خرچ کرتا ہے۔ جہاں وہ کہتا ہے کہ خرچ کرو ا اور نبی اپنی طرف سے نہیں بلکہ اللہ کے حکم کے مطابق تعلیم دیتا ہے۔ مسلمان اس انسان کا نام ہے جو اپنی زندگی

کے حقیقی مقصد کو پہنچا ہے، اللہ تعالیٰ نبی کو اپنے قوانین دے کر بھیجتا ہے اور وہ انسانوں کے روبرو یہ اعلان کرتا ہے کہ اے انسانو تمہیں قانون بنانے کا کوئی حق نہیں۔ اللہ کے طرف سے حکم لانے والا میں ہوں اور میں یہ حکم لایا ہوں۔ کہ تم اپنی زندگی کو پوری طرح بدل دو اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔

ان عبدوا اللہ فاتقوہ واطیعون ۵

تم صرف اپنے اللہ ہی کی بندگی کرو اور زندگی کے ہر معاملے میں اسی کے حکم کی پیروی کرو۔

انفرادی زندگی سے لے کر اجتماعی اور بین الاقوامی زندگی کے مسائل میں بھی اللہ کے قانون کو قانون تسلیم کرو۔ انسان قانون کے بغیر دنیا میں زندگی بسر کر ہی نہیں سکتا۔ یا تو وہ اپنے جیسے انسانوں کے قانون کو مان لے۔ یا اللہ کے قانون کو۔ نبی کہتا ہے کہ انسانو کے قانون کو چھوڑ کر اللہ کے قانون کی طرف آؤ اور اپنی پوری زندگی کو مسلمان بناؤ۔ اس کے یہ معنی ہیں کہ۔ ہم نے مسجد میں نماز پڑھی اپنے دل کی مرضی کے مطابق نہیں بلکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بتائے ہوئے طریقہ پر۔ پھر مسجد سے باہر نکلے اور آپس میں لڑائی ہو گئی تو فیصلے کے لئے نہ تو سرکار کے پاس جانا چاہئے اور نہ ساہوکار کے پاس بلکہ اسی امام کی طرف متوجہ ہونا چاہئے جس کے پیچھے نماز ادا کی تھی جو اللہ اور رسول کے حکم کے موافق فیصلہ کرے گا۔ لیکن جو شخص مسجد میں تو اللہ کے قانون کا لحاظ رکھتا ہے اور جب بازار میں جاتا ہے تو کہتا ہے کہ میں مسجد میں مسلمان تھا اور یہاں بھی

اگر اللہ کے قانون کا پاس رکھوں۔ تو مجھے نقصان ہوجائے گا اس لئے میں اسی طرح بیوپار کروں گا جس طرح سامنے کا ہندو دوکاندار کرتا ہے۔ ایسا شخص کامل مسلمان نہیں ہوسکتا۔ مسلمان تو وہی ہے جو ہر وقت ہر جگہ ہر موقع پر قانون الٰہی کا پاس کرتا ہے۔ اور یہی ایک سچے مسلمان کا نصب العین ہے۔ آج ہم مسلمانوں میں مختلف خیال کے لوگ پیدا ہوگئے ہیں۔ بعضوں کا یہ خیال ہے کہ مسلمان ترقی میں دوسری قوموں سے بہت پیچھے رہ گئے ہیں اس لئے انھیں بھی ترقی کے میدان میں قدم بڑھانا چاہیئے۔ اور انھیں طریقوں کو استعمال کرنا چاہیئے جو دوسری قومیں استعمال کر رہی ہیں۔ خواہ وہ حلال ہوں یا حرام۔ مثلاً سود۔ بینکیں۔ جوّا۔ لاٹری وغیرہ۔ اور ہر وہ طریقہ استعمال کرنے کی ضرورت ہے جس سے غریب مسلمان مالدار ہوجائیں۔ دوسری طرف بعض مسلمان یہ کہتے ہیں کہ ہم علم میں بہت پیچھے ہیں۔ اس لئے جیسی بھی تعلیم ہو ہمارے اندر رائج ہونا چاہیئے۔ لیکن ایک حقیقی مسلمان کا نقطۂ نظر ان چیزوں سے بالکل الگ تھلگ ہوتا ہے

اللہ کی بادشاہت کا مفہوم

اب میں دوسری بات کی طرف آتا ہوں دیکھئے دنیا کی ساری چیزیں اللہ کی پیدا کی ہوئی ہیں۔ وہی ان سب کی تربیت کرتا ہے وہی ان کا بادشاہ ہے۔ اور پھر یہ بھی دیکھئے کہ یہ سب چیزیں اسی کی اطاعت اور فرمانبرداری میں لگی ہوئی ہیں۔ اللہ نے جس چیز کو جس کام کے لئے پیدا کیا ہے۔ برابر وہ اس کام کو انجام دے رہی ہے۔ لیکن انسان کی دو حیثیتیں ہیں پہلی یہ کہ وہ بھی اسی طرح اللہ کا

مطیع ہے جیسے پہاڑ۔ چاند، سورج ستارے وغیرہ وہ کسی چیز کو اٹھانا چاہے تو ہاتھ سے کام لیتا ہے۔ کہیں جانا چاہے تو پاؤں سے جاتا ہے۔ دیکھنا چاہے تو آنکھوں کا محتاج ہوتا ہے غرض اس حیثیت سے ایک انسان اور درخت میں کوئی فرق نہیں ہے۔ دوسری حیثیت یہ ہے جس کی وجہ سے انسان کو دوسری مخلوقات پر شرف حاصل ہے کہ اللہ نے اُسے اختیار دیا ہے وہ دیکھتا ہے۔ تو اُسے اختیار ہے۔ چاہے اچھی اور مباح شئے کو دیکھے چاہے بری اور حرام مثلاً اجنبی عورتوں کی طرف نظر بازی کرے۔ اگر کسی نامرد سے کہا جائے کہ زنا مت کرو تو یہ کوئی معقول بات نہیں ہوگی۔ بلکہ اس کا مخاطب وہی شخص ہو سکتا ہے جس کو زنا پر قدرت حاصل ہو۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ نے انسان کو اختیار دے کر کہا کہ یہ کر اور وہ مت کر تاکہ وہ دیکھے کہ انسان اللہ کی اطاعت کرتا ہے۔ یا نہیں۔ اگر کوئی خزانچی اپنے مالک کے خزانے کو خود اپنی ملکیت سمجھ لے تو اس کے محض سمجھ لینے سے وہ خزانہ کبھی اس کے قبضہ میں جائز طور سے نہیں آسکتا۔ ایسا ہی یہ ساری زمین اور اس میں جو کچھ ہے سب اللہ کا خزانہ ہے اس میں حکم اسی کا چلنا چاہیئے اگر کوئی اپنے آپ کو حاکم سمجھ بیٹھے تو یہ اس کی حماقت ہے۔ اور وہ کبھی جائز فرمانروا نہیں ہو سکتا جیسے آج جرمنی میں ہٹلر روس میں سٹالین امریکہ میں روزولیٹ اسی طرح جاپان انگلستان وغیرہ میں خود انسان اپنی حاکمیت کا دعویٰ کر رہا ہے۔ یہاں بعض بھائیوں کو یہ غلط فہمی ہوتی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ ان کو بادشاہ بنانے والا وہی اللہ تو ہے۔ ہاں بیشک اللہ ہی ہے مگر بات یہ ہے کہ اللہ ملک دے کر اپنے بندوں کو

آزماتا ہے کہ یہ زمین میں میری بادشاہت قائم کرتے ہیں یا اپنی؟ پھر جب اللہ کی مرضی کے خلاف یہ لوگ ملک کے اندر اپنا قانون جاری کرتے ہیں تو زمین میں فساد پھیلتا ہے۔ یہ جنگ جو ہو رہی ہے وہ ایک جنگل ہے جس میں چند بھیڑیئے جمع ہو گئے ہیں اور ایک دوسرے کو چیرنے پھاڑنے لگے ہیں تم پوچھو کہ اللہ کی حکومت کیسے ہوتی ہے؟ اس کی مثال وہ حکومت ہے جس کی بنیاد محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے ڈالی ہے اور خلفائے راشدین نے اس کو جاری رکھا۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ اپنی خلافت کے زمانے میں رات کے وقت اپنی رعایا کے حالات دیکھنے کے لئے شہر میں گھومتے ہیں اور اتفاق سے ایک گھر کے پاس پہنچکر سنتے ہیں کہ ایک ماں اپنی بیٹی سے کہہ رہی ہے کہ بیٹی دودھ میں پانی ملا دو۔ بیٹی جواب دیتی ہے۔ اماں جان! کیا تمہیں معلوم نہیں کہ خلیفہ نے اس کی ممانعت کر دی ہے؟ ماں کہتی ہے کہ اب خلیفہ کہاں ہے؟ تو بیٹی جواب دیتی ہے کہ خلیفہ نہیں تو وہ ذات تو دیکھ رہی ہے جس نے ان کو خلیفہ بنایا۔ حضرت عمرؓ اس کی اس بات سے خوش ہوتے ہیں۔ اس گھر پر نشان کر دیتے ہیں اور صبح کو اس لڑکی سے اپنے بیٹے عبداللہ کا نکاح کر دیتے ہیں۔ اس زمانے میں ہر جگہ امن اور چین تھا یہاں تک کہ حدیث نبوی کے مطابق صنعاء سے ایک بوڑھی عورت سونا اچھالتی ہوئی مکہ تک آ گئی اور کسی نے اس سے تعرض نہ کیا۔

یہ ہیں اسلامی حکومت کے برکات اور خصوصیات آج دنیا میں جتنی بادشاہتیں ہیں وہ سب انسانوں کی ہیں ایک زمانہ میں فرعون نے اپنی خدائی کا دعویٰ کیا تھا۔ اسی طرح آج بھی بہت سے فرعون پیدا

ہو گئے ہیں: اللہ کی ایک حکومت اور غیر اللہ کی مختلف حکومتوں کے کے درمیان موازنہ کرتے ہوئے حضرت یوسف علیہ السلام نے اپنے قیدی بھائیوں کے روبرو یہ وعظ فرمایا تھا۔

ءأرباب متفرقون خیر ام اللہ الواحد القہار۔

کیا بہت سے الگ الگ خداؤں کا تسلیم کرنا بہتر ہے یا کسی ایک اللہ کا اقرار جو اکیلا اور قہار ہے۔

غلبۂ دین حق کا طریقہ

تیسری بات یہ ہے کہ ایک مسلمان کا نصب العین معلوم ہو جانے کے بعد ہم پر یہ ضروری ہو جاتا ہے کہ اس کو حاصل کرنے کے لئے سب مل کر جدوجہد کریں۔ اس لئے کہ اللہ کی حکومت کو اللہ کی زمین پر قائم کر دینا کوئی ایسا چھوٹا موٹا کام نہیں ہے جو ایک ایک آدمی سے انجام کو پہنچ جائے۔ اس طرح مل جل کر کام کرنے کو جماعت کہتے ہیں۔ یہ گھڑی جو سامنے رکھی ہوئی ہے۔ اگر اس کے سارے پرزے الگ الگ کر دیئے جائیں تو یہ چل نہیں سکتی۔ اسی طرح اگر اسلام کے اجزاء کو الگ الگ کر دیا جائے تو۔ دنیا کو اس سے کوئی فائدہ نہیں پہنچ سکتا جارج برنارڈ شا جو یورپ کا مشہور مفکر ہے۔ کہتا ہے کہ اسلام کتابوں میں تو ہے مگر ہمیں دنیا میں کہیں چلتا پھرتا نظر نہیں آتا۔ تو ہم اس پر کیسے ایمان لائیں۔ ایسے ہی اور بہت سے صالح مزاج غیر مسلم ہیں جن تک ہم کو اسلام کی تبلیغ عملاً و علماً کرنی ہے۔ اسلام کا کام کرنا ہے تو اسلامی طریق پر کرنا چاہیے۔ یہ خوب یاد رکھئے کہ غیر اسلامی طریقوں سے اسلامی

مقصد کبھی حاصل نہیں ہوسکتا۔ اسلام کی محض زبانی تبلیغ کرتے رہنے سے کوئی فائدہ نہیں ہوسکتا۔ ضرورت ہے کہ اس کا عملی نمونہ پیش کیا جائے اگر یہ کام محض زبانی اور قلمی تبلیغ سے ہونے والا ہوتا۔ تو اب تک ساری دنیا کو مسلمان ہوجانا چاہیئے تھا۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ راہ بڑی دشوار اور خطرناک ہے۔ پھر ہم جیسے کمزور و ناتواں مسافر اس پر کیسے گامزن ہو سکتے ہیں۔ لیکن درحقیقت یہ احساس کمتری ہے ہمیں چاہیے کہ ایک طرف کمزوریوں کے ساتھ ساتھ ان زبردست قوتوں اور طاقتوں کا بھی خیال رکھیں۔ جو قدرت نے ودیعت کی ہیں۔ اور دوسری طرف اس ذات با جبروت و ملکوت پر ہماری نظر ہے جو مشکل کشا اور قادر و ہادی ہے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:۔

والذین جاھدوا فینا لنھدینھم سبلنا ہ

جو لوگ ہمارے لئے جدوجہد کریں گے۔ تو ضرور ہم ان پر اپنی راہ کے دروازے کھول دیں گے۔

قرآنی نصب العین

قوانینِ الٰہی کا عالمگیر غلبہ و اقتدار

یہ مضمون شیخ بشیر احمد بی۔اے معتمد "بیت الحکمت" لاہور کا ہے۔ اسے روزنامہ "ہلال" بمبئی نے ۱۲ اپریل ۱۹۴۵ء کی اشاعت میں "زمزم" لاہور سے نقل کیا تھا۔ مضمون مختصر ہونے کے باوجود جامع ہے آیۂ کریمہ ھُوَ الَّذِی اَرسَلَ رَسُولَہٗ بِالھُدیٰ وَدِینِ الحَقِّ لِیُظھِرَہٗ عَلَی الدِّینِ کُلِّہٖ "کو مرکز قرار دے کر لکھا گیا ہے جو حکومتِ الٰہیہ کا فکرِ مرکزی ہے۔

اطراف و جوانب میں جس صبح کے آثار نمودار ہو رہے ہیں خدا کرے وہ صبح صادق کے آثار ہوں۔

اسلامی فکر و نظر کا پھیلانا بھی مبارک ہے لیکن جس

فکر و نظر کی پشت پر جہاد و عمل کی قوت نہ ہو اس کی زندہ
نظریوں کے مقابلہ میں کوئی پوزیشن نہیں جن لوگوں کو
اللہ تعالیٰ نے اسلامی فکر و نظر کی فہم و پسند سے نوازا
ہے ان کا فرض ہے کہ وہ اُسے بروئے کار لانے کے لئے
قرآنی نصب العین کی جانب عملی پیش قدمی شروع کر دیں"

اجتماع انسانی میں تبدیلی پیدا کرنے کے دو اصول اب تک تسلیم
کئے گئے ہیں۔

(۱) ارتقاء۔

(۲) انقلاب۔

ان میں سے اوّل الذکر کا طریقہ کار یہ ہوتا ہے کہ تبدیلی پیدا
کرنے کا خواہش مند مبلغ اپنے خیالات پریس اور پلیٹ فارم سے
پیش کرتا ہے لیکن وہ اپنی تبلیغ کے اثرات کا جائزہ نہیں لیتا۔
یعنے وہ یہ معلوم کرنے کی کوشش نہیں کرتا کہ میری تقریریں لوگوں نے
توجہ سے سنی ان میں کس نے اس سے اختلاف کیا۔ اختلاف کے
اسباب کیا ہیں؟ اس کے شکوک وشبہات کس طرح دور کئے جائیں
جن لوگوں کو میرے خیالات سے اتفاق ہے ان کو آگے کیا کیا
جائے؟ وہ ان میں سے کسی ایک سوال کا جواب حاصل کرنے کی
بھی کوشش نہیں کرتا۔

یہ طریقہ بہت سہل ہے اس میں خطرات بالکل نہیں نہ کسی سے
لڑائی جھگڑا نہ تنظیم و تربیت کی دردسری نہ کسی سے مخاصمت و مخالفت

نہ حکومت سے مقابلہ نہ کسی پارٹی سے دشمنی۔ اگر دشمنی ہے بھی تو اس میں مجادلے سے آگے بڑھنے کی کوئی وجہ نہیں ہوتی کیونکہ اس قسم کی تقریریں ہمیشہ انفرادی طور پر ہوتی ہیں۔ اور اکیلے اکیلے فرد کو کسی سے مقابلے اور مقاتلے کا خیال تک نہیں آتا۔

اس کے برخلاف انقلاب کے اجزائے ترکیبی حسب ذیل ہوتے ہیں

(۱) مطمح نظر

(۲) جماعت بندی

(۳) لائحہ عمل

مطمح نظر کا مطلب یہ ہے کہ کوئی صاحب فکر اپنا فکر اتنا صحیح سمجھتا ہے کہ وہ اس فکر کو کسی اجتماعِ انسانی قائم کرنے کے لئے اپنی جان تک قربان کر سکتا ہے جب تک کوئی شخص اپنے فکر کو اتنا محبوب نہ سمجھے وہ فکر مطمح نظر اور نصب العین کے درجے تک نہیں پہنچ سکتا ہے اس کے لئے ضروری ہے کہ سب سے پہلے خود صاحب فکر اس فکر پر عامل ہو اور اپنا سب کچھ اس پر قربان کرنے کو ہر وقت تیار رہے۔

جماعت سے مراد ہے اس خاص نظریے یا فکر کے ماننے والوں کا اجتماع جن میں سے ہر ایک اس فکر یا نصب العین کی خاطر اپنا سب کچھ قربان کرنے کو تیار ہو۔ یہ فکر اتحاد جب کسی گروہ میں انتہا کو پہنچ جاتا ہے تو جماعت بن جاتی ہے۔ اس کے ارکان میں ہمدردی ہوتی ہے اور عمل کے لحاظ سے وہ سب ایک دوسرے کے مشابہ ہوتے ہیں بلکہ بعض بلند پایہ افراد میں تو اس اتحاد فکر کا ظہور اس قدر

زوردار ہوتا ہے کہ ان کی سوچ بچار کے نتائج بالکل مشابہ ہوتے ہیں یعنے ایک مسئلے کا حل جو الف سوچتا ہے وہی ب بھی سوچتا ہے اس وقت ان پر یہ مصرعہ صادق آتا ہے کہ ع

دل را بدل رہیست درین گنبد سپہر

لائحہ عمل | اس اتحادِ فکر کا ایک لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ جماعت کی اندرونی تنظیم مضبوط ہوتی ہے ان کا آپس میں مال و دولت میں کم از کم اس حد تک اشتراک ضرور ہوتا ہے کہ ان میں سے کوئی فرد بھی یہ برداشت نہیں کرسکتا کہ اس کا ساتھی بھوکا سوئے یا سردیوں میں کپڑے کی کمی کے باعث ٹھٹھرتا پھرے یا بیماری کے ایام میں دوا سے محروم رہے یا اپنے مشترک فکر کے متعلق کسی قسم کی ضروری معلومات میں جاہل رہ جائے وہ آپس میں کھاتے کھلاتے ہیں۔ ایک دوسرے کو لباس بہم پہنچاتے ہیں۔ ایک دوسرے کی تیمارداری کرتے ہیں اور بچوں سے بوڑھے تک سب اپنے مرکزی فکر کے متعلق ایک دوسرے سے انتہائی علم حاصل کرتے ہیں۔ جو شخص اس تعاون سے انکار کرتا ہے وہ اس جماعت کا فرد شمار نہیں ہوتا اسے یا تو متنبہ کیا جاتا ہے اور اس کے فرائض یاد دلا کر اس کی بجا آوری پر مجبور کیا جاتا ہے یا اگر وہ ناقابلِ اصلاح ہو تو اُسے کم سے کم خارج کر دیا جاتا ہے کسی شخص کے متعلق بچہ ہو یا بوڑھا عورت ہو یا مرد، تندرست ہو یا بیمار۔ یہ برداشت نہیں کیا جاتا کہ وہ جماعتی نصب العین کے خلاف کوئی کام کرے بلکہ اس نصب العین کے مطابق کام کرنے کا مطالبہ کیا جاتا ہے۔

چونکہ اس قسم کی جماعت اپنی ساخت کے اعتبار سے ایسی ہوتی ہے کہ وہ خاموش نہیں بیٹھ سکتی وہ تبلیغ کے ساتھ تنظیم بھی کرتی رہتی ہے۔ یعنے جو لوگ ان کے فکر کو مان لیں ان کو برادری میں شامل کر کے ایک کل کا جزو بنا لیا جاتا ہے اس لئے اس اجتماعی فکر کا اس کے مخالف فکر کے ساتھ تصادم ناگزیر ہو جاتا ہے۔ اس لئے انقلابی جماعت دو مختلف صورتوں میں دو مختلف طرز کی روش اختیار کرتی ہے۔

(۱) جب تک وہ ہجوم و حملہ کرنے کے قابل نہیں ہوتی حملہ آوروں کو طرح دیتی جاتی ہے۔

(۲) جب وہ اندرونی تنظیم سے .... مسلح ہو جاتی ہے تو وہ حملے کا جواب حملہ سے دیتی ہے یعنے جنگ کے لئے آمادہ ہو جاتی ہے اس کی پھر دو صورتیں ہوتی ہیں۔

(ا) کبھی تو انقلابی جماعت کا رہنما دفاع پر اکتفا کرتا ہے۔

(ب) کبھی وہ ہجوم یا حملے کو ضروری سمجھتا ہے تو حملے کا آغاز بھی کرتا ہے۔

مصالحت نہیں ہو سکتی!

انقلابی فکر کبھی دوسرے فکر کے ساتھ مصالحت نہیں کر سکتا۔ یعنی اس کے لئے یہ قطعاً ناممکن ہوتا ہے کہ وہ اپنے اصول کو ترک اور مخالف کے کسی اصول کو تسلیم کر کے صلح کرے۔ انقلابی فکر والے لوگ دو ہی چیزیں اپنے سامنے پاتے ہیں۔ کامیابی یا موت۔ ان کی لغت میں مصالحت کا لفظ نہیں پایا جاتا اس کا بدل اُن کے ہاں موت ہے اور بس۔

یہاں مذکورۂ بالا مسئلے پر پھر نظر ڈالیئے ارتقاء میں جنگ ہوتی ہی نہیں۔ وہاں صلح ہے اور مصالحت، وہاں نہ تنظیم ہے نہ اتحاد۔ اگر کوئی صاحبِ فکر اس طریق کو اختیار کرے تو مخالف حکومت اس کے خلاف مناسب طریقوں سے پروپگنڈہ کرکے اس کے فکر کے اثرات کو فنا کرتی رہتی ہے چونکہ کام انفرادی طریق سے ہوتا ہے۔ اور اجتماع و تنظیم کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔ اس لئے حکومت سے مقابلے اور مقاتلے کی نوبت ہی نہیں آتی۔ اس طرح عمل اور ردِ عمل کا سلسلہ جاری رہتا ہے اور بات وہیں کی وہیں رہتی ہے۔ ظاہر ہے کہ کسی فکر کو آگے بڑھانے کے لئے یہ طریقِ عمل قطعاً مفید نہیں ہو سکتا۔

اس کے برخلاف انقلاب میں اتحادِ فکر ہے۔ اجتماع ہے، تنظیم ہے۔ مقابلہ ہے مقاتلہ ہے۔ اور کامیابی یا موت یا شکست کی صورت میں بھی مصالحت نہیں۔ لین دین اور سودا بازی نہیں۔ موت سامنے نظر آنے کے باوجود فکر کی شہرت میں کمی نہیں۔ ظاہر ہے کہ صرف اس طریق کار سے کوئی فکر اجتماعِ انسانی میں جا گیر ہو سکتا ہے اور چونکہ کسی فکرِ زندگی کا انحصار اس کے غلبے پر ہے یعنی کوئی فکر زندہ ہی اسی صورت میں رہ سکتا ہے کہ وہ اجتماع میں غلبہ حاصل کرلے اس لئے انقلاب ہی کے ذریعے سے اسے غالب کیا جا سکتا ہے نہ کہ ارتقاء کے ذریعے سے۔

آیئے ہم اب دیکھیں کہ قرآنِ حکیم کیا کہتا ہے؟ کیا وہ ارتقائی طریق کار کا داعی ہے یا انقلابی طریق کار کا؟

قرآن حکیم کا نصب العین! ہمارے خیال میں انقلاب کی جو تشریح اوپر کی جا چکی ہے اس کے سمجھ لینے کے بعد یہ فیصلہ کرنا مشکل نہیں ہے کہ قرآن حکیم کیا چاہتا ہے ہم سہولت کی غرض سے قرآن حکیم کے مسئلے کو سوال وجواب کی شکل میں پیش کرتے ہیں۔

کیا قرآن کا کوئی نصب العین ہے؟ بیشک ہے اور وہ یہ کہ

هُوَ الَّذِي أَرْسَلَ رَسُولَهُ بِالْهُدَىٰ وَدِينِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهُ عَلَى الدِّينِ كُلِّهِ وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُونَ

یعنے خداوند تعالیٰ نے حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ہدایت اور دین حق دے کر صرف اس لئے بھیجا ہے کہ وہ اس طبعی اور حقیقی قانون کو جملہ مجموعہ ہائے قوانین پر غالب کر دے خواہ وہ لوگ جو قانون کے الگ الگ مصدر مانتے ہیں اس وحدانی مصدر کو ناپسندہی کیوں نہ کریں کیا یہ قرآن کا نصب العین نہیں ہے کیا وہ یہ نہیں چاہتا کہ اس کا قانون تمام قوانین پر غالب رہے اس کی حکومت سب پر فائق رہے۔ وہ غیر حکومت کو اپنے اوپر تو کیا اپنے برابر بھی نہیں مان سکتا اس لئے وہ مصالحت کر ہی نہیں سکتا۔

قرآن حکیم اور جماعت بندی کیا قرآن حکیم کوئی جماعت بنانا چاہتا ہے؟ لاریب۔ وہ کہتا ہے کہ

لَا تَجِدُ قَوْمًا يُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ يُوَادُّونَ مَنْ حَادَّ اللَّهَ وَرَسُولَهُ وَلَوْ كَانُوا آبَاءَهُمْ أَوْ أَبْنَاءَهُمْ أَوْ إِخْوَانَهُمْ أَوْ عَشِيرَتَهُمْ

اولئک کتب فی قلوبھم الایمان و ایدھم بروح منہ ویدخلھم جنت تجری من تحتھا الانھار خالدین فیھا رضی اللہ عنھم ورضوا عنہ اولئک حزب اللہ الا ان حزب اللہ ھم المفلحون ۝ (سورۃ المجادلہ = ۲۲)

"یعنے کوئی جماعت ایسی ہو ہی نہیں سکتی کہ خداوند تعالیٰ کی خوشنودی کو اپنا نصب العین اور ایمان بنائے اور یہ مان لے کہ مرنے کے بعد مجھے خدا کے سامنے حاضر ہو کر اپنے جملہ اعمال و افعال کی جوابدہی کرنی ہوگی پھر بھی وہ ان لوگوں سے قلبی محبت رکھے جو اللہ اور اس کے رسول سے دشمنی کرتے ہیں خواہ وہ لڑنے والے ان کے ماں باپ یا بیٹے یا بھائی یا عزیز و اقارب ہی کیوں نہ ہوں۔ یہ وہ لوگ ہیں جن کے دل میں ایمان کندہ ہو چکا ہے اور اللہ تعالیٰ اپنی خاص روح سے مدد دیا کرتا ہے یہ لوگ ایسے باغوں میں داخل کیئے جاتے ہیں جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں اللہ تعالیٰ ان کے اعمال سے خوش ہے وہ بھی خدا کے احکام کو پوری رضا و رغبت سے انجام دیتے ہیں یہ ہے خدا کی جماعت، یاد رکھو ہمیشہ خدا کی جماعت ہی کامیاب و کامراں ہوا کرتی ہے۔"

گویا خدا اور یوم آخرت کے فکر کے ماننے والے لوگ ایک جماعت بن جاتے ہیں، ایسے ہی اس کے خلاف کسی فکر کو ماننے والے لوگ ایک جماعت بن جاتے ہیں۔

ان کو بھی حزب (جماعت) کہا گیا ہے (المجادلہ ۱۹)
اس سے ظاہر ہے کہ "جماعت" الگ چیز ہے اور ان کا "فکر" الگ چیز ہے۔ ہر ایک فکر پر جماعت بن سکتی ہے۔ عام اس سے کہ وہ فکر اچھا ہے یا بُرا اگر اچھے فکر پر کوئی جماعت بنی ہے تو حزب اللہ ہے اور برے فکر پر بنی ہے تو حزب الشیطان ہے۔

قرآن حکیم اور تنظیم

کیا قرآن حکیم تنظیم چاہتا ہے؟ بیشک وہ جا بجا کافروں (قرآنی فکر کے دشمنوں اور مخالفوں) اور منافقوں (ڈھلمل یقین لوگوں) کو تنبیہ کرتا ہے ان کی علامات بیان کرتا ہے اور حزب اللہ کے کارکنوں کو ان سے الگ رہنے کی تلقین کرتا ہے۔ کیا یہ خالص قرآنی فکر کی تنظیم نہیں ہے؟ وہ فکر کو صاف رکھنے کے لئے نہایت سختی کے ساتھ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا حکم دیتا ہے یعنے جہاں کہیں کوئی ایسی بات نظر آئے جو قرآنی مرکزی فکر کے خلاف ہو اسے قوت کا استعمال کر کے روک دو (قوت کا استعمال کس طرح؟ کس حد تک اور کس طریق سے؟ یہ دوسرے سوالات ہیں جن کی تفصیل کا یہ موقع نہیں) اگر اس کا موقع یا ضرورت نہ ہو تو زبانی تنبیہ کرو اگر یہ بھی نہ ہو سکے تو کم سے کم خود اپنے دل میں ضمنی طور پر اس فکر کو برا سمجھو۔ یہ آخری حالت یقین و ایمان کی سب سے کمزور حالت ہے۔ کیا اس تبلیغ واشاعت سے ایک پاک باز جماعت پیدا نہ ہو جائے گی؟ کیا اس صورت میں بھی افراد الگ الگ کھچڑی پکائیں گے ہرگز نہیں وہ سب مل کر رہیں گے اور اپنے اجتماع کو ہر قسم کی فکر اور عمل کی برائیوں سے پاک

رکھیں گے۔

قرآن حکیم کا جنگ کے متعلق کیا حکم ہے؟

قرآن حکیم اور جنگ! اس کا جواب یہ ہے کہ جب تک وہ مکہ مکرمہ میں ہے اور داخلی تنظیم میں مصروف ہے وہ کہتا ہے کہ۔

(۱) واصبر علیٰ ما یقولون واهجرهم هجراً جمیلاہ (سورہ مزمل)

(۱) یعنے تیری تحریک کے خلاف یہ لوگ جو پروپگنڈا کرتے ہیں اس کی وجہ سے ہاتھا پائی کی نوبت نہ آنے دو بلکہ فی الحال ان کو بطریق احسن طرح دو۔

(۲) ومهلهم قلیلا (ایضاً: ۱۱)

لیکن طرح دینا تھوڑے عرصے ہی کے لیئے ہے۔

(۳) ذرنی ومن خلقت وحیدا۔ (مدثر: ۱۱)

ذرا مجھے اور اسے جسے میں نے پیدا کیا اور اب میرے قانون کا مخالف بن بیٹھا ہے تنہا چھوڑ دو یعنی تم فی الحال بیچ میں نہ آؤ۔

لیکن جب داخلی تنظیم باصطلاح حضرت امام ولی اللہ دھلوی خلافت باطنہ جو مکہ معظمہ میں پیدا ہوئی تھی جب اتنی مضبوط ہو جاتی ہے کہ حملہ کر سکے تو سورۂ انفال اور سورۂ توبہ میں قانونِ جنگ دے دیا جاتا ہے۔

بلکہ صاف اعلان کر دیا جاتا ہے کہ

فان لم تفعلوا فاذنوا بحرب من الله

ورسولہ (البقرہ : ۲۷۹)
یعنے جو لوگ سودی کاروبار سے باز نہیں آتے ان کے
خلاف باقاعدہ فوج کشی کا الٹی میٹم دے دو۔
غرض دونوں صورتوں میں دو طریق عمل ہیں جب تک جماعت
نہیں تیار ہو جاتی لڑائی نہیں ہو گی جماعت تیار ہو جاتی ہے تو لڑیگی
پھر یہ کمانڈر کے اختیار تمیزی پر موقوف ہے کہ وہ آگے بڑھ کر حملہ
کرے (جیسے حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جنگ خیبر
وغیرہ میں متعدد مواقع پر کیا) یا صرف دفاع پر اکتفا کرے جیسے جنگ
خندق وغیرہ)۔ (زمزم)

پیغمبر اسلام کا پیغام انقلاب

انسانی حاکمیت کی بجائے حکومتِ الٰہیہ کے قیام کی دعوت

ہندوستان کے مشہور حریت پسند اور قوم پرور مسلمان اخبار "مدینہ" بجنور نے اپنی ۱۱ ربیع الاول سنہ ۱۳۶۰ھ (۹ اپریل سنہ ۱۹۴۰ء) کی اشاعت میں "پیغمبر انقلاب۔ حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم" کے عنوان سے یہ افتتاحیہ شائع کیا تھا، یہ مضمون اس حقیقت کی مزید وضاحت کی غرض سے شریک کتاب کیا جا رہا ہے کہ "مدینہ" ہندوستان کی قومی تحریک اور قومی حکومت کے قیام کا حامی اور علمبردار ہے لیکن وہ بھی "حکومتِ الٰہیہ" پر اعتقاد رکھتا ہے۔ اور ہر طرح کی انسانی حکومت کو دنیا کے تجربات کی تاریخ کی روشنی میں انسانی آلام و مصائب کا

سرچشمہ سمجھتا ہے۔

انقلاب تاریخی اصطلاح میں وہ سیاسی، مجلسی اور اقتصادی تبدیلی ہے جو مروجہ نظام تمدن کو بدل کر ایک نیا نظام تمدن وجود میں لائے۔ انقلاب ہماری شہری زندگی کی ایک اہم ضرورت ہے ایک ایسی ضرورت ہے جو ہماری جماعتی زندگی کے بوسیدہ اور ناکارہ نظام کو بدل کر ایک امید افزا ضابطۂ اجتماع لے کر آتی ہے جب ہمارا قائم کیا ہوا نظام شہریت، سوسائٹی کا سیاسی، مجلسی اور اقتصادی توازن برقرار رکھنے میں ناکام ہو جاتا ہے اور اس ابتری کے نتیجہ میں مخصوص طبقہ کا تسلط قائم ہو جاتا ہے، خود ہمارے مرتب کئے ہوئے آئین اور ضابطے سوسائٹی کے امن، ترقی، اور خوشحالی کے لئے وبال بن جاتے ہیں تو دلوں میں ایک خوشگوار تبدیلی کی خواہش پیدا ہوتی ہے۔ اس فرسودہ نظام سے بغاوت کے لئے جذبات میں ایک ہیجان، شدت اور تسلسل کے آثار نمایاں ہوتے ہیں۔ مجبوریاں، ضرورتیں اور حالات کی ناسازگاری ہمیں اس کی شکست وریخت کے لئے اُبھارتی ہیں تاہم اُس کو تباہ کرنے کے لئے ہم فوری طور پر آمادہ نہیں ہو جاتے، ایسے نظام کی تباہی بھی ہمارے لئے گراں گزرتی ہے جس سے ہم نے اتنے دنوں محبت کی ہے اور جس سے ایک عرصہ تک ہماری زندگی وابستہ رہ چکی ہے۔ اندرونی طور پر طبقاتی کشمکش بڑھ جاتی ہے جو بہت مرتبہ ایک ہولناک تصادم کی صورت میں ظاہر ہوتی ہے تقاضائے ضرورت ہماری فطری قدامت پرستی اور طبقاتی مفاد کی

ایک زبردست کشمکش کے بعد انقلاب آتا ہے جو سائٹی کو ازسرِنو منظم کرکے ہمارے لئے ایک اطمینان آفریں مگر عارضی نظامِ تمدن قائم کر دیتا ہے۔ ہماری اقتدار پرستی آہستہ آہستہ اس نئے نظام میں اپنے لئے ایک راہ پیدا کر لیتی ہے زندگی میں پھر اختلال کے آثار ظاہر ہونے لگتے ہیں اور انقلاب کا تدریجی عمل پھر شروع ہو جاتا ہے انقلاب کا یہی تسلسل اور تواتر ہے جو ہماری تمدنی تاریخ کا طغرائے امتیاز ہے۔

انقلابات کی ناکامی

ہماری روایت پرستی کے نتیجہ میں ہر نئی تبدیلی بنیادی تصور کے لحاظ سے پرانے ضابطۂ حیات سے مختلف نہیں ہوتی۔ شہری زندگی کی رفاہیت اطمینان اور امن کے لئے ہم جو خاکہ بھی مرتب کرتے ہیں اس میں قدرتی طور پر ہمارے قدیم تصورات کا شائبہ ہوتا ہے اس طرح ایک کامیاب نظامِ زندگی کا خاکہ مرتب کرتے ہوئے ہم غیر شعوری طور پر اس کی ناکامی کی بنیاد رکھ دیتے ہیں اور ہر وہ انقلاب نتیجہ کے اعتبار سے ناکام ہو جاتا ہے جو کامیابی کی خوشگوار توقعات کے ساتھ لایا گیا تھا۔

تمدن کی تاریخ میں جتنے بھی انقلابات آئے اُن کی بنیاد ایک ہی تصور پر قائم کی گئی تھی۔ انسان کی حاکمیت کا تصور کسی نہ کسی شکل میں ان تبدیلیوں کے خمیر میں شامل تھا۔ افراد کی حاکمیت کے دور میں ایک عرصہ تک ہم شخصیتوں کی تبدیلی میں شہری زندگی کا امن وسکون تلاش کرتے رہے لیکن جب صدیوں کی جفاکشی کے بعد

ہم نے محسوس کیا کہ بادشاہت بجائے خود ہمارے مصائب کا سرچشمہ ہے تو افراد کے بجائے قوت واختیار جماعت کی طرف منتقل کر دیا گیا جمہور کو طاقت واختیار کا مرکز قرار دیا گیا۔ بادشاہ کی جگہ صدر جمہوریت کو دی گئی اور وزراء وارکان پارلیمنٹ نے قدیم مشیروں کی جگہ حاصل کر لی۔ لیکن اس نئے تجربہ میں بھی انسانیت کی خودنگری اور اقتدار پرستی کے رجحانات موجود تھے۔ حاکمیت کا حق انسانوں ہی کے لئے تسلیم کیا گیا تھا۔ ایسے انسان جو اپنی نفسی خصوصیات کے اعتبار سے قدیم بادشاہوں سے مختلف نہ تھے اور اسی کا نتیجہ ہے کہ آج جمہوری انقلاب بھی انسانیت کو ایک مکمل اور آخری ضابطۂ حیات دینے میں ناکام ہو چکا ہے۔

اسلام کا انقلابی تصور

اسلام نے سب سے پہلے دنیا کو ایک ایسے مکمل اور ہمہ گیر انقلاب کا تصور پیش کیا جو نہ صرف زندگی کے تمام شعبوں سے ظالمانہ نظامات کو ختم کر دینا چاہتا تھا بلکہ اُس نے ایک مکمل ذہنی انقلاب کو اپنا نصب العین قرار دیا۔ اسلام نے ہماری ناکامیوں کی حقیقی علت کو پا لیا اور اس دنیا کی ان تمام پچھلی روایات اور تصورات سے بالکل مختلف جو نسلی اور موروثی طور پر انسانی ذہنیت پر مُسلط تھے انسانیت کے فلاح وبہبود کے لئے ایک نیا تصور پیش کیا۔ اسلام نے انسانیت سے بلند تر ایک وجود کی غیر مسئول اور مطلق حاکمیت کا اعلان کر کے انسانی حاکمیت کے ان تمام تصورات کو باطل کر دیا جو انسانی ضابطۂ اجتماع کی بنیاد قرار دئے گئے تھے اور جو انسانوں

—— کے مصائب اور فساد اجتماع کا سرچشمہ تھے۔

وھو الغفور الودود ذو العرش المجید فعال لما یرید ہ (بروج)

وہی غلطیوں کو معاف کرنے والا صاحب عرش اور بزرگ و برتر ہے اور اپنی ہر مرضی اور ارادہ کو مکمل طور پر نافذ کرنے پر قدرت رکھتا ہے۔

لا یسئل عما یفعل وھم یسئلون

اپنے افعال میں وہ بالکل غیر مسئول اور انسانوں سے ان کے افعال کا محاسبہ کیا جائے گا۔

ان الحکم الا للہ امر ان لا تعبدوا الا ایاہ۔

حکم اور حاکمیت اللہ کے سوا کسی کے لئے نہیں ہے اس نے حکم دیا ہے کہ اس کے سوا تم کسی کی پوجا نہ کرو

اسلام نے انسانیت کو اپنا نصب العین قرار دیا انسانیت کی فلاح امن اور اطمینان کو خدا کا مقصد اور خدا کا راستہ قرار دیا۔ اس نے ان طبقات اور جماعتوں کے اجارہ کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا جو اپنے غلبہ اور تفوق کو برقرار رکھنے کے لئے دنیا کے امن اطمینان اور فارغ البالی کے ٹھیکے دار بنے ہوئے تھے۔

لا تطع من اغفلنا قلبہ عن ذکرنا واتبع ھواہ۔

اس شخص کی پیروی نہ کرو جس کے دل کو ہم نے اپنی

یاد سے غافل کر دیا ہے اور جو اپنی خواہشات کا بندہ ہے

الا لعنة الله علی الظالمین الذین یصدون عن سبیل الله ویبغونها عوجا وقاتلوا ھم حتی لا تکون فتنة ویکون الدین کله لله ان لا تفعلوه تکن فتنة فی الارض وفساد کبیر ہ

اللہ کی لعنت ہو ان ظالموں پر جو اللہ کے راستہ میں رکاوٹیں ڈالتے ہیں اور اسے ٹیڑھا کرنا چاہتے ہیں۔ ان سے جنگ کرو یہاں تک کہ فتنہ ختم ہو جائے اور اطاعت مکمل طور پر صرف خدا کی کی جائے۔ اگر تم ایسا نہ کروگے تو زمین میں ایک زبردست فتنہ و فساد برپا ہو جائیگا۔

انا انزلنا الیک الکتاب والمیزان لیقوم الناس بالقسط ہ

ہم نے اتارا تمھاری طرف قانون اور انصاف تاکہ انسان ایک مساویانہ اور متوازن نظام زندگی قائم کریں۔

اسلام کا یہ انقلابی تصور کسی ایک گروہ، طبقہ اور جماعت تک محدود نہیں تھا اس نے رنگ، نسل، تاریخ، زمین، فضا، اور ماحول کی تمام تقسیموں اور تفریقوں کو نظر انداز کر کے براہِ راست انسان کو مخاطب کیا۔ اس نے ایک عادلانہ ضابطۂ اجتماع کی طرف

تمام انسانوں کو یکساں دعوت دی۔

یا ایھا الناس اعبدوا ربکم الذی خلقکم تعالوا الی کلمۃ سواء بیننا وبینکم ان لا نعبد الا اللہ ولا نشرک بہ شیئا ولا یتخذ بعضنا بعضا اربابا من دون اللہ

لوگو! اپنے رب کی اطاعت کرو، جس نے تمھیں پیدا کیا ہے آؤ! ہم سب ایک بات پر جمع ہو جائیں جو ہمارے اور تمھارے درمیان یکساں ہے وہ یہ کہ خدا کے سوا ہم کسی کی بندگی نہ کریں اور خدائی میں کسی کو خدا کا شریک نہ ٹھیرائیں۔ اور ہم میں سے کوئی کسی کو اللہ کے سوائے رب نہ بنائے۔

اسلامی انقلاب کی ناکامی

اسلام کی دعوت انقلاب کے یہ تھے وہ بنیادی اصول جنھوں نے ظلم و فساد کی ان تمام راہوں کو مسدود کردیا جو تمدن کی ناکامی اور انسانوں کی نہ ختم ہونے والی بے چینی اور مصیبتوں کا حقیقی سبب تھے پیغمبر انقلاب حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے انہی اصول پر ایک نظام تمدن کی بنیاد رکھی اور انسانی تاریخ کو سب سے پہلے اور سب سے آخر ایک ایسے ضابطۂ اجتماع سے متعارف کرایا جس نے انسانیت کے حقیقی نصب العین کی طرف رہنمائی کی اور مظلوم و مقہور انسانوں کو ظلم و فساد، غلامی اور ناجائز انتفاع کی مصیبتوں سے نجات کا پیغام سنایا۔

یہ صحیح ہے کہ اسلام کا لایا ہوا انقلابی نظام بھی زیادہ عرصہ تک قائم نہ رہ سکا اور دنیا کے دوسرے انقلابات کے مقابلے میں اسلام کا نظام بھی زیادہ پائدار ثابت نہ ہو سکا لیکن اسلام کے صحیح انقلابی نظام زندگی کی تباہی اس کی ناکامی کی بناء پر نہیں تھی۔ یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ اسلام کے خلاف دنیا میں اس نقطۂ نظر سے کبھی کوئی باغیانہ خیال پیدا نہیں ہوا کہ وہ انسانوں کو ایک صحیح نظام تمدن عطا کرنے میں ناکام ثابت ہوا ہے۔ خلافت راشدہ کا صحیح اسلامی نظام اس لئے ختم نہیں ہوا کہ جمہور نے اس کے جبر و ظلم اور ناجائز انتفاع کے سیاسی، اقتصادی یا معاشری دباؤ سے مجبور ہو کر اس کے خلاف بغاوت کی تھی بلکہ انسانی فکر و عمل کی غلط کاری نے خدا کی حاکمیت کے تصور میں انسانی اقتدار اور حقِ حکمرانی کا پیوند لگانے کی کوشش کی اور زندگی کا وہ الٰہی نظام جس سے دنیا خلافت کے نام سے متعارف ہوئی تھی ملوکیت میں تبدیل ہو گیا۔ تاہم چونکہ اپنے فکری پس منظر کے اعتبار سے مسلمانوں کی ملوکیت دنیا کے شاہانہ نظام سے مختلف تھی اس لئے دنیا ایک عرصہ تک مسلمانوں کے شاہی نظام میں بھی تمدن صالح کے آثار دیکھتی رہی۔

دعوت انقلاب

آج دنیا پھر ایک غیر صالح نظام تمدن کے مصائب برداشت کر رہی ہے۔ رنگ و نسل کے امتیاز نے زندگی کو ایک جہنم بنا دیا ہے جغرافیائی حد بندیوں نے انسانیت کو متصادم گروہوں میں تقسیم کر دیا ہے۔

جمہور اور غالب طبقوں کی کشمکش نے ایک خوفناک صورت اختیار کر لی ہے دنیا کے ایک نئے نظام کے لئے جمہور کی طلب اپنی آخری منزل تک پہنچ گئی ہے۔ ہمارے موجودہ نظام تمدن کی تبدیلی ناگزیر ہو چکی ہے اور انقلاب روز بروز ہم سے قریب تر ہوتا جا رہا ہے۔ لیکن کیا آنے والا انقلاب ہماری ضرورت اور بے چینی کی آخری تکمیل ثابت ہو سکے گا؟

اگر دنیا نے اپنے تجربات کو دہرایا اور اس ناکام تخیل کو پھر اپنانے کی کوشش کی جو آجتک انسانی ترقی کی ہموار شاہراہ میں حائل ہوتا رہا ہے تو آنے والا انقلاب یقیناً ہماری ضروریات کو پورا نہیں کر سکے گا۔ جماعتی اقتدار پرستی کا وہ نصب العین جو آجتک ہمیں محبوب رہا ہے دنیا کا نظام قائم کرتے وقت ہماری نگاہوں سے اوجھل نہیں رہے گا اور آنے والا انقلاب بھی بنیادی طور پر اس تصور سے مختلف نہیں ہوگا جو اب تک دنیا کے غیر الہامی انقلابات میں کارفرما رہا ہے ممکن ہے اس نئی تبدیلی میں ہم ایک عارضی سکون حاصل کر لیں لیکن انجام کے لحاظ سے انسانیت کی بدقسمتی پہلے سے کچھ زیادہ مختلف نہیں ہو گی۔

آؤ ہم سب انسان ملکر انسانیت کی بیڑیاں کاٹ دیں خدا کی بادشاہت میں ایسا انسانیت گیر اور اطمینان بخش نظام قائم کریں جو ہماری عافیت اور ترقی کی آخری ضمانت ہوگا۔ ایک پیغمبر انقلاب کی رہنمائی میں آدم کے مظلوم بیٹوں کے لئے ایک امن آفریں انقلاب لے کر آئیں۔ اس پیامبر انقلاب کی رہنمائی میں

جس نے ہمیں زندگی کا ایک بلند و برتر نصب العین عطا کیا ایک جامع اور مکمل انقلابی نظام دیا جس نے ہمیں الٰہی حاکمیت سے متعارف کرایا اور ہماری پراگندہ جماعتوں کو فکری اور عملی وحدت بخشی۔

اے محسن انسانیت دنیا تیری منت پذیر ہے۔
تجھ پر درود و سلام!

اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰى سَيِّدِنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدٍ وَّ عَلٰى اٰلِهٖ وَصَحْبِهٖ وَبَارِكْ وَسَلِّمْ ۝

مدینہ کے مضمون پر اک نظر

مدینہ کے مضمون کا خلاصہ یہ ہے۔

(۱) انسان کے تمام آلام و مصائب، کا بنیادی سبب انسانی نظام حیات اور انسانی حاکمیت کا تصور ہے۔

(۲) انسان نے آلام و مصائب سے نجات حاصل کرنے کے لئے بار بار انقلابات کئے لیکن اسے نجات نہ مل سکی، اس لئے کہ انسانی حاکمیت کا تصور جو تمام مصیبتوں کا سرچشمہ تھا ہر آنے والے انقلاب کی تہ میں موجود تھا۔

(۳) حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایسے انقلاب کا پیغام لے کر مبعوث ہوئے جو انسان کے لئے سرتاسر رحمت و نجات تھا۔ اس لئے کہ اس انقلاب کی بنیاد انسانی فکر و عمل اور انسانی حکومت کی بجائے الٰہی حاکمیت پر تھی۔

(۴) دنیا کے دوسرے نظاموں کی طرح یہ نظام بھی بہت

دنوں تک قائم نہ رہ سکا۔ لیکن اس کی وجہ یہ نہ تھی کہ دوسرے نظاموں کی طرح اس میں بھی کمزوریاں تھیں۔ انسان نے محض نفس پرستی کی بناء پر اس سے بغاوت کرکے ملوکیت اختیار کرلی۔

(۵) اب بھی دنیا کی نجات وفلاح کی واحد صورت یہی ہے کہ ہادیٔ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی رہنمائی میں انقلاب کا علم لے کر اٹھے اور انسانی حکومت کا تخت الٹ کر خدا کی حکومت قائم کر دے

"مدینہ" کی یہ دعوت کتنی حقیقت افروز اور سعادت آموز ہے لیکن سوال یہ ہے کہ جب "مدینہ" کی تمام جد وجہد حکومتِ الٰہیہ کے قیام کی بجائے قومی حکومت کے قیام کے لئے وقف ہے جس میں مسلمانوں کو کتنے ہی حقوق حاصل ہوں بہرحال وہ انسانی حکومت ہوگی تو "مدینہ" کی اس دعوت کے کیا معنی ہوں گے جو وہ حکومت الٰہیہ کے قیام کے لئے دنیا کو دے رہا ہے؟ دنیا کی شاید یہ سب سے زیادہ عجیب بات ہے کہ مسلمان قبول تو کرتے ہیں کہ اسلام کا نصب العین حکومتِ الٰہیہ ہے مگر ان کی کوششیں صرف ہو رہی ہیں انسانی حکومتوں کے قیام و بقا کے لئے کیا مسلمان اپنی اس "بے دینی" اور "بے اصولی" سے جلد باز نہ آئیں گے؟

زمامِ قیادت کے مستحق کون لوگ ہیں؟
جن کا مقصدِ زندگی اطاعتِ خدا ہو

۱۹۴۵ء

مولانا محمد عثمان فارقلیط مدیر "زمزم" لاہور نے ۱۹ اگست کے زمزم میں "سیاسی خداؤں کی دنیا ——— انسانی برادری کے لئے ایک لمحہ فکریہ" کے عنوان سے یہ ادارتی مضمون لکھا ہے، مولانا فارقلیط جمعیتہ العلماء کے حامی ہیں۔ اور جمعیتہ العلماء ہندوستان میں قومی حکومت کے قیام کے لئے ساعی ہے۔ اس حکومت کا قیام جیسے افراد و عناصر سے وجود میں آئے گا اس کے پیش نظر کیا یہ ممکن ہے کہ ہندوستان کی قومی حکومت دنیا کی دوسری حکومتوں کے برعکس خدا کی اطاعت گزار ہو؟ مولانا فارقلیط نے انسانی برادری کو جس غور و فکر کا مشورہ دیا ہے اس پر خود ان کو عمل پیرا ہونا چاہیئے، مولانا نے قرآن مجید

کی آیت کی رو سے بتایا ہے کہ صالح اور عادلانہ نظام وہی لوگ قائم کر سکتے ہیں، جو نماز وزکوٰۃ کا نظم قائم کرنے والے ہوں اور یہ وہی لوگ ہو سکتے ہیں جو اللہ و رسول پر ایمان رکھتے ہوں۔ ملحدین ومنکرین کا یہ کام نہیں۔ مولانا کا مشورہ یہ ہے کہ "زمامِ قیادت ایسے لوگوں کے ہاتھوں میں سونپی جائے جو اپنے کو مسئول اور جوابدہ سمجھیں جو صالح ہوں اور صالح نظام کا قیام عمل میں لائیں اور جن کی زندگی کا مقصد خدا کی اطاعت، مخلوق کی خدمت، انصاف کا قیام اور صلح وامن کی اشاعت ہو" دوسرے لفظوں میں مولانا فارقلیط انسانی برادری کو حکومتِ الٰہیہ کے قیام کا مشورہ دے رہے ہیں، لیکن دنیا نے ایسا کب کیا ہے کہ اپنے ہاتھ کی زمامِ حکومت دوسرے کسی کے ہاتھ میں سپرد کر دے جو آج مولانا کے مشورے پر عمل کرے گی؟ اس کے لئے تو قومی حکومت کی راہ سے ہٹ کر قرآنِ کریم اور اُسوۂ نبوی کے بتائے ہوئے نقشے کے مطابق سعی وقربانی کرنی پڑے گی۔

چھ سال کی کشمکش اور مزاحمتوں کے بعد آخر یہ دن دیکھنا نصیب ہوا کہ جاپان نے شکست کھائی اور جرمنی کی طرح اُسے بھی جنگ کے خوفناک انجام سے دوچار ہونا پڑا۔ جرمنی گرا، ہٹلر گیا، اور پھر جاپان کی باری آئی اور خدا خدا کر کے وہ عذابِ الیم ہم دوں سے ٹلا جو چھ

سال سے بھوک و برہنگی، قحط اور گرانی، فوجی قوانین اور ہنگامی دار و گیر کی شکل میں دنیا پر نازل ہو رہا تھا۔ اب چند ہی دن جاتے ہیں کہ جنگ کے خاتمے کا باقاعدہ اعلان ہوگا، امن اور صلح کا بگل بجے گا فاتحین اکڑی ہوئی گردنوں کے ساتھ دنیا کو خوشحالی، مساوات اور جمہوریت کا پیغام سنائیں گے دکھی اور مضطرب دنیا کو چھ سال سے جنگ کے خاتمے کا انتظار تھا.............. اب نتائج وعواقب کا انتظار ہے اور شائد مستقبل قریب ہی میں معلوم ہو جائیگا۔ کہ نہان خانۂ غیب سے کیا ظہور میں آتا ہے؟

سوال یہ ہے کہ

(۱) کیا واقعی دنیا میں امن و امان قائم ہوگا اور انسان جس چیز کی تلاش میں سرگردان ہے وہ اسے حاصل ہو جائے گی؟

(۲) کیا دنیا کی ان بڑی طاقتوں کی جن کے ہاتھ میں زمامِ قیادت ہوگی، نیت بخیر ہے؟ کیا ان میں صالح اور عادلانہ نظام قائم کرنے کی صلاحیت ہے؟ کیا ان کے اندر یہ حقیقی خواہش ہے کہ نوعِ انسان کو خوشحالی، مساوات اور آزادی کی دولت ملے؟

(۳) اگر حکمران اور مقتدر طاقتیں یہ چاہیں بھی کہ دنیا میں ایک پاکیزہ فضا پیدا ہو، ایک صالح نظام قائم ہو ایک اجتماعی اور تعمیری امن کی بنیاد پڑے تو کیا ان کے پاس ایسے ذرائع اور وسائل موجود ہیں کہ وہ اپنی اس نیک خواہش کو عملی جامہ پہنا سکیں اور دنیا ان کی پاک نفسی کا ثمر پائے؟

یہ تین سوال ہیں اور ہمیں افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ

تینوں کا جواب نفی میں ہے! پہلے اور تیسرے سوال کا تمام تر انحصار دوسرے سوال پر ہے اور یہی ایک ایسا سوال ہے جس پر ٹھنڈے دل متوازن دماغ اور غیر جانبدار انصاف کے ساتھ ہر انسان کو غور کرنا چاہیئے۔

طاغوتی فساد ہم صاف صاف کہہ دینا چاہتے ہیں اور اسلام کی روشنی میں ہم یہ فیصلہ کرنے پر مجبور ہیں کہ آج جن قوموں کے ہاتھ میں طاقت ہے اور جو دنیا کی قسمتوں کا فیصلہ کرنے کی مختار ہیں، جن کا دنیا کی معیشت و معاشرت کے جملہ وسائل پر قبضہ ہے، جو دنیا کی تہذیب و تمدن کی اجارہ دار ہیں اور انسانی افکار و خیالات پر جن کا پورا کنٹرول ہے، حتیٰ کہ مذہب و اخلاقیات کے نقشے بنانے اور بگاڑنے میں جنھیں پورا دخل حاصل ہے ضمیر و اخلاق مذہب و ایمان کی عدالت میں باغی ہیں اور اسلام کی زبان میں ان ہی کو طاغوت، مفسدین فی الارض فساق و فجار اور فریق فی السعیر وغیرہ مختلف ناموں سے پکارا گیا ہے۔ جب تک ایسے لوگوں کے ہاتھوں میں انسانی نظام حیات کی باگ ڈور رہے اور وہ قادر مطلق خدا بن کر اپنے شیاطینی قوانین دنیا میں نافذ کرتے رہیں گے۔ کائنات کے کسی گوشے میں امن و انصاف قائم نہ ہو سکے گا اور انسان کی اجتماعیت کو کبھی اطمینان کا سانس لینا نصیب نہ ہوگا، اسلام کہتا ہے کہ نظام عدل اور پائیدار امن ان صالحین اور پاکیزہ نفوس کے ذریعے قائم ہوگا جو قانون الٰہی کے تابع ہوں گے جو اپنے آپ کو ایک

بالاتر ہستی کے سامنے جوابدہ سمجھیں گے، جو اپنی ذمہ داریوں کا احساس کر کے انسان کے نظام زندگی کو مکارم اخلاق، تزکیۂ نفس اور خیرات وصالحات کے سانچے میں ڈھالیں گے، لیکن آج جن بدقسمت انسانوں کے قبضے میں ہماری زندگی ہے۔ ہمارے خیالات وافکار ہیں، ہمارے حواس خمسہ اور ذہنی صلاحیتیں ہیں ان کا کافرانہ اور فاسقانہ وجود دنیا کے تمام مفاسد کا سرچشمہ بن چکا ہے۔ وہ امن کے لئے خطرہ ہیں، وہ خوشحالی اور آزادی کے لئے خطرہ ہیں، معاشرت ومعیشت کے لئے خطرہ ہیں! پھر ایسے لوگوں سے یہ امید رکھنا کہ وہ دنیا میں ایک نئے نظام کی طرح ڈالیں گے یا ان کے ذریعے دنیا کو امن وراحت، امن وخوش حالی کی دولت ملے گی ایک ایسی امید ہے جس سے ایک فریب خوردہ دماغ ہی مطمئن ہوسکتا ہے!

صالحین اور مفسدین

یہ تو قرآن ہی ان لوگوں کی نشاندہی کرتا ہے جو دنیا میں صالح اور عادلانہ نظام قائم کریں گے۔

الذین ان مکنٰھم فی الارض اقاموا الصلوٰۃ واٰتوا الزکوٰۃ وامروا بالمعروف ونھوا عن المنکر ۔

جن لوگوں کو زمین میں قیام وثبات ملتا ہے ان کا پروگرام یہ ہے کہ وہ نماز قائم کرتے ہیں (تاکہ نفس کی جلا ہوتی رہے) اور زکوٰۃ ادا کرتے ہیں (تاکہ

زبردستی کی جڑ کٹتی رہے) اور اچھی باتوں کا حکم کرتے ہیں (کہ نیکی اور بھلائی اور تعاون کا واحد ذریعہ یہی ہے) اور بری باتوں سے روکتے ہیں (کہ اس کے سوا قیام امن کی کوئی صورت نہیں)۔

آخر تمھیں دنیا کے حکمرانوں سے کس بات کی توقع ہے؟ کیا تم سمجھتے ہو کہ یہ لوگ تمھیں خدا پرستی اور نیک عملی کی راہ پر چلائیں گے؟ ورانحالیکہ گشتی قحبہ خانے اور تحریک شر انجانے ان کا پیچھا میدان جنگ میں بھی نہیں چھوڑتے! تو پھر کیا ان حکمرانوں کو تمھاری اقتصادی حالت درست کرنے کا خیال ہے؟ کیا ان کی خواہش یہ ہے کہ تمھارا معیار زندگی بلند ہو اور تمھیں دونوں وقت پیٹ بھر کر روزی ملے گی؟ اگر یہ بات ہوتی تو پہلی اور دوسری جنگ کی ضرورت ہی پیش نہ آتی تم کہو گے وہ دنیا کو آزاد دیکھنا چاہتے ہیں اور مساوات وجمہوریت سے انھیں محبت ہے اگر یہ سچ ہے تو تم کیوں غلام ہو؟ ایشیا غلامی کی چوٹوں سے کیوں کراہ رہا ہے اور دنیا کے اہم ناکوں پر کروڑوں فوج کس لئے تیغ وسپر کا مظاہرہ کر رہی ہے؟ تم ہزار باتیں بناؤ نتیجہ سب کا ایک ہے کہ جبتک خدا کی زمین ان مفسدین سے پاک نہ ہوگی اس وقت تک جمعیت بشری کو حقیقی راحت میسر نہیں ہوسکتی!

دنیا کے مصائب کا آخری حل

اسلام نے طاغوتی طاقتوں کا خطرہ شدت کے ساتھ محسوس کیا ہے اس کی نگاہ میں ان اشرار کی پیدا وار تمام مصائب اور تباہیوں کی ذمہ دار ہے۔

إن تذرهم يضلوا عبادك ولا يلدوا إلا فاجرا كفارا۔

اگر ان اشرار کی رسی ڈھیلی چھوڑ دی گئی تو وہ خدا کی مخلوق کو گمراہ کر دیں گے اور ایسی نسل چھوڑ جائیں گے جس کا کام فسق و فجور اور کفر و ضلالت کے سوا کچھ نہ ہوگا!

پس اسلام یہ چاہتا ہے کہ جو لوگ قادر مطلق خدا بن کر زمین پر فساد مچائیں اخلاق و روحانیت کا تخم فنا کر ڈالیں معیشت کے وسائل کو اپنے اغراض کے لئے استعمال کریں خدا پرستی کے بجائے نفس اور قوم پرستی کی، حق و انصاف کے بجائے ظلم و جور کی، حسن عمل کے بجائے بدعملی اور بدکاری کی، وحدت کے بجائے تفریق و تخریب کی اشاعت کریں۔ انھیں طاقت و فرمانروائی، اقتدار اور شہنشاہی سے یکسر محروم کر دیا جائے اور زمام قیادت ایسے لوگوں کے ہاتھوں میں سونپی جائے جو اپنے آپ کو مسئول اور جوابدہ سمجھیں جو صالح ہوں اور صالح نظام کا قیام عمل میں لائیں اور جن کی زندگی کا مقصد خدا کی اطاعت، مخلوق کی خدمت، انصاف کا قیام اور صلح و امن کی اشاعت ہو! اگرچہ یہ انقلاب مشکل ہے اور بہت مشکل مگر دنیا کے مصائب کا یہی آخری حل ہے اور اسی حل پر دنیا کی ترقی اور خوشحالی کا انحصار ہے تم جب تک چاہو موجودہ حکمرانوں کو برداشت کرتے رہو مگر یہ توقع مت کرو کہ خدا کے ان دشمنوں کے ذریعے دنیا کو چین اور امن نصیب ہوگا اور دنیا کی بڑی طاقتیں جنگ سے فارغ ہو کر کوئی صالح نظام اور کوئی پاکیزہ دستورِ حیات مرتب کر سکیں گی۔

تحریکِ حکومتِ الٰہیّہ کے اصول و مناہج

تعارف: یوں تو حضرت مولانا حمید الدین فراہی رحمۃ اللہ علیہ کے فیضان و برکات بہت وسیع ہیں لیکن مولانا امین احسن صاحب اصلاحی حضرت فراہی رحمۃ اللہ علیہ کے علمی وارث اور جانشین سمجھے جاتے ہیں، آپ تحریک حکومتِ الٰہیّہ کے حامی ہیں۔ اقامت نظام اسلامی کے لئے جد وجہد کر رہے ہیں، اللہ تعالیٰ آپ کو استقامت و کامیابی عطا فرمائے۔

جماعتِ اسلامی کی صوبۂ متحدہ کی شاخوں کے اجتماع میں جو بمقام الہ آباد منعقد ہوا تھا حکومتِ الٰہیّہ کے اصول و مناہج پر آپ نے ایک تقریر فرمائی تھی اس کا ایک حصّہ یہاں درج کیا جا رہا ہے:۔

آپ کو خوب معلوم ہے کہ ہم کو اور آپ کو اسلام سے جو نسبت حاصل ہے وہ اس رشتہ کی بناء پر ہے جو ہمارا اللہ اور اس کے آخری رسول سے ہے۔ یعنے اللہ تعالیٰ نے جو احکام اور قوانین دئے ہیں اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے جس دین کی دنیا کو دعوت دی ہے اس کا تعلق ہے جس کی وجہ سے ہم اپنے آپ کو مسلم اور مسلمان کہتے ہیں اگر ان چیزوں سے کسی چیز کے ساتھ ہمارا رشتہ ضعیف ہو جائے تو اسلام کے ساتھ ہماری نسبت بھی ضعیف ہو جائے گی اور اگر منقطع ہو جائے تو اسلام سے ہمارا رشتہ بھی منقطع ہو جائے گا اس زنجیر کے ٹوٹنے کے بعد دنیا کے کارخانوں کی بنی ہوئی کتنی ہی سنہری اور روپہلی زنجیریں لائی جائیں لیکن اسلام کے ساتھ ہمارا رشتہ کسی طرح بندھ نہیں سکتا۔ آج کل قوموں اور جماعتوں کی اجتماعی شیرازہ بندی میں جن چیزوں کو اصلی دخل ہے وہ قومیت اور وطنیت ہے، ملک کا اشتراک ہے، نسل ہے، خون ہے، رنگ ہے، جن لوگوں نے تمدنی رسائل پر غور کیا ہے۔ وہ جانتے ہیں کہ انھیں اساسات پر حلقے بنتے ہیں قومیں بنتی ہیں۔ تہذیب کے خط و خال نمایاں ہوتے ہیں۔ ایک انگریز کی انگریزیت ایک جرمن کی جرمنیت، اور ایک جاپانی کی جاپانیت اس کے نسب، نسل اور ملک کی بناء پر قائم ہے۔ لیکن ایک مسلمان خواہ وہ کتنا ہی غبی ہو (حالانکہ مسلمان کبھی غبی نہیں ہوتا) کبھی بھی اس غلط فہمی میں مبتلا نہیں ہو سکتا کہ یہ چیزیں اسلامی اجتماعیت کی تشکیل میں بھی چونے اور گارے کا کام دے سکتی ہیں

اسے خوب معلوم ہے کہ مسلمان کا اسلام سے رشتہ اللہ اور اُس کے رسول سے تعلق کی بنیاد پر قائم ہے۔ اور یہی اللہ اور اُس کے رسول کا رشتہ ایک مسلمان کو مسلمان سے جوڑتا ہے۔ جو اللہ اور اس کے رسول سے اپنا رشتہ کاٹ لے وہ اسلام سے منقطع ہو گیا اور جس نے اسلام سے علیحدگی اختیار کر لی اس نے اسلامی ہیئت اجتماعیہ میں اپنی جگہ کھو دی۔ آپ کی ان سڑکوں پر چلتا پھرتا ایک معمولی چمار جس کو پُشت ہا پُشت سے اسلام سے کوئی نسبت حاصل نہ رہی ہو اگر ابھی ان اساسات کا اقرار کر لے جن کی حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے تعلیم دی ہے تو وہ فوراً اسلام میں داخل ہو جائے گا اور آپ کی مسجد میں حقدار ہو گا کہ اگلی صفوں میں جگہ پائے لیکن ایک شخص جس کا خاندان پشت ہا پشت سے مسلمان شیخ الاسلامی کے عہدے پر متمکن چلا آیا ہے۔ اس کا کوئی ناخلف فرزند اگر اصول اسلام میں سے ایک اصل کا بھی انکار کرتا ہے تو کوئی نہیں ہے جو جو اُسے ہماری صف پائین میں بھی جگہ دلا سکے۔ اگرچہ اس خاندان خاندانِ رسالت سے ہی نسبت کیوں نہ حاصل ہو۔ نسل، نسب، خاندان، وطن اسلامی تصور میں بالکل بے معنی ہیں۔

اسلام کے اساسی معتقدات اور ان کا مفہوم

اب آئیے غور کیجئے کہ اسلام جس کی نسبت ہی سے ہماری تمام کائنات ہے اُس کے وہ اساسی معتقدات کیا ہیں جن پر تمام مسلمانوں کا اتفاق ہے اور جن کو صدقِ دل سے مانے بغیر نہ آدمی اسلام میں داخل ہوتا ہے اور نہ اُن

تقائم رہے بغیر اسلام پر قائم رہتا ہے۔
آپ کو خوب معلوم ہے کہ پہلی چیز ایمان باللہ ہے۔ لیکن
ایمان باللہ کا مطلب صرف زبان سے آمنت باللہ کہہ دینا نہیں
ہے اتنے کا اقرار تو ابوجہل اور ابولہب کو بھی تھا پس یہاں تک آپ
ان سے کچھ آگے نہیں ہیں۔ بلکہ اس حد تک دنیا کے اکثر افراد آپ کے
برابر ہیں۔ دنیا کی پچھلی تاریخ خدا کے انکار مطلق سے بالکل خالی ہے۔
دنیا کو ہمیشہ خدا کا اقرار رہا ہے۔ یہ صرف موجودہ عہد روشن کی خصوصیات
میں سے ہے کہ اس میں کچھ ایسے بے بصیرت بھی پیدا ہو رہے ہیں جو خدا کے
منکر ہیں ظاہر ہے کہ اللہ پر ایمان لانے کا مفہوم صرف یہ نہیں ہو سکتا
کہ آپ اقرار کی حد تک اللہ کا اقرار کریں بلکہ

ایمان باللہ

ایمان باللہ کا مفہوم یہ ہے کہ اللہ پر، اس کی اُن تمام صفات و اسمائے
حسنیٰ کے ساتھ جو شانِ الوہیت کے لئے موزوں ہیں اور جن کی
انبیاء علیہم السلام نے تعلیم دی ہے ایمان لایا جائے۔ یعنی یہ کہ ہم
اس کے بندے ہیں، غلام ہیں، ہماری مرضی اور ہماری خواہش اس کے
حکم کے آگے کچھ نہیں، صرف وہی حاکم علی الاطلاق ہے۔ خالق و مالک
وہی ہے، قانون دینے والا، شریعت بنانے والا وہی ہے نفع و ضرر
پہنچانے والا اور مدبر کل وہی ہے ان صفات کا مستحق اور کوئی نہیں اگر
ان ہی صفات میں سے کسی صفت میں دوسرے کی حصہ داری مان لی گئی
یا خدا کے اختیارات میں کسی کو شریک کر دیا جائے تو تمام ایمان ہی
غارت ہو جائے گا۔ اس میں کسی مسلمان کو اختلاف نہیں ہے۔

پھر ہم خدا کے متعلق یہ عقیدہ نہیں رکھتے کہ ہم کو پیدا کر کے اس نے ہمیں اندھے بھینسے کی طرح چھوڑ دیا ہے کہ جدھر چاہیں بھٹکتے پھریں یا یہ کہ وہ ہندوؤں کے مہادیو کی طرح محض ڈنڈوت کر لینے سے راضی ہو جاتا ہے بلکہ خدائے تعالیٰ نے جس طرح ہماری مادی زندگی کے سامان فراہم کئے ہیں ٹھیک اسی طرح اس نے ہماری ہدایت کے لئے انبیاء اور رسل بھیجے ہیں۔ اور جس طرح اس نے ہم سے اپنی پرستش کا مطالبہ کیا اسی طرح اس نے اپنی اطاعت کا بھی مطالبہ کیا ہے۔ صرف یہ چیز کافی نہیں ہو سکتی کہ ہم زبان سے اس کی تعریف کر دیں یا صرف پانچ وقت نمازیں پڑھ لیں، بلکہ اس کی فرماں برداری و اطاعت بھی لازمی ہے۔ اور یہ اطاعت زندگی کے کسی ایک ہی گوشہ میں نہیں ہے بلکہ ہر گوشہ میں ہے مسلمان صرف مسجد کے اندر ہی اللہ کا بندہ نہیں رہتا بلکہ اسے ہر جگہ اللہ کے قانون اور اس کے احکام کی پابندی کرنی پڑتی ہے۔ ہندو اور غیر مسلم کا دین صرف مندر اور معبد میں اس سے چپک جاتا ہے لیکن مسلمان کا دین ہر وقت اس کے ساتھ ہے مسجد میں، گھر میں، بازار میں، دکان میں کھیتی باڑی میں، لین دین میں، سیاست میں، حکومت میں، معیشت میں اور تہذیب و تمدن میں غرض کوئی جگہ نہیں ہے، جہاں خدا کا دین سایہ کی طرح مسلمان کے ساتھ نہ ہو۔ اللہ تعالیٰ کی یہ اطاعت اس کے انبیاء کی اطاعت کے ذریعہ سے ہوتی ہے۔ چنانچہ جس طرح اللہ کو ماننے کا مطلب محض آمنت باللہ کہنا نہیں ہے بلکہ اللہ کو شارع، مالک، قانون ساز مدبر ماننا ہے اسی طرح رسول کو ماننے کا مطلب محض یہ نہیں ہے کہ ہم اس کے رسول ہونے کا اقرار کر لیں اگر ہم صرف اقرار کی حد تک رسول کو مانتے

ہیں۔ تو مدینہ کے منافقین اس معاملہ میں ہم سے پیچھے نہ تھے وہ اللہ کی قسمیں کھا کھا کر کہتے تھے کہ آپ اللہ کے رسول ہیں مگر اللہ نے انھیں صادق القول تسلیم نہیں کیا بلکہ فرمایا وَاللّٰہُ یَشْہَدُ اِنَّ الْمُنٰفِقِیْنَ لَکٰذِبُوْنَ" اور اللہ گواہی دیتا ہے کہ منافقین جھوٹے ہیں۔" آپ اللہ کے رسول ہیں مگر یہ اپنے قول میں صادق نہیں ہیں

ایمان بالرّسالت

کیونکہ رسول کو ماننے کا مطلب یہ ہے کہ اسے واجب الاطاعت مانیں، زندگی کے گوشے میں خدا کے نائب اور رسول ہونے کی حیثیت سے اس کی رہبری تسلیم کریں اس کے خلاف جو کچھ ہے اُسے غیر فطری اور خدا سے انحراف یقین کریں اور اس سے فطری دشمنی رکھیں اور جو اس کے مطابق ہے اس سے فطری محبت ہو۔" وَمَا اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا لِیُطَاعَ بِاِذْنِ اللّٰہِ" ہم نے نہیں بھیجا کسی رسول کو مگر اس لیئے کہ اس کی اطاعت کی جائے۔" رسول کی رسالت کے اقرار کا حق اس سے ادا نہیں ہو جاتا کہ اس کا نام آتے ہی انگلیوں کو چوم کر آنکھوں سے لگائیں یا میلاد کی مجلسیں قائم کر دیں، یا رسول کے نام پر جھنڈے لے کر سڑکوں اور گلیوں کا طواف کرتے پھریں۔ رسول درحقیقت واجب الاطاعت بن کر آتا ہے کسی شعبہ میں اس کے سوا کسی اور کی اطاعت کو اپنی رضا سے تسلیم کرنا اللہ اور اس کے رسول سب کا انکار ہے زندگی کے ہر مرحلہ میں اُسے

مطاع مانیئے اس کے بغیر ہزاروں میلادیں کر کے اور لاکھوں جھنڈے اٹھا کر اگر آپ یہ سمجھیں کہ آپ نے رسول کو ماننے کا حق ادا کر دیا اور آپ اس کی شفاعت کے حقدار ہو گئے، یا اس کی تعلیمات کا مذاق اڑا کر اور پوری زندگی میں اس کے خلاف چل کر اگر آپ امید رکھتے ہیں کہ ٹھنڈے ٹھنڈے جنت کو چلے جائیں گے تو میں پوری ذمہ داری کے ساتھ کہتا ہوں کہ اس سے زیادہ جھوٹا وہم اور کوئی نہیں آپ کو مجبور کر کے اسوۂ رسول سے ہٹایا جا سکتا ہے۔ لیکن رسول کے اسوہ سے اگر آپ خود بھاگ کھڑے ہوں، اس کو آپ خود مطاع نہ مانیں تو رسول کو رسول ماننے سے کوئی فائدہ نہیں۔ یاد رکھیئے کہ رسول کی تعلیم کے خلاف شک نفاق ہے اور اس کی مخالفت کفر ہے۔

اللہ نے جو دین آپ کو دیا ہے اس کا نام اسلام رکھا ہے اسلام کے معنی ہیں اپنے آپ کو بالکلیہ اللہ کے حوالے کر دینا، اس کی تشریح قرآن نے اس طرح کی ہے "اُدْخُلُوا فِی السِّلْمِ کَافَّۃً" "اللہ کی اطاعت میں پورے کے پورے داخل ہو جاؤ"۔ یعنے آپ اپنی زندگی کا تجزیہ نہیں کر سکتے، زندگی کے ہر شعبہ میں اس دین کی پیروی کرنی پڑے گی۔ کاروبار کریں ملازمت کریں، تعلیم دیں، کمپنی کھولیں، گھر میں ہوں یا سوسائٹی میں، بین الاقوامی امور ہوں یا ملکی معاملات سب میں اللہ کے دین کی پوری پیروی کرنا، اپنے آپ کو اللہ کے حوالے کر دینا اسلام ہے اور مسلم وہی ہے جو اس مفہوم میں اسلام کا

حائل ہو۔ اسلامی زندگی سے انحراف مجبوراً ہو سکتا ہے یا نفس کے غلبہ کی بناء پر یا جہالت کی وجہ سے مثلاً کوئی مضطر مجبوراً خنزیر کھا لے یا کوئی شخص ہیجان نفس کی وجہ سے کوئی ناجائز حرکت کر بیٹھے یا غفلت کی وجہ سے کسی کا پاؤں غلاظت کے ڈھیر پر پڑ جائے۔ پہلی صورت میں انسان کا فرض ہے کہ اس حالت سے نکلنے کی جد وجہد کرے۔ دوسری حالت میں انسان کا فرض ہے کہ فوراً توبہ کرے تیسری صورت میں اس کو چاہیئے کہ جلد سے جلد اپنے آپ کو پاک کرے لیکن اگر وہ غلاظت کے ڈھیر پر اپنا بستر بچھائے، وہیں اولاد پیدا کرنا شروع کر دے وہیں اپنی نسل کو پروان چڑھائے اور اس پر فخر بھی کرے کہ ہم نے شیش محل بنوا لیا ہے اور آپ بھی اسے قابل رشک مسلمان سمجھنے لگیں تو یہ ایک غلط فہمی ہے جس سے اپنے دماغ کو پاک کیجیئے، اس کا غلط ہونا مسلم ہے۔ کوئی غبی ہی ہوگا جو اس میں شک کرے۔

ایمان بالکتاب

رسول کے علاوہ خدائے تعالیٰ نے کتاب بھی بھیجی ہے وہ جنتر منتر کی کوئی کتاب نہیں ہے غیر مسلم بھی مانتے ہیں کہ یہ آسمان کے نیچے کی ان کتابوں میں سے ہے جن سے دنیا میں انقلاب عظیم برپا ہوا ہے حقیقت یہ ہے کہ اس نے سب سے بڑا اور سب سے زیادہ صالح انقلاب برپا کیا، یہ قوموں کے

لئے عروج وزوال کا پیمانہ بن کر نازل ہوئی ہے۔ اس نے دیکھتے ہی دیکھتے عرب کی گئی گزری قوم کو دنیا کی قوموں کا امام بنادیا۔ اور دوسری تمام بڑی بڑی قوموں کے فاسد تمدنوں کو جڑ سے اکھاڑ پھینکا۔ اس نے اونٹ چرانے والوں کے ہاتھوں سے اونٹوں کی نکیل لے لی اور قوموں کی قیادت کی باگ اُن کے ہاتھوں میں دے دی اور انھیں اونٹ چرانے والوں میں اس کے فیض سے ایسے ایسے لوگ پیدا ہوئے کہ پوری انسانیت کی تاریخ ان کے ناموں سے روشن ہے۔ یہ کتاب ہماری زندگی کے ہر گوشے کے لئے ہدایت بناکر بھیجی گئی ہے۔ یہ فرمان الٰہی ہے۔ واجب الاطاعت ہے۔ اس میں شک، تحریف اور تفریق کی گنجائش نہیں۔ کوئی مسلمان جان بوجھ کر اور ٹھنڈے دل سے اس سے منحرف ہو کر اپنے تئیں مسلمان نہیں باقی رکھ سکتا جب تک کہ دم میں دم ہے وہ اس پر جما رہے گا۔ اگر جہالت کی وجہ سے اس سے چھٹک جائے گا تو ہوش آنے کے بعد اس کی طرف لوٹے گا۔ اور اگر اس سے زبردستی اس کو دور کر دیا جائے گا تو یہ دوری ایسی ہوگی جیسی ایک مچھلی کی تالاب سے۔ وہ بہر صورت اس سے علٰحدگی پر کبھی راضی نہیں ہو سکتا اگرچہ اس کا سر تن سے جُدا ہو جائے اگرچہ اس راہ میں اُسے سب کچھ کھو دینا پڑے۔

اس کتاب عزیز کے ساتھ ہمارے تعلق کی نوعیت صرف یہ نہیں ہے کہ اگر وہ کبھی زمین پر گر جائے تو اُس کے برابر گیہوں

نول کر صدقہ کر دیا جائے۔ اس کا جزدان نہایت عمدہ مخمل کا ہو۔ ستھری الماری میں اُسے رکھا جائے اور ہرگز یہ بھی نہیں کہ کوئی مرنے لگے اس پر سورۂ یٰسین پڑھ کر دم کر دیجئے۔ وہ جان نکالنے کے لئے سہولت کا نسخہ ہی بن کر نہیں آئی ہے۔ بلکہ انسان کے لئے ہدایت اور حیات کا سرچشمہ بن کر آئی ہے سورج تاریک ہو جائے تو جہان تاریک نہ ہوگا چاند بے نور ہو جائے تو دنیا اندھیری نہ ہوگی۔ ستارے جھڑ جائیں تو کوئی انقلاب برپا نہ ہوگا۔ لیکن اگر قرآن جہان سے غائب ہو جائے تو پھر دنیا کو کہیں سے روشنی نہیں مل سکتی۔ "من لم یجعل اللہ له نوراً فما له من نور"

یہ کتابِ عزیز وہ ہے جو تہذیب و تمدن اور نیکی و سعادت کا سرچشمہ ہے اس ظالم انسان کے جواب میں جس نے کہا تھا کہ "جب تک یہ کتاب باقی ہے دنیا میں امن قائم نہیں ہو سکتا" میں یہ کہتا ہوں کہ دنیا کی بڑی سے بڑی تباہی بھی دنیا سے نیکی اور امن و عدل کے آثار نہیں مٹا سکتی۔ اگر یہ کتاب صفحۂ عالم پر موجود ہے اُسے جاننا، اس پر ایمان لانا، اس کے مطابق عمل کرنا، اسے نوکِ زبان کرنا اس کے علم و عمل کو وراثت میں منتقل کرنا، اس کے لئے گردن کٹانا، ہمارے فرائض اور اس کتاب کے حقوق میں سے ہے۔ یہ ہمارے دین کے مسلمات میں سے ہے میں کہہ چکا ہوں کہ ہمارا رشتہ خون کی بناء پر نہیں ہے، اس کتاب کی بناء پر ہے، جو اس کو مانتا ہے وہ ہمارا ہے اور ہم

اس کے ہیں۔ اور جو اس سے منحرف ہے نہ وہ ہمارا ہے نہ ہم اس کے ہیں نخلع و نترک من یفجرک

ہمارے مدرسوں کے امتحان میں کچھ سوالات اختیاری بھی ہوتے ہیں لیکن قرآن میں ایسی کوئی چیز نہیں ہے جو اختیاری ہو۔ ہم کو پورا قرآن ماننا پڑے گا۔ اس کی ایک چیز کا انکار سب کا انکار ہے خواہ وہ چھوٹی سے چھوٹی ہی کیوں نہ ہو خداوند تعالیٰ ہمارا محتاج نہیں ہے کہ ہم جتنی بھی اس کی اطاعت کریں اتنے ہی پر راضی ہو جائے کہ چلو، اگر یہ سو فی صدی پر راضی نہیں ہیں تو ان سے ۵۰ فی صدی ہی قبول کر لو نہیں بلکہ رسول کو حکم ملا ہے کہ پورے کا پورا قرآن پیش کریں جسے لینا ہے اُسے پورا لے ورنہ پورا چھوڑ دے۔ آپ کو معلوم ہے کہ اہل بردہ نے کس چیز کا انکار کیا تھا؟ صرف زکوٰۃ ہی کا تو کیا تھا! صحابہ کی مجلس میں معاملہ پیش ہوا تو حضرت ابوبکر صدیقؓ نے فرمایا کہ اگر انھوں نے ایک بکری کا بچہ بھی دینے سے انکار کیا تو میں ان سے جہاد کروں گا اور اگر اور کوئی تیار نہ ہوگا تو میں تن تنہا تلوار لے کر نکلوں گا۔ سب صحابہ نے اس سے اتفاق کیا اس سے ظاہر ہو گیا کہ احکام دین میں ہم کسی قسم کی تفریق و تقسیم نہیں کر سکتے

حق و باطل کے معرکے میں ہمارا فرض

اسلام کے ساتھ ہماری نسبت ان مسلمات ہی کے تسلیم کرنے سے قائم ہے یہ بنیادی اصول ہیں جن پر ہم سب مسلمان متفق ہیں۔ ان پر قائم رہنا کچھ آسان کام نہیں ہے شیطان کا کام ہی یہ ہے کہ ترغیب سے ترہیب سے اور دونوں میں وسوسہ اندازی کر کے خدا سے بغاوت کی راہ پر لائے لیکن ہمارا فرض تو یہ ہے

کہ ہم کم سے کم اتنی ہمت تو دکھائیں کہ شیطان کو دانتوں پسینہ آجائے۔ یہ کیا ہے کہ اپنے آپ کو بزدلانہ طاغوت کے بالکل حوالے بھی کر دیں، دینداری کا دعویٰ بھی کرتے رہیں۔ خدا سے بھی تعلق رکھیں اور اہرمن سے بھی۔ اس پر ایک لطیفہ یاد آیا کہیئے تو عرض کر دوں۔ کوئی مسلمان ہوا۔ لیکن اس کے باوجود جب وہ کسی مندر کے سامنے سے گزرتا تو مورتیوں کے آگے ڈنڈوت بھی کر لیتا کسی نے کہا کہ مسلمان ہونے کے بعد یہ حرکت اچھی نہیں ہے۔ اس نے کہا "بھئی بگاڑ کسی سے اچھا نہیں ہے"۔ دین حق میں معاف کیجیئے اس رواداری کی گنجائش نہیں ہے مسیح علیہ السلام نے کہا ہے "جو ہمارے ساتھ نہیں وہ ہمارا دشمن ہے" یہی بات اگر انگریز کہنے کی جرأت کر سکتا ہے تو ہم کیوں نہیں کہہ سکتے!

حق و باطل کی لڑائی قدیمی ہے جو بابا آدم کے وقت سے چلی آ رہی ہے یہ جنگ عقلی بھی ہے، اخلاقی بھی ہے۔ اور مادی بھی ہم ایک ہی وقت اللہ اور اہرمن کو خوش نہیں رکھ سکتے میں آپ سے یہ عرض کرتا ہوں کہ یہ دینی مسلم مسائل ہیں، کیا مسلمان موجودہ حالات میں اسلام کے ان مقتضیات کو پورا کر رہے ہیں۔ ہم تو ٹھنڈی سڑک سے جنت تک پہنچنا چاہتے ہیں حالانکہ حُفَّتِ الْجَنَّةُ بِالْمَكَارِهِ "جنت ناگوار شدائد سے گھیر دی گئی ہے"۔ یہ حضور نے فرمایا ہے۔ ہمیں لامحالہ جان و مال کی بازی کھیلنی پڑے گی۔ اس طرح کی ( )

سہل پسند قسم کی زندگی صرف ایک شکل میں اختیار کی جا سکتی ہے کہ آدمی کا کوئی اصول نہ ہو لیکن جب کوئی اصول اختیار کیا جائے گا۔ زندگی کی راہ کانٹوں سے بھر جائے گی یا تو ہر تیز رو کے پیچھے بھاگیئے، یا ایک اصول اختیار کرنے کے بعد اس کے لئے تن من دھن کی قربانی کیجیئے دو دونی کر چار ہوتے ہیں۔ اگر آپ اتنی سی بات بھی مان لیتے ہیں تو حساب درست کرنے کے لئے راتوں کو کتنی نیند

خراب کرنی پڑتی ہے۔ اور کتنا تیل جلانا پڑتا ہے لیکن اگر آپ کا یہ خیال ہو کہ دو اور دو مل کر چار بھی ہوتے ہیں اور چھ بھی، آٹھ بھی ہوتے ہیں اور سولہ بھی تو پھر درد سری کی کوئی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ غور تو کیجئے جب مسلمان اتنے مسلمات مانتا ہے تو اسے کتنا خون جلانا پڑے گا!

مسلمانوں کے اقسام

اس وقت کے مسلمانوں کا جائزہ لیجئے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ ان کے اقسام بیشمار ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ مجھے تفصیل میں جانے کی ضرورت نہیں سانپوں کی قسمیں گن سکتے ہیں مگر مسلمانوں کی اقسام شمار نہیں کی جا سکتیں ظاہر ہے کہ مسلمان کی اتنی قسمیں نہیں ہو سکتی ہیں۔ مسلمان صرف ایک ہی قسم کا ہو سکتا ہے اللہ اور اس کی شریعت کا پابند! رسول اور اس کی تعلیمات کا فرماں بردار! ان مسلمات کا اعتراف اور پھر ان سے بغاوت دو متضاد باتیں ہیں جن کا افسوس ہے اس زمانہ میں کم لوگوں کو شعور ہے۔

دنیا کی کوئی قوم بھی اتنے سچے اور پکے اصولوں کو نہیں مانتی جتنے کہ آپ مانتے ہیں پھر بھی آپ اتنی میٹھی نیند سو رہے ہیں کہ آپ کے دشمنوں کو بھی حیرت ہے جس نے بھی کوئی اصول اپنایا اسے قربانیاں لازمی طور پر کرنی پڑیں، دور جانے کی ضرورت نہیں موجودہ حالات پر نظر ڈالئے جس نے کہا جمہوریت ہمارا مسلک ہے۔ دیکھئے اس کو یہ سودا کتنا مہنگا پڑا بعض نے کہا کہ ہم ڈکٹیٹرشپ کے قائل ہیں اور ساتھ ہی انھیں جان و مال کی بازی لگا دینی پڑی۔ روس نے نہ جانے کس عالم میں کہہ دیا تھا۔ کہ فلاح عالم اشتراکیت میں ہے نتیجہ آپ کے سامنے ہے پورے کا پورا ملک تہس نہس ہو گیا۔ نازی ازم اتنی جان نثاری کا مطالبہ کرے اشتراکیت

کے سربکف جانفروشوں کی تعداد اس قدر عظیم الشان ہو جمہوریت کی حمایت کے لئے اتنے سر فروش تن من دھن کی بازی لگا رہے ہوں مگر آپ خدا اور اس کے دین کو مان کر کتب قدیمہ کی زبان میں پہاڑی کا چراغ اور زمین کا نمک ہو کر اور قرآن سے خیر الامم کا خطاب پا کر آپ کے بستر میں ایک کانٹے کی خلش بھی نہ ہو۔ اور پھر بھی سب حقوق ادا ہوتے رہیں جس راہ پر چاہیں چلیں اور پھر بھی کوئی اصول نہ ٹوٹے کس قدر اچنبھے کی بات ہے۔ موجودہ پڑھے لکھے انسان جو دائرۂ اسلام سے باہر ہیں اور خود کسی اصول کو مانتے ہیں حیرت میں ہیں کہ آپ لوگ کیسے سکھ کی نیند سو رہے ہیں جس کی حفاظت میں اتنا بڑا خزانہ ہو اس کی یہ بے فکری تعجب انگیز ہے۔

یہ اگر مسلم مقاصد ہیں اور آپ نے ان کو مانا ہے تو ان کو دنیا میں قائم کرنے کے لئے پہلے خود انہیں اختیار کیجئے پھر اللہ کے بندوں میں ان کو پھیلائیے ان کے لئے گھر سے لے کر باہر تک اور شہر سے لے کر ملک تک آپ کو ہر جگہ جان جوکھم کا کام کرنا ہوگا۔ موجودہ زمانہ میں لاکھوں بلکہ کروڑوں کی تعداد میں ایسے انسان موجود ہیں جنھوں نے اپنے باطل اصولوں کی خاطر گھر چھوڑا وطن چھوڑا، اعزہ، خاندان اور قوم سب کو قربان کیا۔ ایسے انسان ہزارہا موجود ہیں جو عین دشمن کے ملک میں ہزاروں فٹ کی بلندی سے جست لگاتے ہیں۔ دنیا باطل کے لئے اس جوش و ولولہ کا اظہار کرے مگر صرف حق ہی ایک ایسا مظلوم ہے جس کے لئے چوٹ کھانے والے سینے نہیں ہیں جس کے لئے رگوں کا خون خشک ہو گیا ہے جس کے لئے جیبوں میں مال موجود نہیں ہے اللہ اکبر کیسا عجیب ماجرا ہے؟ کیا حق کسی چیز کا مطالبہ نہیں کرتا اور کیا وہ کسی چیز کا بھی مستحق نہیں ہے؟ آج وہ مسلمان جو خدا اور رسول کے حقوق کو

کو اپنا اصول تسلیم کئے ہوئے ہیں کہاں سوئے ہوئے ہیں؟ یا تو یہ کہئے کہ یہ مقصد گھٹیا ہے اور اگر گھٹیا نہیں ہے بلکہ تمام مقصدوں میں سب سے ارفع یہی ہے تو بتائیے کہ قیامت کے دن آپ کا کیا جواب ہوگا جبکہ اس آسمان کے نیچے کوئی جماعت آج ایسی نہیں ہے جو حق کو اپنا مقصد حیات بنائے ہوئے ہو؟ صرف کسی جزئی حق کو نہیں بلکہ پورے کے پورے حق کو کیونکہ ویسے تو دنیا میں کوئی جماعت ایسی نہیں ہو سکتی جس کے مقاصد میں کچھ نہ کچھ حق کے اجزا شامل نہ ہوں۔ اس کے بغیر تو کوئی جماعت وجود ہی میں نہیں آسکتی، دنیا میں مجرد باطل کا وجود ناممکن ہے، ایسا ہونا اس کائنات کے مزاج کے خلاف ہے، ہمارا سوال ایسی جماعت کے لئے ہے جو حق کو بحیثیت مجموعی لے کر اٹھے اس طرح جس طرح صحابہ رضی اللہ عنہم لے کر اٹھے تھے۔

جماعت اسلامی اور اس کے قیام کی غرض

جماعت اسلامی کا قیام اسی مقصد حق کے لئے ہے، ہم ان مسلمانوں کو چھانٹ چھانٹ کر جمع کر رہے ہیں جو اس پورے حق کو لے کر اٹھنے کا عزم رکھتے ہیں اور ان سے ایک جماعت کی تشکیل کر لی ہے اس طرح ہم اسلام کے ان مقاصد کو ادا کرنے کی کوشش کر رہے ہیں جو صرف جماعتی زندگی میں پورے ہو سکتے ہیں۔ ابھی یہ جماعت کمزور اور ضعیف ہی سہی لیکن اگر کچھ ذرے اکھٹے ہو گئے اور اللہ تعالیٰ نے ان ذروں میں کبھی گرمی و حرارت پیدا کی اور ان میں کچھ صلاحیت پیدا ہو گئی تو کیا عجب ہے کہ اس کمزور جماعت کے ہاتھوں دین کی وہ خدمت انجام پائے جو اللہ کو اس کے رسول کو اور تمام مومنین کو سب سے زیادہ محبوب ہے اللہ ہمیں اس

کام کے لئے سچا خادم بنا دے۔

ان امور میں کسی کے لئے اختلاف کی گنجائش نہیں ہے یوں تو بحث کرنے کے لئے سب کے منہ میں زبان ہے مگر حقیقت یہ ہے کہ یہ مسلم مسائل ہیں۔ کوئی جماعت نہ تھی جو اس مقصد خالص کے لئے جد و جہد کر رہی ہو، باطل سے باطل مقاصد کے لئے جماعتیں ہوں، ان کے لئے بڑی بڑی قربانیاں کرنے والے ہوں لیکن اس آسمان کے نیچے جو سب سے بڑا مقصد ہو اسی کے لئے کچھ نہ ہو، کس قدر غم انگیز بات ہے اس مقصد کے لئے کچھ خدا کے بندے اکٹھے ہو گئے ہیں سمجھانے اور سمجھنے میں ذرا دیر لگے گی، مگر دنیا سمجھے گی ضرور اور اگر نیتوں میں خلوص ہے تو جس وقت شیطان اپنی فوج لے کر نکلے گا تو ہم اس مبارک ذات کے اسوہ کی پیروی کریں گے جس نے ہزاروں غرق آہن جنگجوؤں کے سامنے تین سو تیرہ بے سر و سامان لا کھڑے کئے تھے اور اللہ تعالیٰ نے انھیں کے ذریعہ سے حق کا بول بالا کیا تھا۔

پھر اگر ہم نے اس جد و جہد میں بازی پا لی تو فہو المراد اور اگر دوسری بات ہوئی تب بھی تمام راستوں میں ایک حق ہی کا راستہ ایسا راستہ ہے جس میں ناکامیابی کا کوئی سوال نہیں یہ اس میں اول قدم بھی منزل ہے اور آخر بھی، ناکامی کا اس کوچہ میں گزر ہی نہیں ہے اس کو مان لینے اور اس پر چلنے کا عزم راسخ کر لینے کی ضرورت ہے پھر اگر تیز سواری مل گئی تو فبہا یہ نہ سہی تو جھکڑے مل گئے انھیں سے سفر ہوگا۔ یہ بھی نہیں تو دو پاؤں موجود ہیں ان سے چلیں گے پاؤں بھی نہ رہیں تو آنکھیں تو ہیں ان سے نشان منزل دیکھیں گے آنکھیں بھی اگر بے نور ہو جائیں تو دل کی آنکھ تو ہے جس کی بصارت کوئی سلب نہیں کر سکتا بشرطیکہ ایمان موجود ہو۔ ان صلاتی ونسکی ومحیای ومماتی للہ رب العلمین میری نماز میری قربانی میری زندگی اور میری موت اللہ کے لئے ہے جو تمام جہانوں کا رب ہے پس ساحل کا اور ثنیا راہ کا سوال ہمارے یہاں بالکل ایک ضمنی شے ہے۔

تحریکِ حکومتِ الٰہیہ کے موانع و مشکلات

بحث و تنقید کی روشنی میں

صاحب تفسیر نظام القرآن حضرت مولانا حمید الدین فراہی رحمۃ اللہ علیہ کے فیوض و برکات سے جن خوش نصیب حضرات کو حصہ ملا ہے ان میں مولانا صدر الدین اصلاحی بھی ہیں، جن لوگوں نے ان کے مقالات و تصانیف اور تالیفات و تراجم دیکھے ہیں ان کو معلوم ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انھیں استعداد علمی، صحت فکر اور بصیرت دینی سے کس طرح نوازا ہے۔

پیش نظر کتاب کے گزشتہ اوراق اس حقیقت پر شاہد عادل ہیں کہ ہر گروہ اور ہر مسلک کے علماء و زعماء اور مفکرین و محققین کے نزدیک مسلمانوں کا نظام حیات اور دستور حکومت وہی ہے جو انھیں اللہ و رسول سے ملا ہے، لیکن یہ کتنا المناک اور درد انگیز واقعہ ہے کہ ایک طرف تو

مسلمان اپنا یہ عقیدہ بتاتے ہیں اور فی الحقیقت مسلمانوں
کا یہی عقیدہ ہونا چاہیئے۔ لیکن دوسری جانب وہ اپنے
قول اور عمل دونوں سے اس عقیدے کی تکذیب کر رہے ہیں۔

اس عقیدے کا تقاضا یہ تھا کہ مسلمانوں کی تمام مصروفیتیں
اور سرگرمیاں۔ اور تمام کوششیں اور قربانیاں الٰہی حکومت
کے قیام اور اسلامی نظام کے احیاء کے لیے وقف ہوتیں۔
لیکن ان کی تمام جدوجہد غیر الٰہی حکومت اور غیر اسلامی
نظام کے حصول و قیام کی راہ میں صرف ہو رہی ہیں۔ اگر
ان کو حکومت الٰہیہ کے قیام اور نظام اسلام کے احیاء کی
دعوت دی جاتی ہے تو کہتے ہیں کہ یہ محض تصور و تخیل ہے
جو شرمندۂ عمل نہیں ہو سکتا۔ موجودہ وقت اور ماحول میں
صحیح طریقۂ کار وہی ہے جس پر ہم عمل کر رہے ہیں۔

یہ بات اگر محض عوام کہتے جب بھی کچھ کم افسوس ناک
نہ تھی، لیکن جو حضرات علم و فضل اور عزم و عمل میں اپنا ایک خاص
مقام رکھتے ہیں۔ اور وہ زعماء و قائدین جن کی قابلیت
و استعداد کا مسلمان کلمہ پڑھ رہے ہیں وہ بھی یہی بات
کہتے ہیں تو قلق کے ساتھ تعجب بھی ہوتا ہے کہ ان کے علم
و یقین کو کیا ہو گیا؟؟

مولانا صدر الدین نے مجلّہ "ترجمان القرآن" جمالپور
(پٹھان کوٹ) میں "فریضۂ اقامت دین" کے عنوان سے ایک
فکر انگیز اور نظر خیز مقالہ لکھا ہے اور وقت اور ماحول کے

پیش نظر تحریک حکومت الہیہ اور اقامت نظام اسلام کی
راہ میں جتنے موانع و مشکلات بتائے جاتے ہیں ان سب کا
جائزہ لیا ہے اور فکر و نظر، عقل و بصیرت اور کتاب و
سنت کی روشنی میں ان سب کو بے حقیقت اور ناقابل التفات
ثابت کر دیا ہے۔ اس مقالے کے بعض حصے یہاں دیے
جا رہے ہیں۔ مولانا یہ ثابت کرنے کے بعد کہ اقامت دین
کی جدوجہد امکان و عدم امکان کی بحث سے بالاتر ہے
فرماتے ہیں:۔

اسلام اور اقامت دین کا تلازم

اس تقریر سے، جو اوپر گذر چکی، صرف اتنا ہی نہیں ثابت ہوتا کہ اقامت دین کی جدوجہد، امکان و عدم امکان کی بحث سے بالاتر ہے اور اس کو طوعاً یا کرہاً ہر وقت، ہر ماحول اور ہر حالت میں جاری رکھنا چاہیئے، بلکہ اس سے یہ بھی واضح ہو گیا کہ اگر حالات کے اندازے اس جدوجہد کی ناکامی کا یقین دلا دیں حتی کہ اگر کوئی اپنی آنکھوں نوشتۂ الٰہی میں اس ناکامی کو مقدر دیکھ لے تو بھی اس کو اس "سعی" میں جو اس کے نزدیک لاحاصل ہے، لگے رہے بغیر چارہ نہیں۔ کیونکہ یہ دنیا کی عام تحریکوں اور اسکیموں کی طرح کی کوئی تحریک اور اسکیم نہیں ہے کہ اگر اس کی کامیابی کے ذرائع مفقود اور امکانات ناپید نظر آئیں تو اس کو ترک یا ملتوی کر دینا جائز اور ممکن ہو سکے، نہ مسلمانوں کے سر پر یہ کوئی اوپر سے ٹپکی ہوئی چیز ہے کہ جاہا تو قبول کر لیا اور جب چاہا اس کو اپنے پروگرام سے

خارج کردیا بلکہ ایک شخص کے مسلمان ہونے کا لازمی تقاضا ہی یہ ہے کہ اس نے اس دین کی اقامت کے لئے اپنے کو وقف کردیا ہے۔ اللہ پر ایمان لانے اور حق سے محبت کرنے کا فطری مطالبہ ہی یہ ہے کہ جو چیزیں خدا کو محبوب ہوں اور جو باتیں حق ہوں، انسان ان کو اپنے گردوپیش زندہ اور کارفرما دیکھے اور اس کے لئے ہمہ دم کوشاں ہے اور ہر اس چیز کو مٹا دینے کے لئے تیغ بکف نظر آئے جو خدا کو ناپسند اور باطل ہوں، چنانچہ اوپر ہم واضح دلائل کے ساتھ یہ بیان کر چکے ہیں کہ جس طرح آگ اور پانی کا اتحاد ممکن نہیں اسی طرح ایمان اور منکرات میں مصالحت ممکن نہیں۔ پس یہ جدوجہد اسلام سے علیحدہ اور اس پر زائد کوئی چیز نہیں ہے بلکہ اس کی عین روح اور حرکت قلب ہے۔ اگر کسی جاندار کے متعلق یہ تصور نہیں کیا جاسکتا کہ وہ زندہ تو ہو مگر اس کے قلب میں حرکت نہ ہو تو یقین رکھئے کہ کسی انسان کے بارے میں بھی یہ تصور نہیں کیا جا سکتا کہ ہو تو وہ مومن مگر اقامت حق کی تڑپ سے اس کے دل ودماغ خالی اور عملی جدوجہد سے اس کے دست وبازو ناآشنا ہوں۔ اس تڑپ اور جدوجہد سے محروم ہو کر یعنی اس مقصد زندگی سے کنارہ کشی اختیار کر کے مسلمان کا وجود ہی بے معنی ہو جاتا ہے۔ یہی وہ سنگ بنیاد ہے جس پر اسلامیت کا قصر تعمیر ہوتا ہے۔ اگر یہ پتھر نیچے سے غائب ہو جائے تو پھر اس قصر کا وجود ہی ممکن نہیں۔ چنانچہ اہل کتاب کے متعلق جنھوں نے اس مقصد زندگی کو فراموش کر رکھا تھا، قرآن نے صاف صاف کہدیا کہ جب تک تم توراۃ اور انجیل کو قائم نہ کردو،

تم کسی اصل پر نہیں ہو اور تمہارا ملی وجود ایک وجود موہوم کے سوا کچھ نہیں، لَسْتُمْ عَلٰی شَیْءٍ حَتّٰی تُقِیْمُوا التَّوْرٰاۃَ وَالْاِنْجِیْلَ وَمَا اُنْزِلَ اِلَیْکُمْ مِنْ رَّبِّکُمْ ۔ اس لئے یہ کہنا کہ اس زمانہ میں اقامت دین ناممکن ہے گویا دوسرے لفظوں میں یہ کہنا ہے کہ اس زمانہ میں مسلمان ہونا ممکن نہیں، اور حالات زمانہ کی ناسازگاری کے پیش نظر اقامت دین کی جدوجہد کو ترک کرنے کے معنی یہ ہیں کہ خود اسلام ہی سے دست برداری کی ٹھان لی جائے۔

غلطی افکار کا منبع

بظاہر یہ بات کچھ عجیب سی معلوم ہوگی اور کتنے ہی "ذکی الحس" لوگوں کو تو اس میں خارجیت کی بو محسوس ہونے لگے گی لیکن دراصل یہ استعجاب و استنکار اس غلط ذہنیت کی پیداوار ہے جس نے کامیابی اور ناکامی کا مفہوم ہی الٹ کر رکھ دیا ہے اور جس کو یہ نہیں معلوم کہ فریضۂ اقامت دین کے معنی کیا ہیں۔ اگر یہ ذہنیت تبدیل کر لی جائے اور اس کو صحیح اسلامی قالب میں ڈھال لیا جائے تو پھر نہ تو خطرات و مشکلات کا تصور اس کو پریشان کرے گا۔ نہ امکان اور عدم امکان کا سوال پیدا ہوگا۔

ہماری اصل ذمہ داری

جب یہ کہا جاتا ہے کہ دین کی اقامت ہم پر فرض ہے تو اس کا مطلب بالعموم یہ لیا جاتا ہے کہ زمین پر دین یعنی الٰہی نظام زندگی کو بالفعل قائم اور نافذ کر دینا ہمارا فرض ہے، حالانکہ جو چیز ہم پر فرض ہے اور جس کی ہم سے اللہ تعالیٰ کے یہاں بازپرس ہوگی وہ دین کو قائم کر دینا نہیں ہے بلکہ اس کو

قائم کرنے کی امکانی جد وجہد کرنا ہے۔ اسی طرح کامیابی کے معنی یہ نہیں ہیں کہ ہماری تگ و دو لازماً ایک خالص اسلامی اسٹیٹ قائم کر دینے پر منتج ہو، بلکہ اس کا مطلب یہ بھی ہے بلکہ درحقیقت یہی ہے کہ ہم اس راہ میں اتنی جانفشانی، قربانی، فدائیت اور سعی و جہد کر دکھائیں جو ہمارے بس میں ہو۔ جس نے یہ کر لیا وہ اپنے مقصد زندگی کو پورا کر گیا اور اپنے مشن میں ہر طرح کامیاب رہا اگرچہ ایک شخص بھی اس کی بات نہ مانی ہو اور ایک ذرہ زمین پر بھی وہ دین حق قائم کر دینے میں کامیاب نہ ہوا ہو۔ اللہ تعالیٰ نے ہر انسان پر اتنا ہی بوجھ ڈالا ہے جتنا وہ اٹھا سکتا ہے۔ لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا ۔ اس نے کسی انسان کو ایسی بات کی تکلیف نہیں دی ہے جو اس کی فطری صلاحیتوں اور قوتوں سے زائد ہو۔ مثلاً اس نے ہم سے مطالبہ کیا ہے کہ تقویٰ اختیار کرو مگر اس کا یہ مطالبہ ہماری فطری استطاعت سے بڑھ کر اور غیر محدود نہیں ہے بلکہ اسی حد تک ہے جتنا انسانی فطرت کے بس میں ہے، چنانچہ فرمایا:۔

اِتَّقُوا اللّٰهَ مَا اسْتَطَعْتُمْ (تغابن-۲)

اللہ کا تقویٰ اختیار کرو جہاں تک تمھارے بس میں ہے۔

مسلمانوں پر فرض کیا گیا ہے کہ وہ اعداء دین کا مقابلہ کرنے اور ان کا زور توڑنے کے لئے تیار رہیں مگر ان سے یہ مطالبہ نہیں کیا گیا ہے کہ جس طرح بھی ہو سکے دشمنوں کی قوت جنگ کے برابر قوت فراہم کریں بلکہ صرف اتنا کہا گیا ہے اور اتنا ہی ان پر واجب کیا گیا ہے کہ:۔

اَعِدُّوْا لَهُمْ مَا اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ قُوَّةٍ الخ (انفال-۸)

دشمنوں کا مقابلہ کرنے کے لیے اتنی قوت تیار کر رکھو جتنی تم کر سکتے ہو۔

ان آیات سے جو اصول ہاتھ آتا ہے وہ صرف یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ کے احکام کی بجا آوری حدود استطاعت سے محدود ہے پس اقامت دین کے معاملہ میں بھی حالات زمانہ، مشکلات راہ، ناسازگاری ماحول، قلت ذرائع، ان سب چیزوں کا الاؤنس انسان کو ملے گا اور ان کے لحاظ سے مختلف انسانوں کی کوششوں میں نمایاں تفاوت ہو سکتا ہے اور ہونا چاہیے۔ ہر انسان کو اللہ تعالیٰ کے روبرو صرف اسی حد تک جوابدہی کرنی پڑے گی جس حد تک اس کو جدوجہد کرنے کی طاقت میسر ہے اگر ایک شخص کو سامان کار اور سازگاری ماحول نصیب ہے لیکن اس نے اپنی طاقت سے بال برابر بھی کم جدوجہد کی تو یقیناً ادائے فرض کی کوتاہی کا مجرم قرار پائے گا خواہ ظاہری نتائج کے اعتبار سے اس راہ میں وہ دوسروں سے کتنا ہی آگے کیوں نہ نکل گیا ہو۔ بخلاف اس کے اگر ایک انسان نے اپنی تمام ممکن کوششیں صرف کر ڈالیں لیکن سروسامان کار کے ناپید اور حالات کے ناموافق ہونے کے باعث آخر تک منزل مقصود کی طرف منہ کیے ہوئے وہیں کا وہیں کھڑا رہ گیا جہاں سے اس نے اپنی مہم کا آغاز کیا تھا تو وہ ہر طرح سے اپنے فرض کو ادا کر گیا۔ غرض انسان کو چاہیے کہ جن حالات میں جیسی کچھ قوت بھی حاصل ہوتی جائے اپنی جدوجہد کا دائرہ اسی لحاظ سے تنگ یا وسیع کرتا رہے۔ اس چیز کو ایک عام مثال سے سمجھیے۔ نماز انسان پر فرض ہے اس میں قیام و رکوع و سجود بھی فرض ہیں۔ ایک شخص اگر قیام پر قادر ہونے کے باوجود بیٹھ کر نماز پڑھتا ہے تو اس کی نماز نہیں ہوتی، اور اگر کسی واقعی مجبوری

کی وجہ سے وہ بیٹھ کر نماز پڑھ رہا ہو اور دو رکعتیں پڑھ چکنے کے بعد ہی اس کی مجبوری دور ہو جاتی ہو اور اب وہ کھڑے ہو کر نماز پڑھنے پر قادر ہو گیا ہو لیکن اس کے باوجود بیٹھا نماز پڑھتا رہے تو اس کی نماز نہ ہو گی بلکہ اس کے لئے ضروری ہے کہ جیسے ہی اس کو زوال عذر اور قدرت قیام کا احساس ہو، فوراً کھڑا ہو کر نماز پڑھنے لگے۔ بالکل یہی حال اقامت دین کی جدوجہد کا بھی ہے۔ جس شخص کو جس وقت جتنی قوت میسر ہو اس وقت اتنی قوت صرف کرنا اس کے لئے ضروری ہے۔ اس سے زیادہ کا وہ مکلف نہیں اور نہ اس سے کم میں اس کی خیر ہے۔ زمین پر مکمل طور پر اللہ کے دین کو بالفعل قائم اور نافذ کر دینا ایک آخری غایت (Goal) ہے۔ جہاں تک پہنچنے کی ہر مسلمان کو دعوت دی گئی ہے، مگر وہاں بہر صورت پہنچ جانا واجب نہیں قرار دیا گیا ہے، جو کچھ واجب ہے وہ یہ کہ اس گول کی طرف اتنے قدم آگے بڑھو جتنے بڑھ سکتے ہو۔

مفاد ملی کا بت اس سلسلہ میں یعنی فریضہ اقامت دین کے سلسلہ میں ہمارے لئے سب سے زیادہ حیران کن جو شے ہے وہ "مفاد ملت" کے تقصانات کا ذکر ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ مسلمان کو

"کُونُوا قَوّٰمِیْنَ بِالْقِسْطِ شُهَدَآءَ لِلّٰهِ وَلَوْ عَلٰٓی اَنْفُسِكُمْ اَوِ الْوَالِدَیْنِ وَالْاَقْرَبِیْنَ (نساء-۲۰)

قسط پر (بہر حال میں) مضبوطی سے قائم رہنے والے اور اللہ کے لئے (حق کی) شہادت دینے والے بنو اگرچہ اس (قسط پر قائم رہنے اور اس شہادت حق) کی

زد خود تمھارے ہی اوپر یا تمھارے والدین یا اقربا ہی پر کیوں نہ پڑتی ہو" کی تعلیم دی گئی تھی اور جس کے متعلق طے کر دیا گیا ہے کہ

اِنَّ اللّٰہَ اشْتَرٰی مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ اَنْفُسَھُمْ وَاَمْوَالَھُمْ بِاَنَّ لَھُمُ الْجَنَّۃَ (توبہ - ۱۴)

اللہ تعالیٰ نے مومنوں کی جانیں اور ان کے مال جنت کے عوض خرید لیے ہیں۔

اب اس کو اس امر کی تلقین کی جا رہی ہے کہ تو حق اور عدل و قسط کی راہ چھوڑ دے اگر اس کے اختیار کرنے میں تیری قوم کا نقصان ہوتا ہو اور خدا کی رضا جوئی کو دور پھینک دے اگر اس سے تیری جان و مال پر آنچ آتی ہو، آخر مفاد ملت کے نام پر اقامت دین کے فرض سے ہاتھ اٹھانے کا مطلب اس کے سوا اور کیا ہے کہ اب مسلمان کی نگاہ میں مرکزی اہمیت دین اور قیام دین کو نہیں بلکہ اس کے اپنے معاشی و سیاسی مفاد کو حاصل ہو گئی ہے۔ اب وہ کوئی ایسا طریق کار نہیں اختیار کر سکتا جس میں کلمہ حق کی سربلندی اور مطالبات دین کی بجا آوری تو ہو مگر اپنے یا اپنی "قوم" کے مفاد خطرے میں پڑتے ہوں، اس کو چاہئے کہ دین کو دنیا پر، آجلہ کو عاجلہ پر، معاد کو معاش پر، رضائے الٰہی کو مفاد قومی پر، شہادت حق کو مقاصد سیاسی پر، اقامت دین کو مصالح ملی پر یعنی مقصد زندگی کو زندگی پر قربان کر دے۔ العیاذ باللہ، یہ ذہنیت ہے آج ہم مسلمانوں کی اور یہ انداز فکر ہے پیروان قرآن کا، جس پر کفر اور ارتداد بھی عش عش کر اٹھے۔ ہم اس نظریہ کے واضعین اور عاملین سے اس کے سوا کچھ نہیں کہنا چاہتے کہ

"کوئی آدمی دو مالکوں کی خدمت نہیں کر سکتا۔ تم خدا اور دولت

دونوں کی خدمت نہیں کر سکتے" (حضرت مسیحؑ)

اس نظریہ کے ساتھ خدا پرستی کا جوڑ کبھی نہیں لگ سکتا۔ جس مفاد قومی کا آپ شور مچا رہے ہیں۔ وہ ایک خطرناک بت ہے جس کو توڑے بغیر اسلام کا مفاد پورا نہیں کیا جا سکتا۔

زمانۂ نبوت میں منافقین کا نقطۂ نظر یہ تھا اور ان کے نفاق کی بنیاد اس چیز پر تھی کہ نَخْشٰۤى اَنْ تُصِيْبَنَا دَآىِٕرَةٌ۔

ہم کو ڈر ہے کہ اگر ہم کھلم کھلا اور یکسو ہو کر اسلامی جماعت میں شامل ہو گئے تو ہم کو مصیبتیں گھیر لیں گی اور اسلام کی وجہ سے ہم سارے جہاں کی عداوتوں کا نشانہ بنیں گے۔ اسی طرح بہت سے کافروں کا بھی کہنا یہ تھا کہ محمدؐ! تمھارے باتوں کی صحت و صداقت کا ہم انکار نہیں کرتے مگر،

اِنْ نَّتَّبِعِ الْهُدٰى مَعَكَ نُتَخَطَّفْ مِنْ اَرْضِنَا۔

اگر ہم آپ کے ساتھ ہدایت الٰہی کی پیروی کر لیں تو فوراً اپنی مادر وطن سے مار کر نکال باہر کر دیے جائیں گے۔

یہ دونوں گروہ اتباع حق کے بارے میں جس طرز فکر و استدلال سے کام لے رہے تھے کیا وہی طرز فکر و استدلال آج بھی مفاد قومی کے نعروں کے پیچھے کام نہیں کر رہا ہے ؟ قرآن سراپا حق ہے، پیغمبر صادق و مصدق ہے۔ اتباع اسلام ہی ذریعہ نجاح و فلاح ہے، لیکن اگر قرآن کے مطالبے، رسول کے فرمان اور اسلام کے اصول و مقتضیات پر عمل ہوا تو ہم برباد ہو جائیں گے، ہم کو اندیشہ نہیں بلکہ یقین ہے کہ زمانہ بھر کی آفات و بلیات ہم پر ٹوٹ پڑیں گی، ذرہ ذرہ ہماری مخالفت پر کمر باندھے گا اپنی "مادر وطن" کو انگریزہی کے قبضہ میں رہنے دیں گے یا برادران

وطن کے اقتدار میں دے دیں گے اور ہم خود غلام اور اچھوت، مفلس
و پسماندہ اور خدا جانے کیا کیا ہو جائیں گے! کاش مسلمان اپنے خلاف
اللہ تعالیٰ کو ایسی کھلی ہوئی حجتیں دینے سے قبل ذرا سوچ لیتے کہ ہم اپنی
زبانوں سے کیا کہہ رہے ہیں۔ یہ تو مفاد قومی کا بچانا نہیں ہے بلکہ اللہ
کے غضب کو دعوت دینا ہے۔

پھیر کے راستے

اب رہا یہ سوال کہ آیا ہم اس نصب العین کیلئے
براہ راست جدوجہد کرنے کے بجائے کوئی پھیر کی
راہ اختیار کر سکتے ہیں؟ سو اس کے متعلق تجربہ اور عقل دونوں کا متفقہ
فیصلہ یہ ہے کہ یہ طرز عمل سراسر غلط اور ناکام ہے۔ اور حق کی فطرت بھی اس سے
اِبا کرتی ہے۔ اب تک کی تاریخ یہی بتلاتی ہے کہ جن لوگوں نے بھی اس
مقصد کو اپنا مقصد زندگی قرار دیا ہے ان میں سے کسی نے بھی یہ پالیسی
اختیار نہیں کی۔ متمدن یا غیر متمدن، آزاد یا غلام، دولت مند یا مفلس
غرض جس قسم کی قوم کے اندر بھی کوئی داعی حق اور علم بردار قیام دین آیا
اس نے سب سے پہلی آواز جو منہ سے نکالی وہ یہی تھی کہ "اے بندگان
خدا! خدا کی بندگی اور طاغوت سے اجتناب اختیار کرو" ہم تفحص کے باوجود
کسی نبی کو اس پالیسی سے ہٹ کر کوئی دوسری پھیر والی پالیسی اختیار
کرتے ہوئے نہیں پاتے۔ انھوں نے ایسا کیوں کیا؟ ابھی اس سوال
کو چھوڑ دیجئے، پہلے اس حقیقت کو پوری جستجو اور تنقید کے ساتھ پرکھ لیجئے
کہ ایسا ہی ہوا یا نہیں؟ اگر ایسا ہوا اور یقیناً ہوا، تو پھر ان لوگوں کے لئے
جو اسوۂ انبیاء ہی کو اپنا مرجع کل ماننے کے مدعی ہیں، اس طریق کار کو ترک
کرنا جائز کسی حجت شرعی کی بنا پر ہو سکتا ہے؟ اگر حالات زمانہ کے اختلافات

کوئی چیز ہیں تو کیا اس بات کا دعویٰ کیا جا سکتا ہے کہ تمام انبیاء کے زمانہائے بعثت تو بالکل یکساں نوعیت کے تھے، جس کی وجہ سے ان سب کے طرز عمل میں اتنی کامل یکسانی اور مماثلت پائی جاتی ہے اور یہی بیسویں صدی کا ایک ایسا انوکھا اور غیر معمولی زمانہ ہے جس کے حالات یکایک اب تک کی پوری تاریخ انسانی کے حالات سے بالکل مختلف ہو گئے ہیں ظاہر ہے کہ اس طرح کا دعویٰ کوئی بھی عاقل نہیں کر سکتا اور سب جانتے ہیں کہ کچھ غیر متغیر حقائق تو ایسے ہیں جو تمام زمانوں میں مشترک رہے ہیں اور آئندہ بھی رہیں گے مگر عوارض وظواہر اور احوال وظروف ہر دور کے الگ الگ ہوتے رہے ہیں اور آئندہ بھی ہوتے رہیں گے، اس لئے اگر ان ظاہری خصوصیات کا لحاظ کیا جائے تو جس طرح آج کا زمانہ پہلی صدی ہجری سے مختلف ہے۔ اسی طرح پہلی صدی ہجری کا زمانہ دور عیسوی سے اور دور عیسوی دور موسوی سے بھی مختلف تھا، اس لئے اگر اختلاف احوال کے باوجود تمام انبیاء نے متفقہ طور پر ہمیشہ براہ راست جدوجہد کی پالیسی اختیار کی تو اس اختلاف کے باوجود بھی، جو ہمارے زمانہ اور پچھلے زمانوں میں بظاہر نظر آتا ہے ہمارے لئے اس کے سوا کوئی چارہ کار نہیں کہ یہی پالیسی اختیار کریں۔ کیونکہ اس کام کے لئے کوئی دوسرا طریقہ کبھی آزمایا ہی نہیں گیا۔ اور تمام انبیاء کا اسی طریق کار کو اختیار کرنا اس بات کی دلیل ہے کہ اس جدوجہد کا مزاج ہی اسی قسم کا ہے کہ اس کے لئے براہ راست اقدام کیا جائے۔ یہ دلیل یقین سے بڑھ کر ہم کو حق الیقین اور عین الیقین کی حد تک پہنچا دے سکتی ہے اگر ہم اس چیز کو سامنے رکھ لیں کہ بعض انبیاء

کو پھیر کی پالیسی اختیار کرنے کے بہتر سے بہتر مواقع ہاتھ آئے مگر انھوں نے پوری صفائی کے ساتھ ان کو ٹھکرا دیا۔ سید الانبیاء صلعم کے سامنے قریش نے یہ پیش کش کی کہ آپ کو ہم اپنا بادشاہ بنا لیتے ہیں اور اس کے لئے ہم آپ سے یہ مطالبہ بھی نہیں کرتے کہ آپ اپنی "دعوت توحید" سے دست کش ہو جائیں، آپ سے ہماری صرف اتنی گذارش ہے کہ آپ ہمارے بتوں کو برا کہنے اور ہمارے جذبات کو ٹھیس لگانے سے باز رہیں۔ غور فرمایئے کہ آج کے اہل سیاست و تدبر کے نقطۂ نظر سے یہ کتنا اچھا اور مغتنم موقع تھا کہ رسول اللہ اس پیشکش کو قبول فرماکر ایک طرف تو ان مصیبتوں اور فتنوں کا خاتمہ کر لیتے جو ان کی اور ان کے پیرووں کی زندگی اجیرن کئے ہوئے تھے، دوسری طرف تخت حجاز پر قابض ہو کر حکمت و تدبر اور مصلحت شناسی کے ساتھ اپنے حاکمانہ اثر و اقتدار سے کام لیتے ہوئے تدریجاً اپنی منزل مقصود کی طرف مارچ کرتے اور رفتہ رفتہ دین حق کو مملکت حجاز و عرب پر قائم کر دیتے۔ مگر آپ کو معلوم ہے کہ پیغمبر عالم نے اس "مغتنم" موقع پر کیا طرز عمل اختیار کیا اور اس پیش کش کا کیا جواب دیا؟ یہ کہ "خدا کی قسم اگر میرے داہنے ہاتھ میں سورج اور بائیں ہاتھ میں چاند رکھ دئے جائیں تو بھی میں اپنی دعوت حق اور اپنے طریق کار سے باز نہ آؤں گا۔" یہ کسی پر جوش اور ماؤف الدماغ انقلابی نوجوان کے الفاظ نہ تھے بلکہ اس معلم حکمت اور راز دان حقیقت کے الفاظ تھے جس کے متعلق ہمارا ایمان ہے کہ اس کے دل اور زبان پر براہ راست خدا کی نگرانی قائم تھی اور جس نے کبھی کوئی بات جذبات کے ہیجان میں نہیں کہی۔ اس لئے

ایک مومن کا ذہن تو اس وہم کو اپنے قریب بھی نہ پھٹکنے دے گا کہ آنحضرتؐ نے اس موقع اور اس طریق کار کے ہاتھ آتے ہوئے بھی عمداً ان کو ترک کر دیا جو حصول مقصد کے لئے براہ راست جدوجہد سے زیادہ موزوں اور کارگر تھے۔ یا یہ کہ ان میں۔ نعوذ باللہ دور حاضر کے مدبروں کی اتنی بھی انجام بینی نہ تھی اور نہ یہ صلاحیت تھی کہ "احوال وظروف زمانہ" کے مطالبات ومقتضیات کا اندازہ کر سکتے" اور وقت وماحول کی مصلحت سے اس پالیسی کو قبول کر لیتے۔

اب ہم یہ سمجھنے سے قاصر ہیں کہ انبیائے کرام کے اس اسوے اور متفقہ طریق کار کے ہوتے ہوئے ہم کو کس اسوہ اور لائحہ عمل کی ضرورت ہے۔ نظری حیثیت سے بھی دیکھئے تو اس طرز فکر اور اس نظریہ میں بے بنیاد وہموں اور طفلانہ خوش گمانیوں اور خود فریبیوں کے سوا کچھ نظر نہ آئے گا۔ پھیر کے راستے اختیار کرنے کے معنی یہ ہیں کہ حق کو باطل نما بنا کر پیش کیا جائے اور جس باطل میں آپ پڑے ہوئے ہیں اس سے نکل کر حق کی طرف بھاگنے کے بجائے ایک دوسرے باطل کے سایہ میں جا کھڑے ہوں کیونکہ اگر آپ موجودہ باطل ماحول کو درہم کر کے ایک ایسا ماحول قائم کریں جو حق نہ ہو تو لازماً باطل ہی ہوگا۔ جس کا رنگ و روغن تو نیا ہوگا مگر فطرت بہر حال وہی ہوگی جو موجودہ باطل کی ہے۔ آپ کہتے ہیں کہ ہم اس پر اثر ڈال کر اپنے نصب العین کے لئے زیادہ سازگار بنائیں گے۔ مگر افسوس ہے کہ دنیائے عمل میں اس خام خیالی کی کوئی قیمت نہیں، باطل کبھی حق کا سازگار نہیں ہو سکتا۔ اور اس میں حق کے جو پیوند آپ بہزار دقت لگائیں گے وہ آپ کے

مقصد کے لئے خالص باطل اجزا سے زیادہ ہی مضر ثابت ہوگا۔ دور نہ جائیے اسی ہندوستان میں بہت سی "اسلامی ریاستیں" قائم ہیں جنہیں وہ تمام باتیں موجود ہیں جن کا آپ آئندہ نظام ملکی میں جوڑ لگانا چاہتے ہیں، مگر وہاں اقامت دین کا نام ہی لے کر دیکھئے، جیل کا دروازہ اپنے سامنے کھلا ہوا پائیں گے۔ آپ اپنی اس جدوجہد میں غیر ملکی حکومت ہی کو سدّ راہ سمجھتے ہیں اور اسی لئے اس کے مٹ جانیکا انتظار کر رہے ہیں۔ مگر آپ شاید بھولتے ہیں کہ حضرت مسیح کے مشن کے متعلق روحی اقتدار ابھی خاموش ہی تھا کہ ان کی اپنی ہی قوم یا یوں کہیئے کہ اس وقت کے "مسلمانوں" ہی نے بڑھ کر اس مشن کا گلا گھونٹ دیا۔ پھر اپنی حال ہی کی تاریخ پر نظر ڈالیئے۔ شیخ عبدالوہاب نجدی کی تحریک کا متعلقہ "اسلامی" حکومتوں نے کس تپاک سے استقبال کیا، شیخ جمال الدین افغانی نے ایک جزئی دینی تحریک کا نام لیا اور آپ کی انہی موجودہ اسلامی حکومتوں نے ان کو رہنے کیلئے جگہ دینے سے انکار کر دیا۔ اور اگر آج بھی کسی کو ہمت ہو تو ان ممالک میں جا کے یہ آواز اٹھا کر قدرِ عافیت معلوم کر سکتا ہے۔

درحقیقت یہ دفع الوقتی کی باتیں ہیں اور یہ نظریہ اسی ذہنیت کی پیداوار ہے جس نے قرآن کے احکام و مطالبات کی "ناسازگاریوں" سے گھبرا کر مطالبہ کیا تھا کہ "اس کے بجائے کوئی دوسرا قرآن لائیے یا اسی میں کچھ ایسی ترمیمیں کر دیجئے جو زمانہ اور ماحول سے ہم آہنگی پیدا کر سکیں"۔ اس طرز پر سوچنے والوں کی نگاہ شاید اس طرف نہیں جاتی کہ دنیا کے جو ہنگامے آج ہیں، کل بھی رہیں گے اور جو مصالح اور مشکلات

آج ان کا راستہ روک رہی ہیں۔ آئندہ بھی ان میں کوئی کمی رونما نہ ہوگی، جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ یہ پھیر کی راہ اختیار کرنے کے اسباب و محرکات نہ کبھی ختم ہوں اور نہ اقامت دین کے لئے کبھی براہ راست جدوجہد کی جائے۔

گرفتاران یاس دائمی

تیسرا گروہ جو کچھ کہتا ہے اور اس کے نظریات اور دلائل کی جو فہرست ہے، اس کا بڑا حصہ تو وہی ہے جو دوسرے گروہ کی زبانی گذشتہ بحث میں آپ سن چکے ہیں۔ اس لئے ان کو دوبارہ نقل کرنے اور ان کی غلطی واضح کرنے کی ضرورت نہیں۔ لیکن بعض حیثیتوں سے یہ لوگ ان کی بہ نسبت ایک قدم آگے ہیں اور ترک فرض اور فراموشیٔ عہد کی جو بیماری وہاں سیاسی تدبر اور زمان و مکان کی مصلحتوں کے پردوں میں چھپا دی گئی تھی، یہاں صاف گوئی اور "جرات" کے ساتھ علانیہ ظاہر کر دی گئی ہے اس لئے ان لوگوں کے ظاہر و باطن کی یک رنگی کا ہم اعتراف کرتے ہیں۔ گو اس قلت حیائے ایمانی کا احساس دل پر چوٹ لگاتا ہے جو اس اظہار "جرات" کے نیچے کام کر رہی ہے اور کچھ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ گویا ان لوگوں نے اپنے جسم سے کپڑے اتار کر پھینک دیئے ہیں خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ ان میں سے کتنوں نے بہ حیاکشی ہوش و بیداری کے عالم میں کی ہے اور کتنوں نے غفلت و بے ہوشی کی حالت میں؟ ایک طرف اقامت دین کی اس اہمیت کو سامنے رکھیئے کہ اسلام اور قیام دین کی سعی وجہد میں باہم وہی تعلق ہے

جو ایک زندہ انسان کی زندگی اور اس کی حرکت قلب میں ہے
جیسا کہ ہم اوپر دلائل کی روشنی میں واضح کر چکے ہیں، پھر اس کے بعد
ان لوگوں کی ان ــــــ بظاہر عاجزانہ مگر فی الواقع باغیانہ ــــــ
باتوں کا گہری نظر سے تجزیہ کیجئے کہ یہ "نصب العین ہے تو بالکل
برحق، مگر ہم جیسے کمزور لوگوں کے بس کا یہ کام نہیں ہے۔ جس مشن
کو پیغمبر کی تربیت یافتہ جماعت بھی تیس برس سے زیادہ نہ چلا سکی اس
کے لئے ہم جیسے ضعیف الایمان لوگوں کا دم خم دکھانا تقدیر سے لڑنا
ہے۔ اب وہ زمانہ واپس نہیں آسکتا جو تیرہ سو برس پہلے گذر چکا"
تو توقع ہے کہ اس تجزیہ سے آپ پر بھی وہی حقیقت منکشف ہوگی
جو ہم کہنی چاہتے ہیں۔ جب اقامت دین کی جدوجہد سے برضا و رغبت
کنارہ کش ہوکر، اور باطل کے مقابلہ اور منکرات کے ماحول میں عدم
مداخلت اور صلح کل کی پالیسی اختیار کرکے انسان پیروان اسلام کی
صف پائین میں بھی جگہ نہیں پاسکتا اور اللہ کے رسول نے ایسے انسان
کو ایمان کے آخری ذرے سے بھی محروم قرار دیا ہے تو بڑی سے بڑی
کمزوری اور مایوسی بھی اس فرض کی انجام دہی سے ایک لمحہ کے لئے
بے تعلق نہیں کرسکتی اور اگر کہیں یہ بے تعلقی ہے تو وہاں کسی کمزور سے
کمزور ایمان کی تلاش بھی بے سود ہے۔ اسلام نے اپنا کوئی ایسا
"ستا ایڈیشن" شائع نہیں کیا ہے جس کے تحت اس "دم خم دکھانے"
اور "تقدیر سے لڑنے" سے نجات ممکن ہو۔ وہ شخص دھوکہ میں ہے جو
یہ سمجھے بیٹھا ہے کہ اس لازمۂ ایمانی سے بے بہرہ رہ کر بھی ایمان و رضائے
الٰہی کی کوئی مقدار حاصل کی جاسکتی ہے۔

تاریخ خلافت کی غیر متعلق بحث

ان لوگوں کے فکر و عمل کی بنیادوں میں سب سے زیادہ اہمیت اور مرکزیت جس چیز کو حاصل ہے اور جس کا گذشتہ مباحث میں ابھی تک تنقیدی جائزہ نہیں لیا گیا ہے وہ یہ ہے کہ "جو چیز صحابہ کے ہاتھوں بھی تیس برس سے زیادہ نہ قائم رہ سکی اس کے لئے کوئی سعی بالکل لاحاصل ہے"۔ یہ ایک المناک حقیقت ہے کہ مسلمانوں کے دلوں میں مایوسی اور دل شکستگی کا زہر پیدا کرنے میں اس فقرہ نے جتنا موثر پارٹ ادا کیا ہے، اس کا اندازہ نہیں کیا جا سکتا۔ اس حقیقت کی المناکی کا صحیح ادراک اسی وقت ہو سکتا ہے جب یہ معلوم ہو جائے کہ جس چیز کو بنیاد قرار دیکر اقامت دین کے فرض کو ساقط سمجھ لیا گیا ہے، اس کا اس فرض کی ادائگی سے کوئی تعلق ہی نہیں۔ ذرا سوچئے تو سہی کہ کسی نظریہ، کسی اصول اور کسی نصب العین پر ایمان لانے کا دعویٰ کرنا اور ساتھ ہی اس کے اتباع سے اور اس کے مقتضیات ادا کرنے سے اس بنا پر انکار کر دینا کہ اس نصب العین کو بھی زمانۂ دراز تک برقرار نہیں رکھا جاسکا، اپنے اندر معقولیت کا کوئی شمہ رکھتا ہے؟ اس سے بڑھ کر قول و عمل کے تضاد کی مثال اور کیا ہو سکتی ہے؟ سوال یہ ہے کہ آپ نے اس نظریے کو اس لئے اپنا مقصد زندگی ٹھیرایا ہے کہ وہ فی نفسہٖ حق ہے اور اس کی حقانیت کا علم و یقین اس کو اپنانے پر مجبور کر رہا ہے یا اس کا کوئی دوسرا سبب ہے اگر کوئی دوسرا سبب ہے تو پھر آپ سے نہ کوئی مطالبہ ہے نہ آپ پر کسی جد و جہد کے ترک کرنے کا الزام، لیکن اگر پہلی بات ہے۔ جیسا کہ توقع کی جانی چاہیئے۔ تو ایک کافر بھی آپ کو یہ طرز استدلال

اختیار کرنے میں حق بجانب نہیں قرار دے سکتا، تیس اور چالیس برس تو نہیں اگر ایک دن بھی یہ مشن کامیابی کے ساتھ نہ چل سکا تو اس سے آپ کی ذمہ داریوں میں ذرہ پھر بھی تخفیف نہیں ہو سکتی۔ اس کیلئے سر دھڑ کی بازی لگائیے، اس لئے کہ آپ نے اس کو حق کہا ہے اور اس کی علمبرداری کا دعویٰ کیا ہے، یہ دیکھنے کی گنجائش کہاں ہے کہ اس راہ میں کس نے کیا کیا اور کب کیا گیا؟ آپ کے فرائض کی تعیین وہ نصب العین کرے گا جس کو حق سمجھ کر آپ نے قبول کیا ہے، تاریخ نہیں کرے گی۔

لیکن اگر آپ کو اپنی اس "دلیل" پر گہرا اعتماد اور اصرار ہے اور اس میں اتنا وزن محسوس کرتے ہیں کہ وہ اقامت دین کی ذمہ داری سے سبکدوش کر دینے کے لئے کافی ہے تو ہم گذارش کریں گے کہ ذرا اس کو اور وسعت دے دیجئے اور اسی اصول پر یوں سوچنا شروع کیجئے کہ مسلمان کی جو صفات و خصوصیات کتاب و سنت میں بیان کی گئی ہیں اور ایمان و اسلام کا جو معیار اللہ اور اس کے رسول نے پیش کیا ہے اس معیار پر پورے اترنے والے اور ان صفات و خصوصیات کے حامل انسان ابوبکر صدیق، عمر فاروق، عثمان غنی، علی مرتضیٰ، ابوذر غفاری، سلمان فارسی، صہیب رومی، بلال حبشی رضوان اللہ علیہم اجمعین اور ان ہی کی طرح کے چند سو یا چند ہزار نفوس سے زیادہ نہیں پیدا ہو سکے، اور اس وقت تو اس معیار کے مسلمانوں کا عالم تصور میں بھی وجود ممکن نہیں، اس لئے اب ایسے معیاری دینی کا ذکر او خیال ہی چھوڑ دینا چاہئیے اور اسلام کی ان مطلوبہ صفات و خصوصیات،

کے لئے سعی و جہد کرنا بالکل لاحاصل ہے، یہ ہم جیسے کمزور انسانوں کے بس کا کام نہیں ہے۔" اگر اجتماعی میدان میں خلافت راشدہ کی قلت عمر اس امر کا حق دے سکتی ہے کہ اب قیامت تک کے لئے قیام دین کے تصور سے ذہنوں کو خالی کر لیا جائے تو کوئی وجہ نہیں کہ انفرادی زندگی میں بھی اس استحقاق معذرت کو قبول نہ کیا جائے۔ لیکن یہ عجیب ماجرا ہے کہ باوجود اس کے کہ اب ایک ابوبکر بھی پیدا نہیں ہو رہا ہے۔ آپ نہ صرف خود کمال ایمانی کے حصول سے مایوس ہو کر اسلام سے علیحدگی پر تیار نہیں بلکہ گمراہوں کو راہ یاب، جاہلوں کو دین، آگاہ اور غیر مسلموں کو مسلمان بنانے کے لئے زندگیاں وقف کئے ہوئے ہیں، تبلیغی انجمنیں قائم کرتے ہیں، اشاعت دین کے ادارے کھولتے ہیں، تعلیم کتاب و سنت کے لئے درسگاہیں جاری کرتے ہیں۔ آخر ایسا کیوں ہے؟ کیوں نہیں ایسا ہوتا کہ صدیقؓ و فاروقؓ کی سی اسلامیت کے حصول سے، کہ قرآن کا معیار مطلوب یہی ہے، مایوس ہونے کے باعث اسلام کا نام لینا چھوڑ دیا جاتا؟ آپ کہیں گے کہ ابوبکر صدیق اور عمر فاروق اسلام کے کامل العیار اور اعلیٰ نمونے تھے۔ ان کے مقابل کا ایمان و تقویٰ اگر ہم نہیں پیدا کر سکتے تو اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ سرے سے اسلام ہی کو چھوڑ دیں، بلکہ ان نمونوں کو سامنے رکھ کر ہم اپنی استطاعت کے مطابق کوشش کریں گے کہ جہاں تک ہو سکے انہی کی طرح کا تدین اپنے اندر پیدا کریں۔ تاریخ نے ہمارے سامنے اسلام کے یہ اعلیٰ ترین نمونے رکھ دیئے ہیں تاکہ اپنے امکان بھر ہم اپنے کو ان پر ڈھالنے کی سعی کریں۔ اب جس کو اللہ تعالیٰ جتنی توفیق دے اس حد تک اس رنگ میں اپنے

آپ کو رنگنے کی کوشش کرے اور ان کے مقام ایمانی کی طرف جتنے قدم بڑھا سکتا ہے بڑھاتا رہے" ہم اس طرز فکر سے سو فیصدی اتفاق کرتے ہیں۔ ہماری گذارش بالکل اسی مرکز فکر پر مبنی ہے فرق صرف یہ ہے کہ آپ اس کو انفرادیت کے ایک محدود دائرہ میں رکھنا چاہتے ہیں اور ہم اسی کو اجتماعیت تک پھیلا دینا چاہتے ہیں۔ ہمارا مدعا یہ ہے کہ اسی نقطۂ نگاہ سے آپ کو خلافت راشدہ کے اوراق تاریخ کو بھی دیکھنا چاہئے۔ ابوبکر اور عمر اور عثمان و علی رضوان اللہ علیہم کی انفرادی زندگیوں کی طرح ان کا طرز خلافت اور ان کی نیابت رسول بھی ایک اعلیٰ معیار تھی جسے اللہ تعالیٰ کی حکمت و مشیت نے تاریخ کے سینہ میں محفوظ کر دیا ہے تاکہ دعوت قرآنی کے علم بردار اپنی جدوجہد کے سلسلہ میں اپنے سامنے ایک عملی اور معیاری نمونہ رکھ سکیں اور جس حد تک ان کے دست و بازو میں خدا نے توانائی بخشی ہو، اس نمونہ کے اتباع میں صرف کریں اور اس وقت تک اطمینان کا سانس نہ لیں جب تک کہ اللہ کا دین اپنی رحمتوں کے ساتھ اس زمین پر اسی طرح نہ چھا جائے جس طرح خیرالقرون میں چھا گیا تھا حتیٰ لاتکون فتنۃ ویکون الدین للہ

پس اس تیس سالہ دور خلافت کو اپنے لئے مثال اور ایک اسوہ بنائیے اور اس کے جمال جہاں آرا کے عشق سے ہمہ دم اپنے سینوں کو گرم رکھئے۔ حیف ہے اگر اس کے نام سے دلوں میں مایوسی اور افسردگی کی لہریں اٹھیں۔ اس نام میں تو بلا کی کشش اور اس کشش میں طوفان کا سا جوش بھرا ہوا ہے، اگر ہمارا یقین ہے کہ دنیا کو فلاح و سعادت صرف دین حق کے قائم ہونے ہی پر مل سکتی ہے، اور اگر ہمارے قلوب

اس مبارک زمانہ کی سچی قدر اور محبت رکھتے ہیں جب کہ دنیا میں خلافت راشدہ قائم تھی تو اس یقین اور اس محبت کا فطری تقاضا یہ ہونا چاہیئے کہ دل اس افسانہ کہن کو ازسرنو عالم واقعات میں دیکھنے کے لئے ٹھیک اسی طرح بے قرار رہے جیسے کہ کسی کی کوئی عزیز ترین شے کھو گئی ہو اور وہ اس کی جستجو میں دیوانہ وار سرگرداں پھر رہا ہو۔ جس شخص کے ایمان میں یہ شورش نہ ہو وہ دراصل ایمان ہی نہیں۔ بلکہ تصورات کا ایک بتکدہ ہے۔

متربصین کا گروہ

اب ان حضرات کے افکار و اعمال کا جائزہ لیجئے جو انتظار اور تربص کی پالیسی پر عمل پیرا ہیں اور خود سلامتی و بے فکری کے محفوظ گوشوں میں بیٹھے ہوئے دوسروں کی ثبات قدمی اور تیزگامی کا حساب لگا رہے ہیں اور اس نصب العین ہی کو اپنی زندگیوں کا تنہا مقصد سمجھنے کے باوجود میدان سعی و عمل میں اسلئے نہیں اترتے کہ پہلے سے اس میدان میں اترے ہوئے لوگوں کی عزیمت انہیں مشکوک نظر آتی ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ اگر امام صالح اور متقی اور مقبول الصلوٰۃ نہ ہو تو یہ حضرات نہ صرف یہ کہ اس کے پیچھے ہی نماز پڑھنے سے انکار کر دیں گے بلکہ سرے سے نماز ہی ترک کر دیں گے اور غالباً اس یقین کے ساتھ ترک کر دیں گے کہ کل داور محشر کے سامنے یہ کہہ کر بری الذمہ ہو جائیں گے کہ خدایا! ہم تو نماز کو فرض عین ہی سمجھتے تھے اور چوبیس گھنٹہ اس کے لئے باوضو رہتے تھے مگر موذن کی صداؤں اور امام محلہ کی نمازوں میں ہم کو خلوص و للہیت کی روح نظر نہیں آتی تھی اس لئے ہم نے نماز نہیں پڑھی۔ ہم باوجود غور و فکر کے اس طرز فکر و استدلال کی کوئی شرعی یا عقلی بنیاد نہیں پا سکے۔ فرض کیجئے کہ زید اقامت دین کی دعوت دے رہا ہے

اور ان لوگوں کو جو اتباع قرآن اور علمبرداری اسلام کے مدعی ہیں، ان کی فرض ناشناسیوں پر جھنجھوڑ کر اور غفلت شعاریوں سے بیدار کر کے ان کا فرض زندگی یاد دلا رہا ہے اور اپنے طور پر اس راہ میں قدم بھی رکھ دیتا ہے لیکن جہاں تک اس کی علمی صلاحیت و خلوص اور عزیمت کا تعلق ہے آپ کے قلب کو پورا اطمینان نہیں ہوتا بلکہ وہ اور اس کے سارے ہم سفر نااہل بے عمل، غیر مخلص اور غیر متقی دکھائی پڑتے ہیں تو سوال یہ ہے کہ ان کی یہ ساری خامیاں آپ کے فرض کو ساقط اور آپ کو اس کی ذمہ داریوں سے سبکدوش کس طرح کر دیں گی۔ کیا آپ نے اس امر کو اس لئے حق مانا ہے کہ زید اور اس کے ساتھیوں کی یہی رائے ہے؟ کیا آپ نے دین حق کی اقامت کا فریضہ اس شرط کے ساتھ اپنا مقصد زندگی تسلیم کیا ہے کہ پہلے زید اور اس کے ہمراہی ادائے فرض کا عملی ثبوت دے لیں تو ہم اپنے نرم گرم بستروں سے اٹھیں اور اپنی جواں گاہوں سے باہر قدم نکالیں گے؟ کیا قرآن کی مرکزی دعوت کے آپ اسی وقت مکلف ہیں جب دوسروں کو اس کی راہ میں قربانیاں کرتے دیکھ لیں؟ اگر ایسا نہیں ہے، اور قرآن گواہ ہے کہ ایسا ہرگز نہیں ہے بلکہ ہر فرد اپنی استطاعت کے مطابق اس فریضہ کی بجا آوری کا بطور خود ہر حال میں ذمہ دار اور مسئول ہے، تو اپنے نفس کی حیلہ سازیاں اور غفلتیں کیا کم ہیں کہ دوسروں کی کمزوریاں ٹٹولنے کی آپ کو فرصت مل جاتی ہے دوسرے اگر فی الواقع ویسے ہی ہیں جیسا کہ آپ کا گمان ہے تو خدا کے روبرو اس کے جوابدہ وہ خود ہوں گے آپ اس کھود کرید کی زحمت بلاوجہ کیوں اٹھاتے ہیں۔ آپ اپنے نامۂ اعمال کی فکر کیجئے۔ ہاں اگر

ان کے حالات سے کچھ درس ملتا ہے تو اس کو لے لیجئے۔ لقمان حکیم سے پوچھا گیا "تم نے ادب کس سے سیکھا" جواب دیا "بے ادبوں سے" مومن کو بھی اللہ تعالیٰ نے حکیم پیدا کیا ہے اور ایسی ہی حق بین، عبرت پذیر اور حکمت پسند نگاہوں سے کام لینے کی تاکید کی ہے۔ سارا قرآن اس نے مغضوب اور گمراہ قوموں کے تفصیلی تذکروں سے اسی لئے تو بھر دیا ہے کہ مسلمان ان جیسی حرکتوں کے ارتکاب سے بچیں، اس لئے آپ کا اس صورت حال میں جو فرض ہونا چاہئے وہ صرف یہی ہے کہ ان کی خامیوں، ظاہرداریوں اور غلط کاریوں سے اپنے دامن بچا کر خالص للہیت اور عزیمت کے ساتھ اس جھنڈے کو لے کر آگے بڑھیں اور اگر ہو سکے تو ان کے لئے ہدایت، عزیمت، خلوص اور توفیق عمل کی دعا بھی کرتے جائیں کہ بہرحال ان کی چیخ پکار۔ اگرچہ ان کی اپنی حد تک محض "زبانی لقلقہ" تھی مگر آپ کے حق میں ہادی اور مذکر ثابت ہوئی، اس لئے وہ آپ کے شکریہ کے مستحق ہیں نہ کہ مخالفت کے، کہ ان کے انہی "زبانی لقلقوں" نے غفلت کے پردے چاک کر دیئے اور آپ کو بھولا ہوا سبق یاد دلا دیا۔ اس نادان اور بدنصیب انسان پر، جو تاریکیوں کے ہجوم میں سرراہ چراغ لے کر کھڑا ہو اور دوسروں کو تو ان کی منزل مقصود دکھا رہا ہو مگر خود اپنی آنکھوں پر پٹی باندھتی ہو، آپ کو ترس تو ضرور آنا چاہئے مگر اس پر آوازے کستے اور اعتراضات کرتے رہنا بے انصافی، اور راہ کی پیروی میں چراغ کی روشنی سے فائدہ نہ اٹھانا اور پشت بمنزل ہو رہنا حماقت اور دیوانگی ہے سعید وہ ہے جو دوسروں سے عبرت اور نصیحت حاصل کرے اور دانائی کا

تقاضا یہ ہے کہ قائل کی شخصیت کے بجائے اس کے قول کو دیکھا جائے پس قامت حق کی پکار سن کر ان بندگان خدا کا طرز عمل اختیار کیجئے جو سعید ہوں، جو دانا اور حقیقت جو ہوں اور جن کی تعریف قرآن کی زبان میں یہ ہے کہ:۔

الذین یستمعون القول فیتبعون احسنہ

جو باتوں کو کان لگا کر سنتے ہیں اور ان میں سے بہتر باتوں کو اپنے عمل و اتباع کے لیے منتخب کر لیتے ہیں۔

اس لئے اس "قول" —— دعوت اقامت دین —— پر اس پہلو سے بحث تو کی جا سکتی ہے کہ آیا وہ "احسن القول" ہے یا نہیں؟ لیکن جب آپ اس کو تسلیم کرتے ہیں کہ اس قول کے احسن ہونے میں کوئی شبہ نہیں اور اس کا ہر مسلمان کا تنہا فریضہ زندگی ہونا شک و ریب سے بالاتر ہے تو پھر اس پر لبیک کہیے اور اگر ساری دنیا بھی اس کے اتباع سے جی چرا رہی ہو تو یقین کیجئے کہ اس سے آپ کی اپنی ذمہ داریوں میں کوئی کمی واقع نہیں ہو سکتی اور نہ آپ کو یہ حق حاصل ہو سکتا ہے کہ دوسروں کے عمل اور عزم کا انتظار کرتے رہیں۔ یہ انتظار تو حق پرستی کی ضد ہے اور جو شخص حق کو مانتے ہوئے انتظار کی پالیسی اختیار کرتا ہے وہ دراصل حق کو بدنام کرتا اور اس کی بے حرمتی اور تضحیک کا سامان مہیا کرتا ہے۔ اگر ہمیں صاف گوئی پر معاف کیا جائے تو ہم اس موقع پر اس رسوائے عالم گروہ کی عادات و خصوصیات کو یاد دلائیں جس نے رسولؐ اور اصحاب رسول کے مجاہدات اقامت دین کے سلسلہ میں بھی تربص کی پالیسی اختیار کر رکھی تھی، جس کے

واسطے مسلمانوں کا ساتھ دینے کے لیے یہ احساس فرض کافی نہ تھا کہ یہ لوگ جس امر حق کے لیے جانفروشی کر رہے ہیں اسی کو ہم نے بھی اختیار کیا ہے اس لیے ان کے پہلو بہ پہلو مل کر اپنے فرض کو ادا کریں۔ اس کے برعکس ان لوگوں کا وطیرہ یہ تھا کہ اس کشمکش سے علیحدہ رہ کر اس کے نتائج کا اندازہ لگاتے رہتے اور اس وقت مسلمانوں کی حمایت میں آملتے جب ان کی فتح کے جھنڈے لہراتے دیکھ لیتے (الذین یتربصون بکم فان کان لکم فتح من اللہ قالوا الم نکن معکم)

غور فرمایئے کہ ان لوگوں کی ذہنیت، جو اقامت دین کو اپنا فرض منصبی سمجھتے ہوئے بھی اس کے لیے آمادۂ عمل نہیں ہوتے، کتنی بنیادی مشابہت رکھتی ہے اس ذہنیت کے ساتھ جس پر منافقوں کے طرزِ عمل کی اساس تھی؛ جس طرح وہ حق کی حمایت حق کی خاطر نہیں کرتے تھے اسی طرح ان لوگوں کے نزدیک بھی حق کا مجرد حق ہونا ہی آمادگیٔ عمل کے لیے کافی نہیں۔ فرق اگر ہے تو صرف یہ کہ وہ لوگ مسلمانوں کی فتح کا انتظار کیا کرتے تھے اور یہ حضرات قیام دین کے داعیوں کے عزم و اخلاص کے بارے میں کسی بہ شرح صدر کے منتظر ہیں۔ لیکن اتباعِ حق اور ادائے فرض سے بھاگنے میں دونوں مشترک ہیں۔

بدبختی کی انتہا کاش معاملہ یہیں ختم ہو جاتا اور ان سب لوگوں نے انتظار اور تربص کے صرف سلبی پہلو پر ہی اکتفا کر لیا ہوتا۔ مگر یہ دیکھ کر صبر و ضبط کا دامن سنبھالنا دشوار

ہوجاتا ہے کہ خدا پرستی، اتباع قرآنی اور عشق محمدی کے دعویداران امت
میں ایسے افراد بھی موجود ہیں جو اس ساعت ہمایوں کے انتظار میں شوق
مجسم بنے بیٹھے ہیں جب طاغوتی اقتدار کی لال پیلی آنکھیں دیکھ کر اقامت
دین کے "جھوٹے مدعی" میدان سے بھاگ کھڑے ہوں گے اور انھیں اپنے
جذبات طعن وتشنیع کی تسکین دہی کا موقع نصیب ہوگا۔ یہ حضرات ایک
سنجیدہ تبسم کے ساتھ یہ فرما کر گویا اپنی ذمہ داریوں کا حق ادا کر دیتے
ہیں کہ ہوش سے عاری اور جوش کے اندھے لوگوں کا ایک گروہ ہے
جو قیام دین قیام دین کا شور مچا رہا ہے، حوادث ومشکلات خود
ہی ان کا فاتحہ پڑھ دیں گے۔ لیکن شاید انھیں خبر نہیں کہ ان کے اس
نشتر طعن کی زد خود ان کی اپنی رگ گلو تک جا پہنچتی ہے۔ افسوس!
مسلمان کا دل اب قیام دین کی حسرتوں سے بھی اس درجہ محروم
ہو گیا ہے کہ اگر خود نہیں کچھ کر سکتا تو دوسروں کا کچھ کرنا بھی اس کو
گوارا نہیں رہا اور نہ اس کی نیک خواہشات کا اس کے دل میں گذر
باقی رہا۔ آخر یہ باور کرنے کے لئے کہاں سے دل ودماغ لائے جائیں
کہ جو سینہ، دین حق کی محبت اور فدویت کا امین بنایا گیا تھا اب اس
میں ان آرزوؤں کی پرورش کی جارہی ہے جو صرف مساعی کفر کے
خلاف مخصوص ہونی چاہئے تھیں۔ حالانکہ اگر میرے اندر اتنی غیرت
اور ہمت موجود نہیں ہے کہ اللہ کے دین کو زندہ اور قائم کرنے کیلئے
قدم بڑھا سکوں تو میرے ایمان کا کم سے کم تقاضا یہ ہونا چاہیئے کہ
اس کی تمنا سے اپنے قلب ودماغ کو ایک لمحہ کے لئے بھی خالی نہ
نہ ہونے دوں اور اگر کچھ اللہ کے بندے اس کے لئے قدم اٹھا رہے

ہوں تو ان کے لئے اخلاص عمل، ثبات قدم، نصرت حق، حسن انجام اور فوز مرام کی دعائیں کروں۔ لیکن اگر اتنا بھی نہیں ہو سکتا تو اس کا مطلب یہ ہے کہ غیرت حق کی آخری چنگاری بھی میرے اندر بجھ رہی ہے اور اگر اس سے آگے بڑھکر میں اس دعوت حق کو فتنہ قرار دیدوں لوگوں کو اس کی طرف بڑھنے سے روکنے لگ جاؤں اور اس کے لئے حوادث روزگار کی تمنائیں کروں تو میری بدبختی کی یہ انتہا ہوگی اور ایسی صورت میں مجھ کو اسلام کا نام لیتے ہوئے شرم معلوم ہونی چاہیے کیونکہ حالات اور مظاہر کے تھوڑے سے اختلاف کے ساتھ میں بالکل اسی مقام پر ہوں گا جہاں کچھ کور باطن لوگ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے خدا کار ساتھیوں کو اس نگاہ سے دیکھ رہے تھے جس کا ذکر قرآن نے ان لفظوں میں کیا ہے:۔

یتربص بکم الدوائر (توبہ - ۱۸)

یہ لوگ تمھارے نذر آفات ہونے کا انتظار کر رہے ہیں۔

یا پھر وہاں جہاں سے پیغمبر عالم کی دلنشین اور مسحور کن صدائے حق کو یہ کہکر ٹالا گیا تھا کہ:۔

شاعر نتربص بہ ریب المنون (طور - ۳)

یہ ایک (سحر طراز) شاعر ہے، ہم اس کے لئے حوادث روزگار کی راہ دیکھ رہے ہیں۔

پس جنھیں اللہ نے عقل دی ہے انھیں پوری سنجیدگی اور احساس ذمہ داری کے ساتھ اس طرز عمل پر غور کرنا چاہیئے جو نری جہالت کی پیداوار ہے اور جس کے ساتھ ایمان کی محبت کبھی جمع نہیں ہو سکتی۔

مہدی موعود کے منتظر

آخری گروہ ان لوگوں کا ہے جو مہدی موعود کے انتظار میں بیٹھے ہیں۔ ان کے فکرو استدلال کا آغاز یہ ہے کہ آنحضرت صلعم نے تیس سال کے بعد خلافت راشدہ ختم ہو جانے اور پھر قرب قیامت میں امام مہدی کے ہاتھوں اس کے از سر نو قائم ہونے کی خبر دی ہے" اور نقطہ انجام یہ ہے کہ "اس نصب العین کے برحق ہونے کے باوجود ہم اس کی اقامت کے مکلف نہیں " دین اور اس کے اصول و مطالبات سے بے خبری کا یہ عالم ہے کہ اب اس قسم کی باتوں کو بھی دلیل سمجھا جاتا ہے اور اتنی زبردست دلیل، جو مسلمان کی زندگی کا مطمح نظر ہی بدل دے سکتی ہے ضرورت تو نہ تھی کہ اس قسم کی مہمل باتوں کی تردید میں وقت کا غذ اور روشنائی کا ضیاع برداشت کیا جاتا مگر اس مصیبت کا کیا علاج کہ اس افیون کی گولی نے نہ صرف ہمارے عوام بلکہ کتنے ہی مدعیان علم اور ارباب تقویٰ کو مدہوش اور بے حس بنا رکھا ہے اس لئے انھیں بتا دینے کی ضرورت ہے کہ جس دیوار کا تم نے سہارا لے رکھا ہے اس کی بنیاد ریت سے اٹھائی گئی ہے تاکہ جس کو ترک فرض کی ہلاکت خرید لی ہو پورے علم و شعور کے ساتھ خریدے۔

روایا مہدی کی حیثیت

سب سے پہلے یہ دیکھنا چاہئے کہ ظہور مہدی کی خبر ہمیں ملی کہاں سے ہے اور حقائق دینی کی فہرست میں اس کا مقام کیا ہے؟ سو ہر صاحب علم جانتا ہے کہ قرآن کے صفحات اس کے ذکر سے بالکل خالی ہیں۔ حالانکہ اگر تعلیمات دین میں اس امر کو کوئی ایسی اہمیت ہے جو ہماری

زندگی کا مقصد ہی بدل دے سکتی ہو، حاصل ہوتی تو عقل عام چاہتی
ہے کہ قرآن اس کے متعلق ہم کو واضح ہدایتیں دیتا۔ لیکن ایسا نہیں
ہوا۔ لے دے کر اس کا ذکر روایتوں میں آتا ہے مگر یہ روایتیں
بھی اس پایہ کی ہیں کہ طبقہ اولیٰ کی کتب احادیث میں سے کسی ایک
کے اندر بھی وہ بار نہ پا سکیں، نہ امام بخاری نے ان کو درخور اعتنا سمجھا،
نہ امام مسلم نے، نہ امام مالک نے، صرف بعد کے طبقہ کی کتابوں میں یہ
دکھائی پڑتی ہیں، لیکن جب ان کو محدثانہ معیار تحقیق پر رکھ کر پرکھا
جاتا ہے تو ایک روایت بھی کھری ثابت نہیں ہوتی اور ان کے اکثر و
بیشتر راوی شیعہ نکلتے ہیں۔ روایت کے الفاظ پر نگاہ ڈالیے تو ان
میں صاف طور پر شیعوں کے مخصوص عقائد اور خیالات کی روح جھلکتی
نظر آتی ہے۔ یہ وجوہ ہیں جن کی بنا پر علمائے محققین کا ایک گروہ ان
احادیث کو افسانہ سے زیادہ حیثیت نہیں دیتا۔

نرالی منطق

لیکن اگر ہم یہ مان بھی لیں کہ یہ احادیث موضوع نہیں
ہیں اور فی الواقع آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ظہور
مہدی کی پیشین گوئی کی ہے تو سوال یہ ہے کہ اس کو اقامت دین کے
فریضہ سے کیا تعلق؟ اس سے زیادہ سے زیادہ جو چیز ثابت ہوتی ہے
وہ اتنی ہی تو ہے کہ اس دنیا کا نظام فنا ہونے سے پہلے ایک دور مبارک
آئے گا جب سطح زمین کے ایک ایک گوشہ سے ظلم اور فساد مٹ جائے گا
دنیا عدل سے بھر جائے گی اور ابوبکر صدیقؓ اور عمر فاروقؓ کی طرح کی
"خلافت علیٰ منہاج النبوۃ" ہفت اقلیم میں قائم ہو جائے گی۔ لیکن اس
سے یہ کس طرح لازم آگیا کہ بیچ کے زمانوں کے لئے ساری دنیا پر کفر و طاغوت

کی فرماں روائی مقدر ہو چکی ہے ؟ اس میں تو کوئی دور کا بھی اشارہ
اس امر کا موجود نہیں ہے کہ خلافت راشدہ کے اختتام سے لے کر ظہور
مہدی تک زمین کے کسی بھی خطہ پر اللہ کا دین قائم نہ ہوگا۔ بخلاف اس
کے تاریخ گواہ ہے کہ خلافت راشدہ کے ختم ہونے کے ستر برس بعد ہی
حضرت عمر بن عبد العزیز کے ہاتھوں مملکت اسلام میں قریب قریب وہی
بہار سعادت پھر آگئی جو خیر القرون میں تھی، اور اس دور کو بھی خلافت
راشدہ کا دور تسلیم کیا گیا۔ اس کے علاوہ جب پایہ کی دوسری روایات
ایسی بھی ملتی ہیں جن میں صراحت کے ساتھ یہ پیشین گوئیاں کی گئی ہیں کہ
مہدی موعود کے علاوہ اور ان سے پہلے، اور بھی علمبرداران قیام دین
اٹھیں گے جن کی حمایت و نصرت مسلمانوں پر واجب ہے۔ مثال کے
طور پر دو روایتیں ذکر کی جاتی ہیں:۔

(۱) اذا رأیتم الایات السود قد جاءت من قبل خراسان
فأتوها ولو حبوا علی الثلج فان فیھا خلیفۃ اللہ
المھدی۔

(۲) یخرج رجل من وراء النھر یقال لہ الحارث
حراث علی مقدمتہ رجل یقال لہ منصور یمکن لآل محمد کما مکنت
قریش لرسول اللہ وجب علی کل مسلم نصرہ (ابوداؤد)

جب تم یہ دیکھنا کہ خراسان کی طرف سے سیاہ نشانات آرہے ہیں
تو وہاں پہنچنا۔ اگرچہ تمھیں برف کے اوپر گھسٹ کر ہی کیوں نہ جانا پڑے۔
اس لئے کہ ان نشانات کے اندر اللہ کا ہدایت یافتہ خلیفہ ہوگا۔
ماوراء النہر سے "حارث حراث" نامی ایک شخص نکلے گا جس کا پیش رو

(سپہ سالار) منصور نامی ایک آدمی ہوگا۔ وہ آل محمد کے لیے قوت واقتدار پیدا کرے گا جس طرح کہ قریش نے رسول اللہ کے لئے کیا۔ اس کی مدد کرنا ہر مسلمان پر واجب ہے۔

یہ گمان نہ کرنا چاہیئے کہ ان روایتوں میں جن اشخاص کے ظہور کی خبر دی گئی ہے ان سب سے مراد ایک ہی شخص یعنی وہی مہدی موعود ہیں کیونکہ مہدی موعود کا ظہور، حسب بیان روایات، مدینہ منورہ سے ہوگا نہ کہ ماوراء النہر یا خراسان سے۔ اسی طرح ان کا نام آنحضرت صلعم کے نام پر ہوگا نہ کہ "حارث حراث" نیز یہ کہ وہ اہل عرب کے جلو میں نکلیں گے نہ کہ خراسانی یا تورانی افواج کو لے کر، پھر یہ غلط فہمی بھی نہ ہونی چاہیئے کہ ان روایات میں حصر ہو گیا ہے۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان ان تمام داعیان حق کی فہرست گنا دی ہے جو قیامت تک اقامت دین کا علم لے کر اٹھنے والے ہیں، بلکہ ان روایتوں میں، بشرطیکہ وہ صحیح ہوں صرف بعض افراد اور زمانوں کا ذکر آیا ہے اور مقصود اس امر کی تاکید ہے کہ جب کبھی بھی ایسے مواقع پیش آئیں تو ہر مسلمان کا فرض ہو جائے گا کہ خدا کی راہ میں اپنے کو پیش کر دے۔

پس ان روایات میں نہ صرف یہ کہ مہدی موعود کے ماسوا بھی حق کے مجاہدوں اور دین قیم کو زندہ و پایندہ کرنے والوں کی آمد کی بشارت سنائی گئی ہے بلکہ ہر مسلمان پر واجب گردانا گیا ہے کہ سر کے بل بھی چلنا پڑے تو چل کر ان دعاۃ حق کے پاس پہنچے اور ان کی اعانت و اطاعت میں جان کی بازی لگا دے۔ اس طرح ان اوہام کی جڑ کٹ جاتی ہے جو مہدی موعود کے نام سے پیدا کر لیے گئے ہیں۔

پھر قطع نظر ان روایات کے، اصل سوال تو فرض زندگی کا ہے جب یہ ثابت شدہ حقیقت ہے کہ اقامت دین کا فریضہ ہر مسلمان

کی زندگی کا مقصد وحید اور اس کی خاطر جد وجہد کرنا اس کے ایمان کا معیار ومظہر ہے اور جب مومن کی عین فطرت ہی یہ قرار دی گئی ہے کہ وہ باطل اور منکر کو جینے کا حق نہیں دینا چاہتی خواہ وہ دنیا کے کسی بھی گوشہ میں موجود ہو اور جب اللہ تعالیٰ کی بندگی اور اتباع قرآن کے عہد کا سب سے پہلا اور سب سے آخری مطالبہ ہی یہ ہے کہ انسان کا پائے سعی وجہد اس وقت تک نہ تھمے جب تک کہ دین الٰہی کی ایک دفعہ بھی معطل ہے اور زمین کا ایک ذرہ بھی باطل کے پاؤں تلے دبا ہے، تو ہر مومن کو یہ جد وجہد لازماً کرنی پڑے گی اور ہر حال، ہر دور، ہر ماحول، اور ہر جگہ کرنی پڑے گی۔ امام مہدی اگر آئیں گے تو وہ اپنا فرض ادا کریں گے نہ کہ میرا اور آپ کا۔ ان کی تمام دوڑ دھوپ اپنے اس بوجھ کو سر سے اتارنے کے لئے ہوگی جو اللہ رب العالمین کی طرف سے ان پر ڈالا گیا ہوگا۔ ان کا کوئی فعل کسی بھی مدعی اسلام کے ادائے فرض کا قائم مقام نہ ہوگا۔ نہ تو وہ کسی دوسرے کے لئے نماز پڑھیں گے، نہ روزے رکھیں گے اور نہ ہی جہاد وقتال کریں گے آپ آج ہی ان کی مساعی پر تکیہ کئے بیٹھے ہیں جبکہ ان کا وجود ابھی عالم تصور اور دنیائے آرزو سے باہر بھی نہیں آیا ہے مگر یقین کیجئے کہ وہ اس وقت کے بھی کسی مسلمان کے عوض تلوار نہ چلائیں گے جو ان کے زمانہ میں موجود ہوگا، اس وقت بھی ہر مسلمان کو اپنا اپنا فرض ٹھیک اسی طرح ادا کرنا ہوگا جس طرح امام موصوف کو، یعنی حضرت مسیحؑ کے لفظوں میں "ہر شخص کو اپنی صلیب خود اٹھانی ہوگی" اور جو ایسا نہ کرے گا "آسمانی بادشاہت" میں داخل نہ ہو سکے گا۔ اس لئے ہر مسلمان کو یہ دعا اور یہ

آرزو تو ضرور کرنی چاہیئے کہ اس کو وہ دور سعادت دیکھنا نصیب ہو جب امام مہدی اپنی تمام تر برکتوں کے ساتھ ظہور فرما ہوں گے اور ظلم و فساد کے بوجھ سے کراہتی ہوئی دنیا عدل و قسط کی رحمتوں سے مالامال ہو جائے گی مگر ایک لمحہ کے لیئے بھی اس کو اس وہم میں نہ مبتلا ہونا چاہیئے کہ حضرت موصوف کے صدقہ میں اب سارے مسلمان بندگی کی ذمہ داریوں یعنی اقامت دین کی جدوجہد سے سبکدوش کر دیئے گئے ہیں، جس طرح عیسائی حضرات اس خوش گمانی میں مبتلا ہو گئے ہیں کہ مسیح علیہ السلام نے سولی پر چڑھ کر ہم کو حسن عمل سے بے نیاز کر دیا ہے۔

احتساب نفس کی ضرورت

اقامت دین سے دامن بچانیوالے مسلمانوں کے یہ مختلف گروہ ہیں۔ ہم نے کوشش کی ہے کہ ان میں سے ہر گروہ کے خیالات اور دلائل کو بیان کر کے ان کی غلطی واضح کی جائے۔ توقع ہے کہ ان معروضات پر ٹھنڈے دل سے اور حق طلبی کے جذبات کے ساتھ غور کیا جائے گا اور روایتی، گروہی، سیاسی اور تقلیدی تعصبات سے بالاتر ہو کر خالص خدا پرستانہ نقطۂ نظر سے اپنے مشاغل زندگی کا جائزہ لیا جائے گا۔ یاد رہے کہ نفس اپنا احتساب کرنے میں سخت حیلہ گر اور فریب کار واقع ہوا ہے اس پر کسی غیر مانوس اور نامطلوب حقیقت کا سامنا کرنا بڑا ہی شاق ہوتا ہے۔ اور اس حقیقت کے خلاف تو وہ اپنے ترکش دجل کا آخری تیر تک استعمال کر ڈالتا ہے جو اس سے قربانیوں کی طلب گار ہو، صرف جان اور مال ہی کی قربانیاں نہیں بلکہ جذبات وحسیات کی بھی۔ پندار علم و فکر کی بھی، سابق طرز عمل کی محبت اور

عصبیت کی بھی، کہ بسا اوقات ان چیزوں کی قربانیاں جان و مال کی قربانیوں سے بھی زیادہ دشوار ہوتی ہیں۔ ادھر سے نورِ حق کی تجلی چمکتی ہے اور دل پکار اٹھتا ہے کہ سمتِ قبلہ یہی ہے، اُدھر نفس کے حیلے اور وسوسے اٹھتے ہیں اور انسان سے پوچھتے ہیں کہ کیا اب تک کی تیری ساری تگ و دو باطل کی راہ میں تھی؟ کیا زمانہ کے اقطاب و ابدال اور وقت کے مراکزِ علم و دانش جن سمتوں کی طرف جا رہے ہیں وہ سب کی سب غلط ہیں؟ یہ سوالاتِ نفسیاتی حربوں سے اتنے مسلح اور اتنے جذبات انگیز ہوتے ہیں کہ انسان ان سے مسحور ہوئے بغیر نہیں رہتا اور ایک چیز کو حق سمجھنے کے باوجود اسے حق نہیں مانتا۔ یہ نفسِ انسانی کی وہی جبلی کمزوری ہے جو ہر دعوتِ حق کے قبول کرنے سے مانع ہوتی رہی ہے اور ہر نبی کی آواز کے جواب میں بدبخت انسانوں کی زبان سے یہ آواز بلند کراتی رہی ہے کہ:-

بل نتبع ما الفینا علیہ آباءنا

ہم تو اسی چیز کی پیروی کریں گے جس پر ہم نے اپنے باپ دادا کو پایا ہے۔

پس نفس کی اس مہلک کمزوری اور وسیسہ کاری سے پوری طرح چوکنے ہو کر اپنے فکر و عمل کا احتساب کرنا چاہیئے اور اس اصول کو کبھی نہ بھولنا چاہیئے کہ حق و باطل کا معیار نہ تو کوئی شخص ہے ــ بجز ایک شخص کے جس کا نام محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) ہے اور نہ ہی کوئی جماعت ہے ــ سوا ایک جماعت کے، جس کو دنیا اصحابِ محمدؐ کے نام سے پکارتی ہے۔ اس لئے اس سلسلہ میں صرف اللہ کی کتاب اور اس کے رسول کی سنت اور اصحابِ رسول کا اسوہ ہی ہمارے سامنے ہونا چاہیئے اگر

ان چیزوں میں زندگی کا مقصد اس کے سوا اور کچھ نہیں بتایا گیا ہے کہ
اس کا ہر سانس اقامت دین کے ذکر و فکر اور سعی و جہد میں بسر ہونا
چاہیئے تو پھر اس کے بعد اس کے اعتراف اور امتثال میں نہ تو کسی
پیر و مرشد کی ارادت مانع ہونی چاہیئے نہ کسی شیخ و امام کی عقیدت،
نہ تو کسی استاذ کا تلمذ اس ادائے فرض سے باز رکھنے کا حق رکھتا ہے
اور نہ کسی جماعت کا تعصب۔ نہ کسی دیرینہ روش کی حمیت کو اس راہ
میں آڑے آنا چاہیئے نہ کسی فکر سابق کی عصبیت کو، کہ یہ سب چیزیں
نفس کے حجابات اور شیطان کے فتنے ہیں اور قدرت نے ان کو انسان
کے گوش و چشم پر صرف اس لئے پھیلا دیا ہے تاکہ اس کی حق پرستی کی آزمائش
ہو۔ مبارک ہے وہ بندہ جو ان حجابوں کو چاک کرکے اور ان فتنوں کو
کچل کر اپنے فرض کی پکار پر حرکت میں آجائے اور نہ یاد رہے کہ اپنے
ذاتی رجحانات کی پیچ میں یا اپنے جماعتی افکار و مشاغل کی حمایت و عصبیت
میں یا بزرگوں کی تقلید میں اس سے گریز کرنا اپنے آپ کو دانستہ نذر
ہلاکت کرنا ہے، کسی بزرگ کا طرز عمل ہم کو خدا کی گرفت سے بچا نہیں سکتا
جب تک یہ راز حق دل پر نہ کھلا ہو، انسان کسی حد تک تو معذور تصور
کیا جا سکتا ہے مگر جب حقیقت بے حجاب نظر آگئی اور دل نے اس کی
صداقت کا اعتراف کر لیا تو بس یوں سمجھئے کہ اللہ کی حجت تمام ہو گئی۔
اس وقت اعتذار کے سارے دروازے بند ہو جاتے ہیں۔ اب آگے
یا تو آمادگی عمل اور کامرانی حیات ہے یا پھر انکار فرض و حصول نامرادی
کیونکہ حق کو حق سمجھ لینے کے بعد اس سے انکار اور اعراض کرنا اس سنت
فرعونی کی پیروی کرنا ہے جس کے متعلق قرآن کہتا ہے کہ :-

فلما جاءتھم اٰیٰتنا مبصرۃ قالوا ھذا سحر مبین وجحدوا بھا واستیقنتھا انفسھم ظلماً وعلواً۔

جب فرعون اور اس کے پیرووں کے سامنے ہماری نشانیاں بالکل کھلے طور پر آئیں تو انھوں نے کہا یہ تو نرالا جادو ہے۔ اور باوجود اس کے کہ ان کے دل ان نشانیوں کی حقانیت پر یقین رکھتے تھے انھوں نے ظلم اور سرکشی کی بنا پر ان کو ماننے سے انکار کر دیا۔

لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ کتنے ہی لوگ اس سنت کے پیرو ہیں اور "ظلم وعلو" نہ سہی — گروہ پرستی اور اکابر پرستی کے باعث جحدوا بھا واستیقنتھا انفسھم — کے مرض میں مبتلا ہیں۔ کاش اس مرض کی خطرناکی کا احساس کیا جاتا اور جو راہ اللہ نے ان پر کھول دی ہے اس پہ چلنے سے کوئی تعلق مانع نہ ہوتا، ورنہ ہمیں خطرہ ہے کہ یہ اعتراف حق ان کے جرم کو کچھ ہلکا کرنے کے بجائے الٹا سخت کر دیگا۔

آخری گذارش

ابتدائے بحث سے لے کر یہاں تک جو کچھ عرض کیا گیا اس کا مدعا صرف یہ ہے کہ امت مسلمہ نے جس نصب العین کی ذمہ داری اپنے کندھوں پر لی ہے اس کا حق ادا کرے جن اصولوں پر اس کے وجود کی بنا رکھی گئی ہے ان کو از سر نو اپنا مرکز عمل بنائے، اور تقاضائے زمانہ، مشکلات، آفتوں اور مصالح وقت سے صرف نظر کر کے، نیز نفس و شیطان کے اختراع کئے ہوئے حیلوں اور وسوسوں سے دل و دماغ پاک کر کے، اپنے چھوڑے ہوے فرض زندگی کو سرانجام دینے میں لگ جائے۔ بلاشبہ یہ بڑی کٹھن راہ ہے اور اس کا ہر قدم کانٹوں سے بھرا ہوا ہے مگر رضائے حق کی بارگاہ تک جانیوالی

اس کے سوا کوئی دوسری راہ نہیں۔ مقصد حیات کی اس توضیح اور تبلیغ کے بعد آخری گذارش یہ ہے کہ جن لوگوں کے تلوے ان کانٹوں کا خیر مقدم کرنے کی ہمت نہیں رکھتے ان کے لئے آخری چارۂ کار، جس کو برداشت کیا جا سکتا ہے یہ ہے کہ وہ جہاں ہیں وہیں قدم روکے کھڑے رہیں اور کم از کم دوسرے پوچھنے والوں کو تو یہ ضرور بتا دیں کہ گو ہم میں اس راہ دشوار گذار کو طے کرنے کی ہمت نہیں مگر حق اور نجات کی شاہراہ ہے یہی۔ یہ اس لئے تاکہ کل اللہ تعالیٰ کے روبرو ترک فرض کے ساتھ ساتھ کتمان حق کے جرم میں بھی نہ ماخوذ ہوں۔ اور اگر بد قسمتی سے یہ بھی ممکن نہ ہو تو اپنے قدموں کی طرح اپنی زبانوں کو بھی روکے رہیں مگر خدا را دوسروں کو اس راہ سے روکنے کا بوجھ اپنی گردن پر نہ لیں۔ یہ "صد عن السبیل" کی وہ لعنت ہے جس کے تصور ہی سے ایک مسلمان کے رونگٹے کھڑے ہو جانے چاہئیں۔ یہ بعینہٖ وہی روش ہے جو سیدنا مسیح علیہ السلام کے زمانہ میں اشقیائے یہود نے اختیار کی تھی اور جس کے جواب میں حضرت مسیحؑ نے فرمایا تھا:۔

"اے ریاکار فقیہو اور فریسیو! تم پر افسوس ہے کہ آسمان کی بادشاہت لوگوں پر بند کرتے ہو۔ نہ آپ داخل ہوتے ہو اور نہ داخل ہونے والوں کو داخل ہونے دیتے ہو"

خدا نہ کرے کہ کوئی مسلمان اس حد تک آپ اپنی دشمنی پر کمربستہ ہو جائے اور خود تو اقامت دین کی جد و جہد سے جی چراتا ہی ہو، اوروں کو بھی اس سے باز رکھنے کا موجب بنے۔

مسلمان جماعتوں کے قول و عمل کا تضاد

از مولانا قاری شاہ محمد جعفر صاحب ندوی پھلواروی ابن
حضرت مولانا قاری شاہ محمد سلیمان مرحوم و مغفور۔

آج سے چند سال پہلے قوم مسلم کا نقشہ مرحوم اقبال نے ان لفظوں میں کھینچا تھا ؎

شبے پیش خدا بگریستم زار
مسلماناں چرا خوار اند و زار اند

ندا آمد نمی دانی کہ ایں قوم
دلے دارند و محبوبے ندارند

یعنی اس قوم کا دل سب سے بہتر ہے لیکن اس کی زندگی بے مقصد بسر ہو رہی ہے۔ دل میں سچی تڑپ ہے مگر یہ نہیں معلوم کہ یہ تڑپ ہے کس کے لئے نصب العین حیات آنکھوں سے اوجھل ہی ایک قافلہ ہے جو صرف کوچ کر رہا ہے لیکن یہ نہیں معلوم کہ جانا کدھر ہے جس راہ پر کسی راہ رو کو دیکھا اس کے پیچھے لگ گیا۔ صرف اس لئے

کہ کہیں جا نورہا ہے۔ مرحوم اقبال نے جب یہ نقشہ کھینچا تھا۔ اس وقت فی الواقع قوم کا یہی حال تھا۔ لیکن اب اسے بحمداللہ یہ بھی معلوم ہوگیا ہے کہ کہاں جانا ہے۔ ہم کس لئے زندہ ہیں اور ہمارا مطلوب ومقصود کیا ہے۔ دل میں صرف تڑپ اور لگن ہی نہیں بلکہ اس محبوب کا بھی پتہ چل گیا ہے جس کے لئے یہ تڑپ ہے جہاں تک نصب العین کا تعلق ہے۔ اب تمام ذمہ داران قوم کی سمجھ میں آگیا ہے لیگ کے پنڈال سے جمعیتہ کے پلیٹ فارم سے احرار وخاکسار کے اسٹیج سے غرض ہر جگہ سے اب یہی آواز حق بلند ہونے لگی ہے کہ "ہم اللہ کی حکومت چاہتے ہیں۔ اور یہ کہ انسانی نظام حکومت میں قطعاً سلامتی نہیں" انسان کے بنائے ہوئے نظام حیات اصول زندگی اور قانون حکومت کے کیا برکات ہیں وہ اس وقت سب کی آنکھوں کے سامنے ہیں۔ اس شاہد عدل کے ہوتے ہوئے حکومت الٰہیہ کے خالص اسلامی نظرئے سے جرأت انکار بھی کیسے ہوسکتی ہے۔ بہرنوع ہمیں اللہ کا شکرادا کرتے ہوئے یہ معاملہ طے شدہ سمجھنا چاہیئے کہ ذمہ داران قوم اس نصب العین پر متفق ہوچکے ہیں گویا اب "محبوب بے ندارند" کا گلہ نہیں۔ دل بھی ہے اور تعین مطلوب بھی ہوچکا ہے لیکن سوال یہ ہے کہ کیا اسی قدر کافی ہے؟ ابھی ایک اور شاید صرف ایک چیز اور باقی ہے جس کے بعد زمین و آسمان خود بخود بدل جائیں گے۔ ورنہ "دل اور محبوب" دونوں کے ہوتے ہوئے بھی ہم اسی طرح "خبر ندو زار ند" رہیں گے۔

اسلامی نصب العین کیلئے اسلامی طریق کار | ہم خالص اسلامی نصب العین

حیات بحمد اللہ پا چکے ہیں اور وہ ہے حکومتِ الٰہیہ کا قیام ۔ اب صرف ایک ہی سوال حل طلب ہے اور وہ یہ ہے کہ اس مطلوب تک رسائی کس طرح حاصل کی جائے یعنی ہمارا طریق کار کیا ہو ۔ جس وقت یہ گتھی سلجھ جائے گی ۔ ہم پورے وثوق سے کہہ سکتے ہیں کہ حصولِ مطلوب میں دیر نہ لگے گی ۔ اس لیئے کہ ہم سب ایک ہوں گے جس طرح اسلامی نصب العین کا ذہنی طور پر صرف صحیح تسلیم کر لینا کافی نہیں ۔ اسی طرح اس کے حصول کے لئے صرف کوشش بھی کافی نہیں ۔ ہمیں صرف جدوجہد ہی نہیں کرنی ہے بلکہ صحیح طریق پر جدوجہد کرنی ہے ۔ یعنے جس طرح ہمارا نصب العین اب خالص اسلامی ہے اسی طرح اس کے حصول کا طریق بھی خالص اسلامی ہونا لازمی ہے ۔ نصب العین اسلامی اور طریق کار غیر اسلامی بالکل بے معنی شئے ہے ۔ کم از کم اسلامی نصب العین کے متعلق تو یہ مسلم ہے اور حقیقت تو یہ ہے کہ غیر اسلامی طریق پر یہ حاصل بھی نہیں ہو سکتا کیونکہ غیر اسلامی طریق کار خود اس نصب العین پر ضرب کاری ہے ۔

اس وقت ہماری مثال ایسی ہی ہو رہی ہے کہ ایک نیک مقصد مثلاً ایک غریب کی مدد پر ہم سب متحد ہو رہے ہیں اور سب کے دل میں واقعتہً صحیح تڑپ بھی موجود ہے لیکن جب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ مدد کیونکر ہو اور روپیہ کہاں سے آئے تو ایک کہتا ہے رشوت شروع کر دو ۔ دوسرا رائے دیتا ہے کہ اس میں بدنامی کا اندیشہ ہے ۔ بہتر یہ ہے کہ چپکے سے فلاں جگہ نقب لگا کر کچھ مال اڑا لو ۔ تیسرا بولتا ہے ۔ یہ بھی خطرے سے خالی نہیں ۔ مناسب یہ ہے

کہ سودی کاروبار شروع کر دیا جائے وھلمّ جرّا۔
یہ سب لوگ مقصد میں متحد ہیں اور حصول مقصد کی واقعی تڑپ بھی رکھتے ہیں لیکن طریق کار اس باب میں یہی ہے کہ اگر تم اس غریب کی مدد چاہتے ہو تو اپنی حلال کمائی سے کچھ دو خواہ دو ہی پیسے ہوں۔ اور اگر یہ نہ کر سکو تو اپنی جگہ چپ بیٹھے رہو۔ یہ خاموشی غلط طریق اعانت سے بہتر ہے۔ اپنی قوتوں کو صحیح راہ پر لگا دیں تاکہ اس کی مدد خواہ بہ دیر ہو لیکن صحیح طریق پر ہو۔

غور کرنے کی ایک بات اگر لیگ جمعیتہ احرار اور خاکسار وغیرہ میں سے ہر ایک کو یہ حق پہنچتا ہے کہ باوجود ایک ہی نصب العین کے اظہار و اعلان کے دوسرے کو صرف غیر صحیح طریق کار کے باعث قابل اختلاف سمجھے تو کسی ایسے شخص کو جو ان سب سے باہر ہو یہ حق کیوں نہیں کہ ان سب پر برادرانہ اور ہمدردانہ صاف دلی کے ساتھ تنقید کرے اور ایک ہی طریق کار جو خالص اسلامی ہو اختیار کر کے تمام نزاعات کو ختم کر دینے کی رائے دے؟

اللہ کا نام لے کر آئیے۔ ہم سب مل کر غور کریں کہ ہمارے طریق ہائے کار میں کیا وہ نقائص ہیں جو نفس نصب العین پر براہ راست ضرب لگاتے ہیں۔ اگر صرف مناظرہ و مباحثہ مقصود ہو تو اس دماغی عیاشی کے لئے کوئی اور مشغلہ اختیار کیا جا سکتا ہے لیکن اگر تلاش حق مقصود ہو تو نیک نیتی اور اخلاص کے ساتھ فرقی تعصبات سے الگ ہو کر ایک خالص اسلامی طریق کار اختیار کر لینا دشوار نہیں۔

مسلمان جماعتوں کی پریشاں خیالی

حقیقت یہ ہے کہ صرف نصب العین کا اقراری طور پر تسلیم کر لینا کافی نہیں۔ تا وقتیکہ طرزِ عمل سے یہ نہ معلوم ہو کہ ہم واقعتہً اسی نصب العین کی طرف دوڑ رہے ہیں۔ دلی جانے والی ٹرین پر بیٹھنا اور ذہن پر یا زبان پر یہ رکھنا کہ ہم پشاور جا رہے ہیں کوئی صحیح طرزِ عمل نہیں۔

اس وقت تک مختلف حلقوں سے طریقِ کار کا جو اظہار ہوتا رہا ہے وہ یہ ہے کہ مثلاً .... ہم جس قرآنی حکومت کے خواہاں ہیں اور اسی لئے اکثریت کی حکومت (پاکستان) کی کوشش کر رہے ہیں۔ ہم بھی خدائی بادشاہت ہی چاہتے ہیں اور اسی غرض سے کانگرسی نیشنلزم کا ساتھ دے رہے ہیں ...... ہم بھی قانونِ الٰہی کی حکومت قائم کرنا چاہتے ہیں اور اسی مقصد کے حصول کے لئے غیر الٰہی مجلسِ قانون سازی کی ممبری کے لئے الکشن لڑتے ہیں .... ہم بھی خدائی نظام کے قیام کے لئے کوشاں ہیں اور اسی مطلب کے لئے طاغوتی نظام کی حمایت کے لئے پچاس ہزار جانباز دے رہے ہیں غرض جو شخص جو کچھ بھی کر رہا ہے وہ اسی ایک مقصد کے لئے کر رہا ہے وہ طاغوتی نظام کی مشین کا پرزہ بنتا ہے تو حکومتِ الٰہیہ کے لئے حرام مشاغل کو دینی خدمت سمجھ کر اختیار کرتا ہے تو خدائی بادشاہت کے لئے۔ تارک الصلوٰۃ ہے تو قانونِ الٰہی کے نفاذ کے لئے خدا کے باغیوں اور ان کی ہر شئے کی محبت وطلب ہے تو آسمانی نظام کی اقامت کے لئے خدا کی نافرمانی

ہے تو خدائی نظام اطاعت کے قیام کے لیئے غیر الٰہی نظام حکومت وعدالت کو تسلیم کئے ہوئے ہیں تو صرف اللہ کے قانون اور حکومت کو تسلیم کرانے کے لیئے آخر یہ کیا قصہ ہے؟ اگر ہم مجبورانہ اضطرار میں ہوں اور ذرہ برابر بھی رضا ورغبت نہ ہو تو بعض حالتیں اللہ کے نزدیک بھی قابل عفو ہیں لیکن یہ تناقضات سے بھرا ہوا قول وعمل یا تو ہمارے توازن دماغی کی خرابی ہے یا فریب خوردہ نفس کی غلطی۔ ہم حکومت الٰہیہ کے قیام کی کچھ توقع کر سکتے ہیں تو ان ہی لوگوں سے جو کم از کم تمام غیر الٰہی نظام کے متعلق اولاً تو کامل عدم تسلیم کا اعلان کر دیں پھر اپنی دلچسپیاں ایسے تمام اداروں اور مجلسوں سے بالکل ہٹا لیں جن کا نصب العین حکومت الٰہی کے سوا کچھ اور ہو۔ خواہ وہ نصب العین آزادیٔ وطن ہو یا اقتدار قومی یا پراونشل اٹانومی یا مطلق وزارت وحکومت وغیرہ اس کے بعد اپنی عملی زندگی سے یہ واضح کر دیں کہ ہم صرف اللہ کے محکوم۔ اسی کے طالب۔ اسی کے نائب ہیں۔ کم از کم وہ طریقے تو اختیار کریں جن میں بجز اپنے نفس امارہ کی حکومت کے اور کوئی مانع نہیں اگر یہ باتیں نہ ہوں تو پھر قیام حکومت الٰہیہ کے ہر مدعی سے خوش گمانی پیدا کر لینا کس طرح روا ہو سکے گا۔

فریب نفس سے نجات حاصل کرو جو لوگ اس انتظار میں بیٹھے ہیں کہ جب پراونشل اٹانومی مل جائے گی تو ہم کام شروع کریں گے ان سے قیام حکومت الٰہیہ کی توقع بالکل بے معنی ہے۔ ایسی خوش گمانی تو آپ

ہٹلر سے بھی کر سکتے ہیں کہ گو اس نے ظاہر تو نہیں کیا۔ لیکن فتح پانے کے بعد وہ حکومتِ الٰہیہ ہی قائم کرے گا۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ ساری باتیں فریب نفس ہیں طفل تسلیاں ہیں۔ قرآنی قانون پر چلنے سے دنیا کی کونسی طاقت روک سکتی ہے؟ اور جو آج اپنے نظام زندگی کے اکثر حصے میں بالکل خلاف قانونِ الٰہی بلا ارادہ یا بالارادہ چل رہا ہے۔ اس کے متعلق ہم کیوں کر یہ گمان کریں کہ اختیارات ملنے پر وہ اور فرعونِ بے سامان نہ بن جائے گا؟

مسلمان جماعتوں سے گزارش ہم دعا کرتے ہیں اور آپ سے بھی اسی کے طالب ہیں کہ ہماری ساری جماعتیں جس طرح خالص اسلامی نصب العین کے زبانی اقرار میں متحد ہو گئی ہیں جلد سے جلد اسی طرح اس کے حصول کے لئے طریقِ کار بھی خالص اسلامی تلاش کرنے میں کامیاب ہوں

آمین